M-195366

DATA ENTERED

شوکت تھانوی

سوانح اور ادبی خدمات

مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)

پنجاب یونیورسٹی

۱۹۸۴ء

مقالہ نگار

سعید مرتضیٰ زیدی

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اردو

گورنمنٹ کالج لاہور

نگرانِ کار

ڈاکٹر وحید قریشی

ایم۔ اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

صدر نشین

مقتدرہ قومی زبان

اسلام آباد،

منظوری بحوالہ پنجاب یونیورسٹی چٹھی نمبر جی۔ ایم۔ ۱۲۵۷ مورخہ ۱۵؍مئی ۱۹۷۵ء اور
عبوری ضابطہ نمبر ۲۰۹ سی۔ ایم۔ مورخہ ۱۹؍فروری ۱۹۸۳ء

HaSnain Sialvi

ترتیب

باب نمبر	مضامین	صفحہ
	پہلی بات	1 تا 3
پہلا باب :	(1) حالاتِ زندگی	4 تا 60
	(2) شخصیّت	61 تا 94
دوسرا باب :	تصنیفی سرمایہ	95 تا 130
تیسرا باب :	شاعری	131 تا 179
چوتھا باب :	(1) مضمون نگاری	180 تا 211
	(2) افسانہ نگاری	212 تا 238
پانچواں باب :	ناول نگاری	239 تا 272
چھٹا باب :	ڈراما نگاری	273 تا 323
ساتواں باب :	(1) خاکہ نگاری	324 تا 344
	(2) آپ بیتی	345 تا 361
آٹھواں باب :	صحافت	362 تا 428
	کتابیات	429 تا 444

:——:——:

HaSnain Sialvi

" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم "

پہلی بات

شوکت تھانوی کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے بیک وقت اردو ادب کی بہت سی اصناف میں خدمات سر انجام دی ہیں ۔ ان کی متنوّع ادبی خدمات کے پیشِ نظر اس وسیع موضوع کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن میرا ضمیر مطمئن ہے کہ اپنی تمام مجبوریوں کے باوجود حتی الامکان میں نے تحقیقی کاوش و جستجو میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ۔

اس مقالہ کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ پہلا باب حالاتِ زندگی اور شخصیت کے بارے میں ہے ۔ اس باب کی ترتیب میں غیر ضروری تفصیلات اور بے شمار حوالوں سے قطع نظر کرنا پڑا ۔ تحقیق و درایت کے اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے صرف معتبر مآخذ اور شوکت تھانوی کی خود نوشت سوانح سے مدد لی گئی ۔ دوسرے باب میں تصنیفی سرمائے کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ تصانیف کے اس جائزے میں تحقیقی پہلو کی طرف زیادہ توجہ کی گئی ہے ۔ اس باب کی تیاری میں شوکت تھانوی کے پبلشرز نے میرے لئے کافی مشکلات پیدا کردی تھیں چونکہ کتاب کا پہلا ایڈیشن تلاش کرنے کے باوجود یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کتاب کب شائع ہوئی ؟ سنِ اشاعت تلاش کرنے کے لئے مجھے اس دور کے رسائل اور اخبارات کی فائیلیں دیکھنا پڑیں ۔ شوکت تھانوی اور ان کے ہم عصر ادیبوں کی تحریروں سے مدد لینا پڑی تب کہیں جاکر سنِ اشاعت کا تعیّن ہوسکا ۔

HaSnain Sialvi

اس مقالہ کا تیسرا باب شاعری کے بارے میں ، چوتھا باب مضمون نگاری اور افسانہ نگاری کے بارے میں ، پانچواں باب ناول نگاری پر چھٹا باب ڈراما نگاری پر ، ساتواں باب خاکہ نگاری اور آپ بیتی کے بارے میں اور آٹھواں باب صحافت کے بارے میں ہے - اس ترتیب میں ، میں نے ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھا ہے کہ شوکت تھانوی کی شخصیت اور فن کی ساری کڑیاں ایک دوسرے میں گتھی ہوئی ہونے کے باوجود مقالہ میں کہیں تکرار نہ ہونے پائے - یہ اصول اگرچہ بہت سے پہلوؤں سے مستحسن ہے مگر شخصیت کے مختلف گوشوں اور کسی ادیب کے تمام اصنافِ ادب پر الگ الگ ابواب قائم کرکے ایک باب میں آنے والی خصوصیات کو دوسرے باب کے لئے قطعاً ممنوع قرار دے لینا اتنی آسان بات نہیں خاص طور پر اس وقت یہ مسئلہ اور بھی ٹیڑھا ہوجاتا ہے جب مرتّب اپنے موضوع کی وحدتِ کلّی کے ساتھ ساتھ اس کے مختلف ابواب کو بھی اپنی اپنی جگہ مکمل اور جامع بنانے کا ارادہ رکھتا ہو اور جب کسی ادیب کا سارا فن کسی ایک خصوصیت کے گرد گھومتا ہوا نظر آئے تو اچھی خاصی مشکلات پیدا ہوجاتی ہیں - اس لئے مجھے احتیاط کے باوجود چند باتیں دہرانا پڑی ہیں مگر ظاہر ہے یہ شدید مجبوری کے مواقع تھے اور ان کے لئے کوئی اور راستہ اختیار کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا -

تحقیقی مقالہ کے دوران مجھے شوکت تھانوی کی بعض ایسی تحریریں بھی دستیاب ہوئیں جو ان کی کسی تصنیف یا مجموعے میں شامل نہیں - میں نے اپنے مقالہ میں منجملہ دوسرے مآخذ کے اس مواد سے بھی استفادہ کیا ہے - مجھے یہ مواد شوکت تھانوی کی دوسری بیگم زہرہ شوکت اور منجھلے صاحبزادے خورشید شوکت نے فراہم کیا جس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں -

اس مقالہ کی تیاری میں استادِ مکرّم جناب ڈاکٹر وحید قریشی کی ہدایات مقالہ کے خاکے سے لے کر اس کے اختتام تک میرے لئے مشعلِ راہ رہی ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب محترم نے اپنی اَن گنت مصروفیات کے باوجود اس کے اہم مقامات مکمل طور پر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا فرمائی اور رہنمائی بھی کی ۔ ان کی توجہ اور عنایات سے اگرچہ اکثر بہرہ اندوزی کی سعادت حاصل رہی ہے لیکن اس کرم گستری کو میں اپنے لئے بالخصوص سرمایۂ افتخار سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن نے فراہمیٔ مواد کے سلسلے میں میرا بڑا ہاتھ بٹایا ۔ میں جب بھی اور جس وقت بھی پہنچا انہوں نے بکمالِ مہربانی میری مشکلات حل کیں ۔ بعض موقعوں پر اپنی وقت بے وقت کی ملاقاتوں کا مجھے احساس بھی ہوا مگر شاید میں بھی اپنی جگہ "حق بجانب" تھا ۔ بہر حال میں ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹنے دیا اور مقالہ کی تیاری میں جو کچھ ممکن تھا اس سے استفادے کا موقع دینے میں کسی طرح کا حجاب نہیں رکھا ۔

آخر میں میرا دل چاہتا ہے کہ میں شوکت تھانوی مرحوم کا شکریہ ادا کروں جن کی وساطت سے مجھے اردو ادب کی اہم اصناف کے نئے گوشے تلاش کرنے میں مدد ملی ہے ۔

سید مرتضےٰ زیدی

25 ، دسمبر 1984 ء

HaSnain Sialvi

پہلا باب

حالاتِ زندگی اور شخصیت

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شاندار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

محمد ثاقب ریاض: 03447227224
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

شوکت تھانوی کا آبائی وطن یو۔پی کے ضلع مظفر نگر کا ایک قصبہ تھانہ "بھون" ہے۔ شوکت تھانوی کے والد منشی صدیق احمد کے تین بھائی تھے۔ حبیب احمد، سلطان احمد اور فیاض احمد۔ سب سے چھوٹے بھائی فیاض احمد تمام عمر تھانہ "بھون" میں رہے جبکہ باقی تین بھائی ملازمت کے سلسلہ میں تھانہ "بھون" سے باہر رہے۔ شوکت تھانوی کے والد منشی صدیق احمد آغازِ جوانی میں ایک معاشقہ میں ناکامی کے بعد وطن سے لکھنؤ چلے گئے جہاں محکمہ پولیس میں ملازم ہوگئے اور لکھنؤ کے ایک ممتاز صدیقی خاندان میں شادی کرلی۔ صدیق احمد یوں تو ملازمت کے سلسلہ میں یو۔پی کے مختلف اضلاع میں رہے لیکن انہوں نے مستقل سکونت لکھنؤ میں اختیار کی۔ جہاں سبزی منڈی کے پاس اپنا ذاتی مکان بنوایا جو زرد کوٹھی کے نام سے مشہور ہوا اس کوٹھی کے ایک طرف آغا باقر کا امام باڑہ تھا دوسری طرف جنّت کی کھڑکی تھی اور تیسری طرف چھوٹی شہزادی کی ڈیوڑھی تھی۔

شوکت تھانوی اپنی ولادت اور تاریخِ ولادت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بندرابن کے کوتوال صاحب منشی صدیق احمد صاحب مرحوم جو پہلے تو اولاد کی طرف سے مایوس ہوچکے تھے مگر شادی کے بارہ سال بعد اولاد ہوئی بھی تو لڑکی۔ اب اولاد کی تمنا تو پوری ہوگئی مگر ہمارے بزرگ لڑکی کو نصف اولاد سمجھا کرتے تھے۔ جس طرح لڑکی کا شوہر آج بھی اس کو نصف بہتر سمجھنے کا قائل ہوتا ہے۔ منشی صدیق احمد صاحب اس طرح نصف صاحبِ اولاد ہوکر اپنی نصف بہتر کے $\frac{1}{2}$ قائل ہوسکے اور اپنے ارمان کی تکمیل کے لئے پھر چار سال تک بے چارے کو انتظار کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ دو فروری انیس سو چار عیسوی

کو صبح ہونے سے قبل ہی ان کی یہ تمنا بھی پوری ہوگئی اور اولادِ نرینہ سے بھی ان کی نصف بہتر کی گود پُر ہوگئی ۔" [1]

شوکت تھانوی نے ریڈیو کی ایک تقریر میں اپنی سرگذشت بیان کرتے ہوئے بھی اپنی تاریخ ولادت دو فروری انیس سو چار عیسوی ہی بتائی ہے ۔ اس سرگذشت کو محمد طفیل صاحب نے " نقوش " کے " شوکت نمبر " میں شامل کیا ہے ۔ راقم کے پاس یہ سرگذشت کیسٹ کی صورت میں شوکت تھانوی کی آواز میں موجود ہے ۔ اس سرگذشت میں شوکت تھانوی بتاتے ہیں : " یہ حادثہ دو فروری انیس سو چار عیسوی کو بندرابن ضلع متھرا میں پیش آیا کہ میں نے بھی کرشن جی کی جنم بھومی کو اپنی جنم بھومی بنا لیا ۔ کوئی مناسبت نہ سہی لیکن ایک عجیب و غریب نسبت تو ہے ہی اور اگر کوئی اس کو گستاخی کہے تو بھی اس بے ساختہ گستاخی کا میں ذمہ دار نہیں ہوں ۔" [2]

شوکت تھانوی نے تقریباً ہر جگہ اپنی تاریخِ ولادت دو فروری انیس سو چار عیسوی ہی تحریر کی ہے ۔ لیکن ان کے تایا زاد بھائی اور بہنوئی ارشد تھانوی نے ان کی تاریخِ ولادت فروری انیس سو پانچ عیسوی بتائی ہے ۔ وہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں : " میرے والد شیخ سلطان احمد بھوپال ہائیکورٹ کے مشہور وکیل فوجداری تھے ۔ ماہ فروری انیس سو پانچ عیسوی میں ان کو اپنے

---

[1] شوکت تھانوی : " مابدولت " ادارہ فروغ اردو ، لاہور ، صفحہ - 18

[2] شوکت تھانوی : " میری سرگذشت " مطبوعہ نقوش شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ - 7 ۔

چھوٹے بھائی صدیق احمد کا تار ملا کہ لڑکا پیدا ہوا ہے ۔ ان دنوں چچا جان بندرابن ضلع متھرا میں کوتوال تھے ۔ میرے والد نے اس نومولود کا نام "تسخیر احمد" از روئے اعدادِ ابجد نکالا جس سے تیرہ سو تئیس ہجری برآمد ہوتا ہے ۔ چچا جان ، ان کی بیگم اور دوسرے افرادِ خاندان ایک تارک الدنیا بزرگ کے جو بڑے مولانا صاحب کہلاتے تھے ، بہت معتقد تھے ۔ ان ہی مقدس انسان کے صاحبزادے حضرت مولانا عین القضاۃ بانیِ مدرسۂ قرآن تھے جہاں سے حفاظِ قرآن کی دیندار جماعتیں اب بھی نکلتی رہتی ہیں ۔ چچا جان کے یہاں شادی کے بعد عرصۂ دراز تک اولاد نہ ہوئی ، بڑے مولانا صاحب سے دعا کرائی گئی اور انیس سو ایک عیسوی میں چچا جان کے یہاں رنکتہ ضلع آگرہ میں ایک بیٹی پیدا ہوئی چونکہ یقین یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اولاد بڑے مولانا صاحب کی دعا قبول فرما کردی ہے ، انہی سے نام رکھنے کی استدعا کی گئی ۔ انہوں نے "ظہوراً" نام تجویز کیا ۔ میرے والد نے بھتیجی کے نام کو سلیقے کا بنا کر تاریخی حیثیت دے دی اور ظہوراً کو ظہور فاطمہ بیگم بنا دیا جس سے سنہِ پیدائش تیرہ سو اٹھارہ ہجری برآمد ہوتا ہے ۔ اس بچہ کا نام بھی بڑے مولانا صاحب کے ارشاد کے مطابق محمد عمر رکھا گیا ۔" [1]

اس اقتباس میں ارشد تھانوی نے شوکت تھانوی کی تاریخِ پیدائش فروری انیس سو پانچ بتائی ہے ۔ ان کا تاریخی نام "تسخیر احمد" ہے اور ہجری سن کے اعتبار سے سنِ پیدائش تیرہ سو تئیس ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ "تسخیر احمد" کے اعداد نکالنے سے تیرہ سو تیئس ہی برآمد ہوتاہے۔

---

[1] ارشد تھانوی : "شوکت سلمہٗ" مطبوعہ نقوش شوکت نمبر 1963ء ، لاہور ، صفحہ = 436 ۔

تقویم تاریخی از عبدالقوس ہاشمی مطبوعہ مرکزی ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی ، کراچی انیس سو پینسٹھ عیسوی اور The Muslim and christian calendars by G.S.P. Freeman-Grenville oxford University press, New York, Toronto, 1963.

کے مطابق تیرہ سو تیئس ہجری کے عیسوی آغاز اور اختتام کی تاریخیں یہ ہیں : ۱۳۲۳ھ = ۸ مارچ ۱۹۰۵ء تا ۲۴ فروری ۱۹۰۶ء

(تیرہ سو تیئس ہجری = آٹھ مارچ انیس سو پانچ عیسوی تا چوبیس فروری انیس سو چھ عیسوی -)

اس کا مطلب یہ ہوا تیرہ تیئس ہجری کا آغاز آٹھ مارچ انیس سو پانچ عیسوی سے ہوا اور اختتام چوبیس فروری انیس سو چھ عیسوی کو - شوکت تھانوی کے تاریخی نام " تسخیر احمد " کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے شوکت تھانوی کی بتائی ہوئی تاریخ پیدائش یعنی دو فروری انیس سو چار عیسوی درست معلوم نہیں ہوتی - ارشد تھانوی نے شوکت تھانوی کی تاریخِ پیدائش فروری انیس سو پانچ عیسوی تحریر کی ہے - جبکہ تیرہ سو تیئس ہجری کا آغاز 8 مارچ انیس سو پانچ سے ہوتا ہے - گویا ارشد تھانوی نے شوکت تھانوی کا سالِ پیدائش انیس سو پانچ عیسوی تو درست لکھا لیکن مہینہ صحیح طور پر انہیں بھی یاد نہیں رہا -

اس رائے کو تقویت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ ارشد تھانوی نے اپنے ایک اور مضمون میں ، جو ماہنامہ " کتاب " لکھنو کے شوکت تھانوی نمبر میں شائع ہوا ہے - شوکت تھانوی کی پیدائش کے بارے میں صرف سال لکھا ہے مہینہ یا تاریخ بیان نہیں کی - وہ لکھتے ہیں : " شوکت کی ولادت آغاز انیس سو پانس عیسوی میں بندرابن ضلع متھرا میں ہوئی -" [1]

---

[1] ارشد تھانوی : " برادرِ عزیز " مطبوعہ ماہنامہ کتاب لکھنؤ شوکت تھانوی نمبر ، جولائی 1963ء ، صفحہ = 29 -

ارشد تھانوی نے ظہور فاطمہ بیگم کا سالِ پیدائش انیس سو ایک عیسوں بتایا ہے ۔ تاریخی نام کے حوالہ سے اس بات کا تعین کیا جاسکتا ہے کہ ظہور فاطمہ بیگم کی ولادت یکم جنوری انیس سو ایک عیسوی سے 19 ، اپریل انیس سو ایک عیسوی تک کے عرصہ میں ہوئی چونکہ تیرہ سو اٹھارہ ہجری کا آغاز یکم مئی انیس سو عیسوی سے ہوتا ہے اور یہ ہجری سال انیس اپریل تک جاری رہتا ہے ۔

شوکت تھانوی نے " مابدولت " میں تحریر کیا ہے کہ منشی صدیق احمد کے بارہ سال تک اولاد نہ ہوئی بہت منّتوں مرادوں کے بعد ظہور فاطمہ بیگم پیدا ہوئیں جن کی تاریخِ ولادت ارشد تھانوی کے مطابق تیرہ سو اٹھارہ ہجری یا انیس سو ایک عیسوی ہے اس طرح شوکت تھانوی کی تاریخ ولادت آٹھ مارچ انیس سو پانچ عیسوی کے بعد اور چوبیس فروری انیس سو چھ عیسوی سے پہلے ہوسکتی ہے ۔ شوکت تھانوی کی بیگمات اور ان کے قریبی عزیزوں سے گفتگو کرنے کے بعد بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہوا ۔ اولاد اور بیگمات اس سلسلہ میں کچھ بتانے سے قاصر ہیں ۔ شوکت تھانوی کی شخصیت اور کردار کو سامنے رکھتے ہوئے اگر ان کا " برج " تلاش کیا جائے تو ہمیں ان کا برج " حوت " نظر آتا ہے ۔ " حوت مودوں " میں جو خصوصیات ہونی چاہیں وہ سب کی سب ہمیں شوکت تھانوی میں نظر آتی ہیں اور برجِ حوت سے تعلق رکھتے والے لوگ بیس فروری تا بیس مارچ کی تاریخوں میں پیدا ہوتے ہیں ۔ اس اعتبار سے بھی غالب یہی ہے کہ شوکت تھانوی کی پیدائش مارچ انیس سو پانچ عیسوی میں ہوئی ۔

شوکت تھانوی کی پیدائش کے چار سال بعد منشی صدیق احمد کے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی (انیس سو نو عیسوی میں) جس کا نام منظور فاطمہ رکھا گیا ۔ انیس سو بارہ عیسوی میں ایک اور بیٹا پیدا ہوا جس کا نام شفیق احمد

رکھا گیا ۔ اس طرح منشی صدیق احمد کے یہاں چار اولادیں ہوئیں ۔ دو لڑکے اور دو لڑکیاں ۔ ظہور فاطمہ بیگم کی شادی ، ارشد تھانوی سے ہوئی جو بھوپال میں وکالت کرتے تھے اور اپنے وقت کے مشہور شاعر و ادیب تھے ۔ منظور فاطمہ کی شادی انعام الحق صدیقی سے ہوئی ۔ صدیقی صاحب آجکل کینیڈا میں ہیں جبکہ منظور فاطمہ کا انتقال ہوچکا ہے ان کے یہاں صرف ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام نور فاطمہ ہے ، ان کی شادی قیصر حسن انصاری سے ہوئی جو آڈیٹر جنرل کے دفتر میں آفیسر ہیں اور لالو کھیت کراچی میں رہتے ہیں ۔

شفیق احمد ابھی چھوٹے ہی تھے کہ " فالج " جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوگئے جس کی وجہ سے ایک ہاتھ اور ایک پاؤں بیکار ہوگیا تھا ۔ اس مرض کی وجہ سے ان کی شادی بھی نہیں ہوسکی اور بتیس سال کی عمر میں یعنی انیس سو چوالیس عیسوی میں ان کا انتقال ہوگیا ۔

شوکت تھانوی بچپن میں بہت زیادہ بیمار رہے انہیں ضعفِ معدہ کی شکایت تھی ۔ شوکت تھانوی نے " مابدولت " میں اپنے اس زمانہ کا تذکرہ کچھ اس طرح کیا ہے : " سنا ہے کہ میرا یہ زمانہ زیادہ تر بیماریوں میں گذرا ، والد صاحب کی رشوت کی تمام آمدنی ڈاکٹروں کی فیس اور دواؤں کی قیمت میں صرف ہوجاتی ہے ۔ مالِ حرام بجائے حرام کیونکر صرف نہ ہوتا ۔ ضعفِ معدہ کی شکایت اس قدر شدید تھی کہ ڈاکٹروں نے غذا پر نہایت سخت پابندیاں عائد کردی تھیں ۔ سنا ہے کہ اس زمانہ میں ہم کو کھانے کے وقت کا نہیں بلکہ والد صاحب کے کھانے کے وقت کا انتظار رہتا تھا تاکہ وہ کھانا کھانے کے بعد انگلیاں ہم کو چٹا دیں ۔ یہ واقعہ ہے اس وقت کہ جب عمر غالباً سات سال تھی اور اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری شاعری کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے ۔ روایت ہے کہ ہم نے پہلا شعر اسی فاقہ مستی سے متاثر ہوکر اسی عمـــــــــــر میں

کہا تھا ۔"[1]

اس فاقہ مستی کے عالم میں شوکت تھانوی نے جو شعر کہا وہ یہ تھا ؎

نہ دانہ نہ پانی میں کس سے کہوں
ارے میرے اللہ میں اب کیا کروں

شوکت تھانوی کی پیدائش کے چند ہی روز بعد منشی صدیق احمد بندرابن کو چھوڑ کر ریاست بھوپال آگئے جہاں پہلے وہ میونسپل بورڈ کے سرکاری چیئرمین ہوئے اور پھر منتظم پولیس کے عہدہ پر ان کا تقرر ہوگیا یہ عہدہ سپرنٹنڈنٹ ضلع اور انسپکٹر جنرل کے درمیان وزارت کی زیر نگرانی ہوتا تھا ۔ ارشد تھانوی کے والد اور منشی صدیق احمد کے بھائی شیخ سلطان احمد پہلے ہی سے بھوپال میں ہائی کورٹ کے وکیلِ فوجداری تھے ۔ منشی صدیق احمد کے وہاں آجانے سے شوکت تھانوی کو ارشد تھانوی جیسا بھائی ناز برادری کے لئے مل گیا ۔ ارشد تھانوی نے ایک مضمون میں اس بات کا اظہار اس طرح کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں : " میں خود بھی نوعمر یعنی 18 ، 19 سال کا تھا اور ریاست کے قوانین رٹ رٹ کر امتحان وکالت کی تیاری کر رہا تھا ۔ اس مصروفیت سے جتنا وقت ملتا ممدوے یعنی محمد عمر کی ناز برادری میں گذرتا ۔ اسے گھٹنوں پر بٹھا کر جھو جھو کرتا ، کندھے پر بٹھا کر صحن میں ٹہلتا ، دونوں ہاتھوں میں لے کر اچھالتا ، جب وہ کھلکھلا کر ہنستا تو میں باغ باغ ہوجاتا ۔"[2]

ارشد تھانوی اپنے ننھے منے بھائی کی ناز برادری میں مصروف تھے کہ دو سال بعد یو ۔ پی ۔ گورنمنٹ نے منشی صدیق احمد کو واپس طلب کرلیا ۔ چونکہ

---

[1] شوکت تھانوی : " مابدولت " ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور ، صفحہ = 20 ۔

[2] ارشد تھانوی : شوکت سلمہٗ ، مطبوعہ نقوش شوکت نمبر ، صفحہ = 436 ۔

بھوپال میں انہیں ایک وسیع حلقۂ احباب مل گیا تھا اس لئے واپس آکر انگریز کی نوکری میں ان کا دل نہ لگا اور قبل از وقت پنشن لے کر پھر بھوپال آگئے ۔ یہاں کچھ عرصہ تک نواب سلطان جہاں بیگم نے ایک اہم خفیہ خدمت پر مامور رکھا ۔ اس دوران پولیس کا نظم و نسق تبدیل ہوگیا اور ایک سی ۔ پی پولیس کے تجربہ کار عہدہ دار خان بہادر شیخ محمد سرور انسپکٹر جنرل مقرر ہو کر ریاست میں آگئے اور افسرِ اعلی نظامِ پولیس کہلاتے تھے ۔ منشی صدیق احمد ان کے نائب یعنی ڈپٹی انسپکٹر جنرل مقرر ہوئے ۔ ارشد تھانوی نے منشی صدیق احمد کی بذلہ سنجی کا ایک واقعہ اپنے مضمون میں بیان کیا ۔ انسپکٹر جنرل پولیس اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کے اختیارات الگ الگ تھے ۔

" پھر بھی دونوں میں چپقلش ہوجاتی تھی ۔ اس کی بنیاد بعض نجی باتوں پر بھی استوار ہوتی چلی گئی ۔ افسرِ اعلی سیاہ فام ، موٹے تازے اور کافی عمر کے انسان تھے ۔ داڑھی منڈاتے ، مونچھوں پر خضاب لگاتے اور سر کے بال بہت چھوٹے مشینی قینچی سے کترے ہوئے رکھتے تاکہ سفیدی زیادہ نمایاں نہ ہو ۔ ایک روز چچا جان ان کے بنگلے پر گئے ، وہ ننگے سر ، کرتہ پہنے بیٹھے تھے ، نائب افسرِ اعلیٰ صاحب کی اطلاع پر اسی طرح باہر نکل آئے ۔ چچا جان نے دیکھتے ہی بڑے سادہ انداز میں کہا ۔ میں ٹھہر جاتا ۔ آپ نے ناحق غسل خانے سے آنے کی زحمت کی ۔ افسرِ اعلیٰ نے کہا ۔ نہیں تو ۔ چچا جان بولے سر پر صابن کا پھین جو لگا ہوا ہے اس سے میں نے سمجھا ۔ افسرِ اعلیٰ صاحب نے گھبرا کر سر پر ہاتھ پھیرا ، معاف کیجئے گا ، سفید چھوٹے بالوں پر مجھے پھین کا شبہ ہوا ۔ افسرِ اعلیٰ اس پھبتی کو سمجھ تو گیا مگر کسی ناگواری کا اظہار کئے بغیر جواب دیا ۔ آپ

کی نظر زیادہ کمزور ہوگئی ہے ، چشمہ لگایا کیجئے ۔" [1]

اس قسم کی بذلہ سنجی صدیق احمد صاحب کو بہت مہنگی پڑی ۔ چونکہ شیخ محمد سرور صاحب سے ان کے تعلقات روز بروز کشیدہ سے کشیدہ تر ہوتے چلے گئے اور باہمی تلخی نے اس قدر شدت اختیار کی کہ منشی صدیق احمد کو مستعفی ہو کر لکھنؤ جانا پڑا ۔ لکھنؤ آنے کے بارے میں شوکت تھانوی لکھتے ہیں : " انیس سو چودہ عیسوی میں والد صاحب نے بھوپال کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر بجائے تھانہ بھون جانے کے لکھنؤ کا رخ کیا ۔ لکھنؤ سے ان کو سوائے سسرالی دلچسپی کے اور کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ممکن ہے وطن سے اس لئے بھی دور رہنا پسند کیا ہو کہ خارِ وطن اسی وقت تک سنبل و ریحان سے خوشتر محسوس ہوتا ہے جب تک کہ انسان غربت میں اس کا تصور کرتا رہے لیکن جب غربت سے وطن پہنچ کر اس خارِ وطن کو آزمانے کی کوشش کی جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ خار تو خار یہاں تو سنبل و ریحان سب میں خلش موجود ہے ------- وطن جس قدر غربت میں پیارا معلوم ہوتا ہے اسی قدر قرب میں اس کی محبت اور کشش ختم ہوجاتی ہے ۔ وطن اور اعزہ سے محبت کو برقرار رکھنے کے لئے بہت ممکن ہے کہ والد صاحب نے لکھنؤ کو اپنا مستقر بنایا ہو ۔ حالانکہ مشہور یہی تھا کہ سسرال کی محبت پر گھر کی محبت کو قربان کردیا تھا ۔ تھانہ بھون کی مٹی لکھنؤ کی خاک کا پیوند بنی ۔ بہرحال کچھ بھی ہو ۔ والد صاحب نے ذاتی مکان بھی یہیں بنوایا اور بھوپال سے واپسی پر اسی عروس البلاد کی رنگینیوں میں الجھ کر رہ گئے" [2]

---

[1] ارشد تھانوی : شوکت سلمہ ، نقوش شوکت نمبر ، صفحہ = 437 ۔

[2] شوکت تھانوی : "مابدولت" ادارہ فروغ اردو ، لاہور ، صفحہ= 30، 31 ۔

شوکت تھانوی بچپن میں بیمار رہے اس لئے تعلیم کا سلسلہ ذرا دیر سے شروع ہوا ۔ ان کی تعلیم کا آغاز بھوپال میں ہوا ۔ ایک ماسٹر صاحب گھر پر تعلیم دینے کے لئے آتے تھے جنہوں نے اسمٰعیل میرٹھی کی ریڈروں سے پڑھانا شروع کیا ابھی پڑھاتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ ایک دن منشی صدیق احمد نے ان کو پڑھاتے ہوئے کسی لفظ کے تلفّظ پر جو غور کیا تو ان کا تلفّظ غلط محسوس ہوا ، اسی دن ان ماسٹر صاحب کا حساب کردیا گیا ۔ ایک اور ماسٹر صاحب بلائے گئے جو چوتھے روز اس لئے نکال دئیے گئے کہ ذرا سخت قسم کے آدمی تھے اور مارپیٹ میں ہاتھ کھلا ہوا تھا ۔ ایک اور ماسٹر صاحب آئے جن کا نام میر امجد علی تھا ۔ سبق یاد کرو یا نہ کرو انہیں کوئی سروکار نہیں نیا سبق چاہے پڑھو نہ پڑھو ان کو پیسے دے دو ۔ اپنے حصے کی مٹھائی کھلا دو اس کے بعد جو دل چاہے سو کرو ۔ ان باتوں کا علم جب منشی صدیق احمد کو ہوا تو انہوں نے ماسٹر صاحب کو الگ کردیا ۔ بھوپال میں اس وقت دو ہائی اسکول تھے ایک الیگزنڈرا ہائی سکول اور دوسرا جہانگیریہ ہائی اسکول ۔ اول الذکر میں اونچے طبقے کے اور آخر الذکر میں نیچے طبقے کے بچے تعلیم پاتے تھے ۔ شوکت تھانوی کا داخلہ الیگزنڈرا ہائی اسکول کی جماعتِ اطفال میں ہوا لیکن اس اسکول میں پڑھتے ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ ان کے والد صاحب نے بھوپال کی ملازمت ترک کردی اور لکھنو آگئے ۔

قیامِ بھوپال کے دوران منشی صدیق احمد نے شوکت تھانوی کے لئے پرائیویٹ ٹیوٹر بھی رکھے اور اچھے سے اچھے اسکول میں داخل بھی کروایا لیکن زیادہ اثرات انہوں نے ارشد تھانوی کے قبول کئے ۔ انہوں نے " مابدولت " میں لکھا ہے کہ : " اسکول کی تعلیم یا پرائیویٹ ٹیوٹروں کی تمام

جد و جہد سے زیادہ ہم پر اثر اس تربیت کا ہو رہا تھا جو بھائی جان مولانا ارشد تھانوی کی طرف سے ہم کو حاصل ہو رہی تھی - ہمارے ذہن میں نہ معلوم یہ کیوں جم گیا تھا کہ انسان کی زندگی کی سب سے بڑی معراج یہ ہے کہ وہ بھائی جان کا ایسا ہوجائے - ارشد صاحب ہمارے حقیقی چچا زاد بھائی ہیں اور ان کے والد ہمارے بڑے ابا اس زمانہ میں بھوپال ہی میں وکالت کرتے تھے - بھائی جان کو ہم نے اپنے لئے ایک معیار بنالیا تھا - وہ سوٹ پہنتے تھے - ہمارا جی چاہتا کہ ہم بھی سوٹ پہنیں - وہ بڑے ٹھسے سے چاء پیتے تھے ------ بھائی جان کی ادبی مشاغل کا رعب بھی قائم تھا ہم ان کے ساتھ ان کے دوستوں کے یہاں جایا کرتے تھے اور وہ جو باتیں کرتے تھے ان کو ہم ذہن میں محفوظ رکھتے جاتے تھے -"[1]

لکھنؤ آکر کچھ عرصہ تک سلسلۂ تعلیم منقطع رہا - ان کی والدہ صاحبہ نے حضرت مولانا عین القضاۃ رح کے مدرسۂ فرقانیہ میں بھیج دیا - جہاں شوکت تھانوی نے قرآنِ مجید پڑھنا شروع کیا - اس مدرسے کی تعلیم اور ماحول کے بارے میں شوکت تھانوی نے " مابدولت " میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے - " پڑھائی سے زیادہ برے لڑکوں کی بری صحبت کے اثرات ہم نے قبول کرنا شروع کردئیے ، نہایت سڑی سڑی گالیاں سبق سے زیادہ یادکرلیں- بغل بجانے کے کرتب سیکھے سڑک پر کھڑے ہو کر مداریوں کے تماشے دیکھنے لگے - مدرسہ جانے کے لئے گھر سے چلے اور گلی ڈنڈا کھیلنے کے لئے اپنے کسی دوست کے ساتھ کسی میدان میں پہنچ گئے ------ مختصر یہ کہ اس مدرسہ میں جو تربیت حاصل کی اس کے بعد ہم اس قابل رہ گئے تھے کہ یکہ ہانکتے یا کباب پراٹھے کی دکان رکھ کر بیٹھ رہتے -"[2]

---

[1] شوکت تھانوی : " مابدولت " ادارہ فروغ اردو ، لاہور ، صفحہ = 27 ، 28 -

[2] ایضاً ، صفحہ = 31 -

شوکت تھانوی کی اس حالت کو سدھارنے کے لئے ان کی والدہ صاحبہ نے قدم اٹھایا اور اپنے میکے والوں کی مدد سے ماسٹر چھوٹے لال عاصم کو پرائیویٹ ٹیوٹر کی حیثیت سے رکھا گیا۔ ماسٹر صاحب بہت محنت سے پڑھاتے تھے ان کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ طالب علم پر سختی بھی نہ کریں اور سبق بھی یاد کروا دیں۔ ان کی محنت سے شوکت تھانوی نے انگریزی کی ایک آدھ کتاب اور کچھ حساب وغیرہ سیکھ لیا۔ منشی صدیق احمد نے اپنی بیگم صاحبہ کے طعنوں سے تنگ آ کر یہ فیصلہ کیا کہ وہ خود شوکت تھانوی کو فارسی پڑھایا کریں گے۔ آمد نامہ خریدا گیا چونکہ ان کا قول تھا کہ کسی کو آمد نامہ پر عبور حاصل ہے تو وہ نہایت آسانی سے شیخ سعدی بن سکتا ہے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ شوکت تھانوی کو شیخ سعدی بنانے کی فکر میں رہے۔ ایک دن شوکت تھانوی کو آمد نامہ کا پہلا سبق آمد، آمدند، آمدی، آمدید، آمدم، آمدیم دیا اور کہا کہ ایک گھنٹے تک یہ سبق یاد کر کے مجھے سناؤ۔ شوکت تھانوی نے آنکھیں بند کر کے اس سبق کو رٹنے کی کوشش کی لیکن دماغ کسی طرح اس غیر زبان کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ سبق سننے کا وقت آیا تو شوکت تھانوی کورے کے کورے ہی تھے۔ والد صاحب بہت ناراض ہوئے۔ شوکت تھانوی لکھتے ہیں:

" یکایک والد صاحب نے پکڑ کر جو ہم کو جھنجھوڑا ہے تو تہذیب کا کرتہ مع بنیائن ان کے ہاتھ میں تھا اور اس کا گریبان ہمارے برہنہ جسم پر، معلوم یہ ہوتا تھا کہ فارسی کی سب سے بڑی فضیلت حاصل کی ہے اور یہ کوئی خاص ایرانی جبہ ہے جو ہم پہنے بیٹھے ہیں۔ کپڑوں کے بعد اب غالباً کھال کی باری تھی کہ اس ہنگامہ کی اطلاع پا کر ماموں صاحب گھر سے نکل آئے۔ والدہ نے کھڑکی سے جھانکنا شروع کیا ----- ماموں صاحب نے آ کر ہم کو وہاں سے اٹھایا اور بمشکل تمام گھر کے اندر پہنچا دیا اور والدہ صاحبہ نے

سچے دل سے توبہ کی کہ اب کبھی والد صاحب کو ہماری تعلیم کی طرف متوجہ نہ کریں گی گویا یہ سبق والد صاحب نے ہم کو کم اور والدہ صاحبہ کو زیادہ تھا۔" [1]

فارسی پڑھانے کے لئے شوکت تھانوی کو مولانا عبدالرحیم کلیم کے سپرد کیا گیا۔ مولانا فارسی کے بہت بڑے فاضل تھے۔ فارسی میں شعر میں خوب کہتے تھے۔ اور اکثر رؤسا کے یہاں فارسی پڑھانے جایا کرتے تھے۔ شوکت تھانوی مولانا کے پڑھانے سے کچھ مطمئن نظر آتے ہیں اس لئے وہ لکھتے ہیں:

> " مولانا نے ہم کو نہایت شفقت سے پڑھانا شروع کردیا کسی قسم کی سختی نہیں فرمائی اور جو دہشت ان کی صورت دیکھ کر قائم ہوئی تھی وہ رفتہ رفتہ دور ہوگئی۔ مولانا کا پڑھانے کا طریقہ نہایت دلنشین تھا اور وہ کچھ اس انداز سے سمجھاتے تھے کہ وہ سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں مگر ان کی بات سمجھ میں آجاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی ہمارے لئے چند ہی دنوں میں آسان ہوگئی۔" [2]

فارسی کے بل بوتے پر زندگی بسر نہیں ہوسکتی تھی اس لئے شوکت تھانوی کی والدہ نے اپنے ایک بہنوئی سیّد محمد رضا عرف مدّن کے کہنے پر انہیں لال اسکول میں داخل کروا دیا۔ سرخ رنگ ہونے کی بناء پر اسے لال اسکول کہا جاتا تھا یہ دراصل چرچ مشن ہائی اسکول کی برانچ تھا جہاں مدّن صاحب مولوی تھے۔ ان کے اثر و رسوخ سے شوکت تھانوی کو چوتھے درجے میں لے لیا گیا اور پہلے ہی سال چوتھی جماعت پاس کرکے پانچویں جماعت میں آگئے۔ شوکت تھانوی کی طبیعت پڑھائی میں نہ لگتی تھی اس لئے نئے نئے بہانے کرکے وہ

---

[1] شوکت تھانوی: " مابدولت " ادارہ فروغ اردو، لاہور، صفحہ = 37۔

[2] ایضاً، صفحہ = 44، 45۔

اسکول جانے سے بچ جایا کرتے تھے ۔ اس زمانہ میں انہوں نے سینہ میں درد کے بہانے کی بہت کامیاب طریقے سے ایکٹنگ کی وہ خود مابدولت میں اس اداکاری کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں : " سینہ میں درد کے دورے پڑنے لگے ۔ الامان والحفیظ اس قدر شدید درد کہ خدا دشمن کو بھی محفوظ رکھے ۔ محفوظ تو خیر ہم بھی تھے مگر درد تھا بڑا ظالم ایک تو یہ کہ ٹھیک پونے دس بجے دن کو شروع ہوتا تھا ۔ ساڑھے نو بجے اس لئے نہیں کہ ممکن تھا کہ لوگ کھانے کو منع کردیتے اور دس بجے اس لئے نہیں کہ پھر بعد از وقت ہوتا وہ تو اس کا وقت مقرّر تھا ساڑھے نو ــ کھانا کھا کر کتابیں سنبھالیں کپڑے پہن کر کھڑے ہوئے اور درد کا دورہ شروع ہوگیا ۔ اب کوئی کتابیں سنبھال رہا ہے کوئی شیروانی اتار رہا ہے کسی نے ٹوپی تھامی تو کسی نے جوتا اتارا اور ہم کو کسی نہ کسی طرح بستر پر پہنچا دیا گیا ۔ دس بجے ، ساڑھے دس بجے اور آخر کم ہوتے ہوتے گیارہ بجے تک درد ختم اور اسکول غائب ۔ اب ہم چاہے کھیلیں چاہے چین کی بنسی بجائیں کوئی پوچھنے والا نہیں ۔" [1]

سینہ میں درد کے ان دوروں کی اصل وجہ یہ تھی کہ لال اسکول میں حساب کے ماسٹر بھولا ناتھ جی تھے ۔ وہ اسکول میں جتنا پڑھاتے تھے اس سے کہیں زیادہ سوال گھر پر کرنے کے لئے دے دیتے تھے اور سوال نہ کئے جائیں تو بہت مارتے تھے ۔ شوکت تھانوی چونکہ ان کا کام مکمل نہیں کرسکتے تھے اس لئے سکول کے وقت پر ان کے سینہ میں درد اٹھتا اور سکول جانے کا وقت گذر جاتا تو یہ درد ٹھیک ہوجاتا تھا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانچویں جماعت میں فیل ہوگئے ۔ دوسرے سال خدا خدا کرکے پانچویں جماعت میں پاس ہوئے اور تیسرے سال چھٹی جماعت پاس کرکے لال اسکول کو چھوڑ دیا ۔ چونکہ اس

---

[1] شوکت تھانوی: " مابدولت " ادارہ فروغ اردو ، لاہور ۔
صفحہ = 46 ۔

اسکول میں چھٹی جماعت ہی تک تعلیم دی جاتی تھی ۔

گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد کا شمار لکھنؤ کے اچھے اسکولوں میں ہوتا ہے اس لئے بڑی بھاگ دوڑ کے بعد شوکت تھانوی کو وہاں ساتویں جماعت میں داخلہ ملا ۔ یہاں بھی انہوں نے تعلیم کی طرف بہت کم توجہ دی البتہ اس اسکول کی غیر نصابی سرگرمیوں میں سب سے زیادہ حصہ لیا کرتے تھے ۔ یہاں انہوں نے (STUDENTS OWN CLUB) کی بنیاد ڈالی جس کا سوشل سیکریٹری شوکت تھانوی کو مقرر کیا گیا ۔ اپنی غیر نصابی سرگرمیوں کے باعث انہوں نے اس اسکول کو میٹرک پاس کرنے سے پہلے ہی چھوڑ دیا ۔

کچھ دن بے کار پھرتے رہے اچانک ان کے والد صاحب نے ایک ایسے استاد کی خدمات مستعار لیں جو چوبیس گھنٹے شوکت تھانوی کے ساتھ رہے ۔ ان کا نام ماسٹر بخش احمد تھا ۔ چھوٹے قد کے یہ استاد بہت سی صلاحیتوں کے مالک تھے ۔ بے حد باتونی تھے ۔ پڑھانے پر وہ زیادہ زور نہیں دیا کرتے تھے بالکل کھلنڈرے انداز میں سبق دیتے تھے ۔ ایسا انداز انہوں نے اس لئے اختیار کیا کہ شوکت تھانوی کے لئے سبق قابل نفرت چیز بننے کے بجائے قابل قبول ہو سکے ۔ اپنے ان ماسٹر صاحب کی صلاحیتوں کا اعتراف شوکت تھانوی نے اس طرح کیا ہے : " ان کا یہ طریقہ بھی بہت اچھا تھا کہ ہماری ہر معمولی سے معمولی صلاحیت کی بے حد تعریف کرتے تھے اور کمزوریوں کو جہاں تک ہوتا تھا دبانے کی کوشش کرتے تھے ان کا ہر ایک سے یہ کہنا کہ یہ لڑکا بلا کا ذہین ہے ۔ اس کی ذہانت سے آج تک کام نہیں لیا گیا ورنہ یہ کوئی چیز ہوتا ہم کو زبردستی ذہین اور تعلیم کا شوقین بنا رہا تھا خوشامد پسندی تو خیر فطرت میں تھی ہی اسی دکھتی ہوئی رگ پر

ماسٹر بخشش احمد کی نباضی نے ہاتھ رکھ دیا اور اب وہ بے پرواہ طالب علم جو اب تک تعلیم کو والدین کا استبداد سمجھا کرتا تھا تعلیم کو اپنا دلچسپ ترین مشغلہ سمجھنے لگا ۔" [1]

اس زمانے میں علی گڑھ کالج کی جوبلی منائی جارہی تھی اور منشی صدیق احمد علی گڑھ گئے ہوئے تھے وہاں انہوں نے یہ رائے قائم کی کہ شوکت صاحب کو علی گڑھ بھیج دیا جائے چنانچہ علی گڑھ سے تار دے کر ان کو بلایا تا کہ وہاں کے ماحول سے مانوس ہوسکیں ۔ جوبلی کی سیر کر کے جب واپس لکھنو آئے تو علی گڑھ کا کورس خریدا گیا ۔ طے یہ ہوا کہ ایک سال تک گھر پر مکمل تیاری کر کے علی گڑھ سے پرائیویٹ طور پر امتحان دے دیا جائے اس مرتبہ شوکت صاحب نے سنجیدگی سے مطالعہ شروع کیا ۔ تمام مضامین میں بے حد کمزور تھے اس لئے سخت محنت کرنا پڑی ۔ دن رات محنت کرنے کی وجہ سے بیمار پڑگئے ۔ ڈاکٹروں کو دکھایا گیا تو کسی نے تپ دق اور کسی نے فائیلیریا (FILARIA) تجویز کیا ۔ علاج کیا گیا تو کچھ دنوں کے بعد صحت یاب ہوگئے لیکن امتحان نہ دے سکے ۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کے والد صاحب بیمار ہوگئے ۔ اس بیماری میں بیس اپریل انیس سو اٹھائیس عیسوی کو ان کا انتقال ہوگیا اور یوں شوکت صاحب کی تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا ۔

ابھی تعلیم کی کوئی ابتدائی منزل بھی سر نہ ہوئی تھی کہ شوکت تھانوی کو شادی کی سوجھی ۔ انیس سو سترہ عیسوی میں شوکت تھانوی کی بڑی بہن ظہور فاطمہ بیگم کی شادی ارشد تھانوی سے ہوگئی ۔ ارشد تھانوی کی ایک سوتیلی بہن شوکت صاحب سے چھ ماہ بڑی تھی ان کا نام افسری بیگم

---

[1] شوکت تھانوی : "مابدولت" ادارہ فروغ اردو ، لاہور ، صفحہ = 61۔

تھا لیکن شوکت صاحب ان کو سفید بلی کہتے تھے ۔ بھوپال میں بہت عرصہ اکٹھے رہنے کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہوگئے اور شوکت تھانوی نے افسری بیگم سے شادی کرنا چاہی جس کے لئے اپنی بہن اور بہنوئی کی مدد کے طالب ہو کر لکھنو سے ان کے یہاں پہنچے ۔ مولانا ارشد تھانوی نے ایک مضمون میں اس بات کا تذکرہ اس طرح کیا ہے : " میں اس زمانہ میں ایک بعید مقام " جے تھاری " میں تحصیلدار تھا ، میاں محمد عمر وہاں پہنچے اور اپنی باجی سے جو اب میری بیوی اور تین بچوں کی ماں بن چکی تھیں کہنے لگے ۔ باجی میں ریل سے اتر کر تیس میل کا یہ پہاڑی راستہ آپ سے ملنے کے لئے طے کرکے آیا ہوں بیل گاڑی میں جھٹکے کھاتے ہڈی پسلی ایک ہوگئی ہے ۔ ظاہر ہے بہن کا جذبۂ محبت اس ایثار پر کس قدر بھڑک اٹھا ہوگا بہت متاثر ہوکر شفقت بھری دعائیں دیں ۔ دو روز تک اسی طرح باجی کو متاثر کرکے حرفِ مطلب زبان پر لائے اور بڑی تمہید کے بعد فرمانے لگے ۔ میری شادی نیلی بلی نہیں نہیں افسر بیگم سے کرا دو ۔ وہ حیران ہوکر اس کی صورت دیکھنے لگیں ۔ پھر بولیں وہ تم سے چھوٹی نہیں بلکہ چھ ماہ بڑی ہے تمہاری شادی تم سے کم عمر لڑکی سے ہونا چاہئیے ۔"[1]

شوکت صاحب نے اپنی بہن کی یہ بات سن کر فرمایا کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بیوی حضرت خدیجۃ الکبری رسولِ پاک سے پندرہ سال بڑی تھیں ، افسری بیگم تو مجھ سے صرف چھ مہینے ہی بڑی ہے ۔ جب ان کی بہن نے زیادہ پس و پیش کی تو ریل کی پٹری پر لیٹ کر ٹرین سے کٹ مرنے کی دھمکی دی ۔ ظہور فاطمہ بیگم نے یہ تمام حالات اپنے شوہر

---

[1] ارشد تھانوی : " شوکت سلمہٗ نقوش شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ = 439 ۔

ارشد تھانوی کو بتائے تو انہوں نے ایک خط اپنے والد کو اور دوسرا شوکت صاحب کے والد کو لکھا ۔ ارشد صاحب کے والد نے جواب دیا کہ افسری کی نسبت خالہ کے بیٹے سے طے ہوچکی ہے اور شوکت صاحب کے والد کا لکھنؤ سے جواب آیا کہ فوراً ان کو لکھنؤ روانہ کردو ۔ شوکت صاحب لکھنؤ جا کر بھی اپنی ضد پر اڑے رہے ۔ ایک دن ان کے والد نے بھرا ہوا ریوالور نکال کر سامنے رکھ دیا کہ ان کے سامنے اپنے آپ کو گولی مارلیں ۔ پھر ریوالور کی نال ان کی کنپٹی پر چھوا کر کہا کہ اس جگہ گولی لگتے ہی بھیجا پاش پاش ہوجائے گا ۔ یہ سنتے ہی ان کا جسم تھر تھرانے لگا اور عشق کا بھوت سر سے اتر گیا ۔

اس واقعہ سے شوکت صاحب کے والدین کے دل میں یہ احساس پیدا ہوا کہ انکی شادی کردی جائے تو بہتر ہے ۔ چنانچہ ان کے والد نے حکم دیا کہ وہ دور اور نزدیک کے رشتہ داروں کے یہاں جائیں اور خود یہ بتائیں کہ وہ کس لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں ۔ چنانچہ سب سے پہلے شوکت صاحب اپنے ننھیال ملاواں ضلع ہردوئی بھیجے گئے وہاں ان کی خالہ رہتی تھیں ۔ ان کی تین لڑکیاں تھیں ۔ ان میں سے ایک لڑکی کو پسند کر آئے اور والدہ صاحبہ کو اپنے انتخاب کی اطلاع دی ۔ جب والد صاحب نے سنا تو وہ اس فیصلے سے مطمئن نہ ہوئے اور کہا کہ یہ فیصلہ جلد بازی کا ہے ۔ باقی عزیزوں کے یہاں بھی جانا چاہئیے تاکہ اطمینان سے کوئی فیصلہ کیا جائے ۔ لہذا اس مرتبہ ان کو مین پوری بھیجا گیا جہاں ان کے ایک قریبی رشتہ کے خالہ زاد بھائی حکیم مولوی محمد سجاد حسین رہتے تھے جو مشن ہائی اسکول میں عربی اور فارسی کے استاد تھے ۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے جس صاحبزادی کو پسند فرمایا اس کا نقشہ اپنی کتاب "مابدولت" میں اس طرح کھینچا ہے ۔

" یہاں ہم جن صاحبزادی کو دیکھنے آئے تھے ان کو دیکھ کر آنکھوں کا نور اور دل کا سرور حاصل ہوا ، طبیعت باغ باغ ہوگئی اور ملاواں جا کر جو فیصلہ کیا تھا اس پر اپنے احمق ہونے کا سچے دل سے اعتراف کیا ۔ ایک عجیب گڑیا سی لڑکی ، بھولا بھولا چہرہ ، پیاری پیاری باتیں ، پڑھی لکھی ، نمازی پرہیزگار ہنس دے تو منہ سے پھول جھڑنے لگیں اور رو دے تو ـــ مگر روئے اس کی بلا ۔ "[1]

سجاد صاحب کی یہ منجھلی صاحبزادی تھیں جو شوکت تھانوی کو پسند آئیں ۔ انہوں نے گھر پہنچکر اپنی والدہ سے کہدیا کہ اس مرتبہ ان کا انتخاب آخری اور قطعی ہے ۔ ان کی والدہ نے پہلے تو ان کے بیان کو معتبر نہ سمجھا لیکن جب اس سلسلہ میں مستقل مزاج پایا اور ایک خاص قسم کی بے قراری کا اندازہ کر لیا تو والد صاحب سے سفارش کی کہ اب شوکت صاحب کی شادی کا باقاعدہ پیغام مین پوری بھیج دیا جائے ۔ جب شادی کا پیغام سجاد صاحب کے یہاں پہنچا تو انہوں نے یہ شرط پیش کی کہ لڑکا کم ازکم میٹرک پاس ہو اس کے علاوہ یہ بھی کہا کہ پہلے بڑی لڑکی کا عقد ہوجائے اس کے بعد منجھلی لڑکی کی نسبت پر غور کیا جائے گا ۔ آخر کار شوکت صاحب کے بزرگوں نے سجاد صاحب کو اس بات پر راضی کرلیا کہ آپ نکاح کردیجئے اور لڑکی کو اس وقت رخصت کیجئے گا جب آپ کی شرط پوری ہوجائے پھر ان پر ایسا زور دیا گیا کہ وہ بڑی لڑکی کے عقد سے پہلے ہی منجھلی لڑکی کے عقد پر راضی ہوگئے ۔ انیس سو چوبیس عیسوی میں اتفاق سے حکیم صاحب کا تمام خاندان لکھنؤ آیا تھا اور یہ سب حکیم صاحب کے بھائی مولوی محمد عثمان صاحب کے یہاں قیام پذیر تھے ۔ طے یہ ہوا کہ یہیں عقد ہوجائے رخصتی بعد میں ہوتی رہے گی ۔

---

[1] شوکت تھانوی : " مابدولت " ادارہ فروغ اردو لاہور ، بار چہارم ، صفحہ = 72 ۔

چنانچہ نہایت سادگی سے حکیم مولوی محمد سجاد حسین صاحب نے ایک قریبی مسجد میں اپنی صاحبزادی کا نکاح شوکت صاحب سے پڑھا دیا ۔ اس طرح انیس سو چوبیس عیسوی میں سعیدہ سجاد ، مسز سعیدہ شوکت تھانوی ہوگئیں ۔ نکاح کے کچھ عرصہ بعد ہی شوکت صاحب نے رخصتی کے لئے کوششیں شروع کردیں لیکن مولوی سجاد حسین صاحب کے حالات اجازت نہ دیتے تھے کہ یہ تقریب عمل میں آئے ۔ شوکت صاحب کی کوششیں جاری رہیں اور یہ کوششیں بالآخر انیس سو چھبیس عیسوی میں رنگ لائیں ۔ شوکت صاحب ، " مابدولت " میں اپنے دولہا بننے کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں : " دسمبر انیس سو چھبیس عیسوی میں ہم پھر ایک مرتبہ دولہا بن کر لکھنو سے مین پوری گئے والد صاحب قبلہ پہلے ہی سے مین پوری کی نمائش میں خان بہادر سیّد زین الدین کلکٹر مین پوری کی دعوت پر تشریف لے جاچکے تھے ۔ آپ نے تار پر اطلاع دی کہ تم لوگ آؤ میں یہیں بارات میں شامل ہوجاؤں گا ۔ لہٰذا ماموں صاحب ہم کو اور ہمارے ایک دوست کو لے کر مین پوری روانہ ہوگئے ۔ یہ گویا تین آدمیوں کی برات تھی اور چوتھے باراتی مین پوری ہی میں موجود تھے ۔ نہایت سادگی کے ساتھ رخصتی عمل میں آئی کسی قسم کی کوئی رسم ادا نہیں کی گئی ۔ محض یہ کہ سلام کرائی ہوئی اور جو تھوڑا بہت روپیہ اس سلسلہ میں ملا وہ ماموں صاحب کے حوالے کرکے ہم اپنی سعیدہ کو لکھنؤ لے آئے ۔ یہاں البتہ مہمان کافی تھے اور گھر میں شادی کی چہل پہل بھی نظر آرہی تھی ۔" ـــہ[1]

انیس سو بیس عیسوی میں شوکت تھانوی جب گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد ، لکھنو میں ساتویں جماعت کے طالب علم تھے تو انہوں نے اپنے دوستوں کے لئے ایک " قلمی رسالہ " نکال کر اپنی صحافیانہ زندگی کا آغاز

---

[1] ـــہ شوکت تھانوی : " مابدولت ادارۂ فروغ اردو ، لاہور ، بار چہارم ، صفحہ = 90 ، 91

کیا ۔ اس رسالہ کا ہر نمبر مقبول ہوا ۔ انیس سو پچیس عیسوی میں ان کا تعارف " رسالہ حسنِ ادب لکھنو " کے مدیر منشی واحد علی لطف لکھنوی سے ہوا جنہیں ایک معقول آدمی کی تلاش تھی کہ جن کا نام ادارت میں دیا جاسکے۔ اور یہ معقول آدمی انہیں شوکت تھانوی کے روپ میں دستیاب ہو گئے چنانچہ رسالہ حسن ادب کے تازہ شمارہ کے سرورق پر ایڈیٹر ملک التحریر شیخ محمد عمر شوکت تھانوی لکھا گیا

انیس سو اٹھائیس عیسوی میں مولانا ارشد تھانوی کے ہفتہ وار " تحریک " میں فکاہیہ کالم " لالہ زار " کے نام سے لکھنا شروع کیا ۔ فکاہیہ کالم لکھنے کا سلسلہ انیس سو اٹھائیس عیسوی سے شروع ہو کر انیس سو تریسٹھ عیسوی تک جاری رہا ۔ " پہاڑ تلے " کا آخری کالم ان کے انتقال کے تیسرے دن سات مئی انیس سو تریسٹھ عیسوی کو جنگ راولپنڈی کی اشاعت میں شامل ہوا ۔

بیس اپریل انیس سو اٹھائیس عیسوی کو شوکت تھانوی کے والد کا انتقال ہوا تو انہیں ملازمت کا خیال آیا ۔ زیادہ پڑھے لکھے نہ ہونے کی وجہ سے ان کے رشتہ دار ان کی طرف سے فکر مند تھے ۔ مولانا ارشد تھانوی نے کوشش کر کے انہیں تحصیلدار لگوانے کا وعدہ کیا ۔ لیکن شوکت تھانوی نے اپنے لیے اس ملازمت کو بوجوہ موزوں خیال نہیں کیا ۔ ارشد تھانوی اپنے ایک مضمون میں تحریر کرتے ہیں: " چچا جان کی وفات کے بعد وہ میرے پاس بھوپال آیا ۔ میں ان دنوں ایک تحصیل کا انچارج تھا اور نواب صاحب کے وزیرِ خصوصی بسلسلۂ دورہ آئے ہوئے تھے ۔ میں نے ان سے شوکت کی ملازمت کے لئے عرض کیا اور وہ تحصیلدار مقرر کرنے پر آمادہ ہوگئے ، شوکت گھر میں

باجی کے پاس جا کر رونے لگے کہ بھائی جان مجھے لکھنؤ چھڑا کر دیہاتی ماحول میں قید کرنا چاہتے ہیں ۔ مجھے خبر ہوئی تو سمجھایا کہ بھیّا ، تمہاری بیوی ہے ، کچھ دنوں میں بچے ہوجائیں گے ۔ انگریزی حکومت میں ملازمت کے لئے تمہارے پاس تعلیمی سہولتیں نہیں ، تمہارے ابا کی دیرینہ خدمات اور باقیماندہ رسوخ کی وجہ سے تمہیں یہ سنہری موقع مل رہا ہے ، کیوں کفرانِ نعمت کرتے ہو ، آگے چل کر ترقی پاؤگے ۔ نائب ناظم (ڈپٹی کلکٹر) ہوسکتے ہو اور قسمت نے یاوری کی تو ناظمِ ضلع یعنی کلکٹر بھی بن سکتے ہو ، شوکت بظاہر رضا مند ہوگئے اور بڑے ابّا یعنی میرے والد سے مشورہ کا بہانہ کرکے بھوپال آئے اور وہاں سے لکھنو پہنچ گئے ۔ بعد میں معذرت آمیز خط کے ذریعے مجھے اطلاع دی کہ میں نے روز نامہ " ہمدم " کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں ملازمت کرلی ہے ۔ " [1]

شوکت تھانوی نے اپنی ملازمت اور صحافت سے وابستگی کے حالات " مابدولت " اور " کچھ یادیں کچھ باتیں " میں بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ روز نامہ " ہمدم کی ملازمت سے شوکت تھانوی نے صحافت کا باقاعدہ آغاز کیا ۔ اس زمانہ میں جالب دہلوی روز نامہ " ہمدم " کے ایڈیٹر تھے ۔ ان کی ہدایت اور رہنمائی میں انہوں نے کام کرنا شروع کیا ۔ جالب دہلوی نے قدم قدم پر ان کی رہنمائی کی اور ہر تحریر پر وہ اصلاح دینا اپنا فرض سمجھتے تھے ۔ جالب دہلوی نے سب سے پہلے ان سے چھوٹے شذرات لکھوانا شروع کئے اس کے بعد کچھ ترجمے کا کام سپرد ہوا ۔ سیّد جالب ان کے کام سے اتنا خوش ہوئے کہ انہوں نے اپنے اخبار کا فکاہیہ کالم " دو دو باتیں " ان سے لکھوانے کا فیصلہ کیا ۔ سیّد جالب یہ جانتے تھے کہ فکاہیہ کالم

---

[1] ارشد تھانوی : " شوکت سلمہٗ " مطبوعہ نقوش شوکت نمبر 1963 ء ، صفحہ = 449 ، 450 ۔

لکھنے کے لئے مزاح کا فطری رجحان ضروری ہے اور اس فطری رجحان کو انہوں نے شوکت تھانوی کے ہاں پالیا تھا ۔ اس لئے ان کی مہربانیوں کے دروازے شوکت تھانوی کے لئے کھلتے چلے گئے ۔

انیس سو تیس عیسوی میں سیّد جالب دہلوی "ہمدم" سے علیحدہ ہوئے تو چوہدری رحم علی ہاشمی کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا ۔ چوہدری صاحب اردو اور انگریزی صحافت کا وسیع تجربہ رکھتے تھے ۔ شوکت تھانوی نے ان کے ماتحت کام کرکے ان کے تجربہ سے بھی استفادہ کیا ۔

ستمبر انیس سو اکتیس عیسوی میں نسیم انہونوی کی تحریک پر ایک ہفت روزہ رسالہ "سرپنچ" نکالنے کا فیصلہ کیا گیا جس کی ادارت شوکت تھانوی کے سپرد ہوئی ۔ اس زمانہ میں "اودھ پنچ" مائل بہ زوال تھا ۔ "سرپنچ" کو "اودھ پنچ" کے انداز ہی میں نکالنا طے پایا تھا ۔ اس لیئے "اودھ پنچ" کے بہت سے لکھنے والوں کے نام "سرپنچ" کے صفحات پر نظر آنے لگے ۔ لیکن یہ پرچہ "اودھ پنچ" کے معیار تک نہ پہنچ سکا ۔ اس میں شک نہیں کہ طنز و ظرافت کا ایک بہت بڑا خزانہ ہمیں "سرپنچ" میں نظر آتا ہے ۔

انیس سو بتیس عیسوی میں روزنامہ "ہمدم" کی انتظامیہ نے اسے بند کرنے کا فیصلہ کیا تو شوکت تھانوی کو ایک مرتبہ پھر بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑا لیکن ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ روزنامہ "اودھ اخبار" میں ان کا تقرّر اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے ہوگیا ۔ کچھ عرصہ کے بعد ایڈیٹر نے اس اخبار کی ادارت سے استعفیٰ دیا تو شوکت تھانوی کو قائم مقام ایڈیٹر بنا دیا گیا لیکن کچھ عرصہ بعد انہیں دوبارہ اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنا پڑا ۔

شوکت تھانوی "اودھ اخبار" کی ملازمت اور "سرپنچ" کی ادارت میں مصروف تھے کہ روز نامہ "تیج" دہلی کے ایڈیٹر شری رام لال ورما مالکان "تیج" سے کسی بات پر ناراض ہوکر لکھنؤ آگئے اور لکھنؤ سے اپنا ذاتی روز نامہ "ہند" نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی ادارت کے لئے امین سلونوی کی معرفت شوکت تھانوی سے ملے۔ امین سلونوی کے اصرار پر ان سے شرائط طے کرکے شوکت تھانوی اخبار "ہند" سے وابستہ ہوگئے اور "اودھ اخبار" کی ملازمت کو خیر باد کہہ دیا۔ روز نامہ "ہند" بھی زیادہ دیر نہ نکل سکا صرف دو مہینے کے بعد ہی مالی مشکلات کی بناء پر اسے بند کردیا گیا۔ روز نامہ "ہند" کے بند ہوجانے کے بعد سرپنچ جرنلس نے "شباب" کے نام سے ایک ادبی ماہنامے کا اجراء کیا اور شوکت تھانوی نے اس کے مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔

انیس سو پینتیس عیسوی میں جب ہفتہ وار "حق" نے روز نامہ کی حیثیت اختیار کی تو شوکت تھانوی کو اس میں اسسٹنٹ ایڈیٹری کی پیش کش کی گئی جسے انہوں نے اپنے دوستوں کے مشورہ سے قبول کرلیا۔ اس اخبار میں[1] آکر فکاہیہ کالم "حق و باطل" شروع کیا۔

انیس سو سینتیس عیسوی میں عبدالرؤف عباسی نے ایک ماہنامہ نکالنے کا فیصلہ کیا جس کا نام "کائنات" تجویز ہوا اور اس کا ایڈیٹر شوکت تھانوی کو بنایا گیا۔ روزانہ اخبار کی مصروفیات اتنی زیادہ تھیں کہ اس ماہنامہ پر زیادہ توجہ نہ دی جاسکی جس کی وجہ سے ماہنامہ "کائنات" کے پانچ، چھ شمارے ہی نکلے تھے کہ اسے بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

انیس سو اڑتیس عیسوی میں شوکت تھانوی نے عبدالرؤف عباسی کے روپیے

میں تبدیلی محسوس کی تو "حق" اخبار سے استعفیٰ دے دیا ۔ شوکت تھانوی کے احباب نے یہ کوشش کی کہ ان کا استعفیٰ واپس ہوجائے لیکن ان کی کوششیں بار آور نہ ہوسکیں اور ان کا استعفیٰ منظور کرلیا گیا ۔ خان بہادر سیّد عین الدین کو جب ان حالات کا پتہ چلا تو انہوں نے شوکت تھانوی کو اپنا ذاتی اخبار نکالنے کا مشورہ دیا ۔ اس کی مالی اعانت کی ذمہ داری خود قبول کی ۔ شوکت تھانوی نے ایک منصوبہ بنایا جسے اس دور کے اہم جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے سامنے پیش کیا گیا انہوں نے خان بہادر سیّد عین الدین کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اخبار کو سرمایہ فراہم کرنے کا وعدہ کیا ۔ شوکت تھانوی کے اخبار کا نام "طوفان" طے پایا ۔ اس اخبار کا اسسٹنٹ ایڈیٹر خان محبوب طرزی کو بنایا گیا ۔ گیارہ مئی انیس سو اڑتیس عیسوی کو طوفان کا "نمونہ" کا پرچہ نکلا جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ اس کی باقاعدہ اشاعت یکم جون انیس سو اڑتیس عیسوی سے شروع ہوگی ۔ بیس دن کا یہ وقفہ اشتہارات حاصل کرنے اور خریدار فراہم کرنے میں صرف کیا گیا ۔ یکم جون انیس سو اڑتیس عیسوی سے اس کی باقاعدہ اشاعت شروع ہوگی ۔ ایک سال تک یہ اخبار جاری رہا ۔ خان بہادر سیّد عین الدین کی ریٹائرمنٹ کے بعد یہ اخبار مالی دشواریوں کا شکار ہوا جس کی وجہ سے اسے بند کردینا پڑا ۔ شوکت تھانوی "مابدولت" میں اس اخبار کے بند ہونے کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں : "خان بہادر سیّد عین الدین صاحب بھی ریٹائر ہوگئے اور یہ ہاتھی ہمارے دروازے پر بندھا ہوا چھوڑ گئے ۔ کچھ دنوں تک تو ہم اس ہاتھی کے لئے چارہ فراہم کرتے رہے آج خان بہادر سیّد احمد حسین صاحب رضوی نے ایک عطیہ دے دیا تو کل نواب صاحب چھتاری سے کچھ حاصل کرلیا ۔ تعلقہ دار صاحبان کو متوجہ کیا کہ آپ اس کو اپنا پرچہ کہتے ہیں تو اس کو سنبھالئے ۔ مگر وہ ٹھہرے رئیس

ان کو بھلا اس کی کیا فکر کہ ان کی غفلت کا کیا نتیجہ ہوسکتا ہے آخر کار ان کی طرف سے مایوس ہو کر پہلے تو گھر کا جو کچھ بچا کھچا تھا ، وہ سب اخبار کی نذر کر دیا اس کے بعد ڈاکٹر محمد عمر صاحب سے کچھ روپیہ قرض لیا اور وہ اپنی ایک کتاب کا حقِ تصنیف حاصل کرکے ادا کیا اپنی منہ بولی خالہ اماں بیگم صاحبہ خان بہادر شیخ احمد علی صاحب سے کچھ قرض لیا اور سب کچھ اخبار میں لگا کر اس طوفان کی نذر کردیا ۔"[1]

انیس سو اڑتیس عیسوی میں لکھنُو ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا اور ملک حسیب احمد کا تقرر بحیثیت ڈائریکٹر آف پروگرام ہوا ۔ انہوں نے شوکت تھانوی کو ریڈیو پروگرام دینے شروع کردئیے ۔ شوکت تھانوی نے مزاحیہ تقریروں کا پہلا سلسلہ "سمرقند و بخارا" کے عنوان سے شروع کیا ۔ ان کی سب سے پہلی تقریر سولہ جون انیس سو اڑتیس عیسوی بروز جمعرات' رات 7 بجکر پنتالیس منٹ پر ریڈیو لکھنُو سے نشر ہوئی ۔ تقاریر کے اس سلسلہ کے علاوہ سب سے پہلا ڈراما لکھنُو ریڈیو سے "خدا حافظ" کے نام سے پیش کیا اور اس میں خود ہی ہیرو کا پارٹ بھی ادا کیا ۔ دسمبر انیس سو اڑتیس عیسوی میں لکھنُو ریڈیو اسٹیشن نے ڈراموں کا ایک سلسلہ "مون شائن تھیٹریکل کمپنی آف کاٹھ گودام" کے نام سے لکھوایا ۔ جس میں قدیم تھیٹر کی گونج مزاحیہ انداز میں نظر آتی تھی ۔ یہ ڈراما ہر ہفتہ نشر ہوتا تھا ۔

انیس سو انتالیس عیسوی کے اوائل میں جگل کشور مہرا نے شوکت تھانوی کو بحیثیت مصنّف و صداکار ریڈیو میں ملازمت دلوادی جس کی وجہ

---

[1] شوکت تھانوی : "مابدولت" ادارۂ فروغ اردو ، لاہور ، بار چہارم ، صفحہ = 218 ، 219 ۔

سے انہیں مکمل طور پر اخبار نویسی ترک کرنا پڑی ۔

ابتدا سے ہی لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن اہلِ ادب کا مرکز بن گیا تھا ملک حبیب احمد پروگرام ڈائریکٹر تھے ۔ غلام قادر فرید ، سیّد انصار ناصری ، میاں لطیف الرحمن ، فیروز نظامی ، کرشن چندر اور عشرت رحمانی پروگرام کے مختلف شعبہ جات کے ناظم تھے ۔ شوکت تھانوی مصنف اور صداکار مقرر ہوئے تھے ۔ ہمہ وقت محفلِ فکر و فن آراستہ رہتی ۔ نئی نئی تجویزوں اور نئے نئے پروگراموں پر غور کیا جاتا ۔ نت نئے تجربے کئے جاتے اس میں شوکت تھانوی کی ذہانت اور زود نویسی کا بڑا حصہ ہوتا ۔ ان کی فنی صلاحیتیں ایک کامیاب صداکار کی حیثیت سے بھی غیر معمولی تھیں ۔ بچوں کے پروگرام میں جو " ایک تھا راجہ " کے عنوان سے ہفتہ میں تین روز نشر کیا جاتا تھا ۔ شوکت تھانوی اس میں چاچا کا کردار ادا کرتے تھے ۔ خود ہی اس پروگرام کا مسوّدہ بھی لکھتے تھے ۔ بچوں کے اس پروگرام کو حیرت انگیز شہرت حاصل ہوئی

محمود

انیس سو انتالیس عیسوی میں انہوں نے ہفتہ وار خاکوں کا سلسلہ " منشی جی " شروع کیا ۔ منشی جی کا کردار رونق علی کرتے تھے ، منشائن یا منشی جی کی بیوی سردار اختر بنتی تھیں اور کچھ عرصہ تک عرش منیر بھی یہ کردار ادا کرتی رہیں ۔ جب کبھی رونق علی نہ آتے تو شوکت تھانوی ایک خاص طریقہ سے منہ میں پان رکھ کر زبان گلے میں دبا کر آواز نکالتے تھے ۔ شوکت تھانوی اس سلسلہ کے مصنف بھی تھے اور ہدایات کار بھی ۔ اس میں روز مرہ کی معاشرتی زندگی پر نہایت دلکش انداز میں طنز کی جاتی تھی ۔ مختصر یہ کہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کی رونق زیادہ تر شوکت تھانوی کے ہنگاموں پر موقوف تھی ۔

یکم فروری انیس سو تینتالیس عیسوی کو شوکت تھانوی سیّد امتیاز علی تاج

کی دعوت پر پنچولی آرٹ پکچرز لاہور میں بحیثیت سٹوری رائیٹر آئے۔ شوکت تھانوی نے اپنے ایک مضمون "حقِ لاہوری نمک" میں لکھا ہے کہ: "یکم فروری 1943ء کو پنچولی آرٹ پکچرس میں چارج لیا۔ میو روڈ پر قیام۔ مسلم ٹاؤن میں کام۔ روزانہ پانچ میل کے قریب جانا اور پانچ میل آنا۔ دس میل یومیہ کی سائیکل بازی کے بعد تندرست آدمی کو دِق ہوسکتی ہے ------ ---- البتہ یہ لاہور کا فیض تھا جس نے یہ تمام کام ہم سے لئے اور یکم فروری 1943ء سے چھ جنوری انیس سو چوالیس عیسوی تک تقریباً ایک سال کا زمانہ اس عمر میں شاید ہی ہم بھول سکیں۔ پھر حیرت یہ کہ چھ جنوری انیس سو چوالیس کو لاہور چھوڑتے ہی ہم بالکل وہی تھے۔"[1]

شوکت تھانوی نے پنچولی آرٹ پیکچرز میں فلم "شیریں فرہاد" کی کہانی اور فلم "پونچی" کے گانے لکھے۔ یہاں ان کی تنخواہ پانچ سو روپے ماہانہ تھی۔ تقریباً گیارہ مہینے لاہور میں قیام پذیر رہے اور 6 جنوری انیس سو چوالیس عیسوی کو سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن سے وابستہ ہوکر لکھنؤ چلے گئے۔ جنگ کے دنوں میں حکومت ہند نے جنگی پروپیگنڈے کے سلسلہ میں سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن کا ایک ادارہ قائم کیا تھا جس کے ڈائریکٹر جنرل ابو الاثر حفیظ جالندھری تھے انہوں نے یو۔ پی میں بطور "آرگنائزر" شوکت تھانوی کا تقرر کردیا تھا۔ ان کا ہیڈ کوارٹر لکھنؤ تھا۔ یو۔ پی کے مختلف ضلعوں میں گشت کرنا اور وہاں گانے اور مشاعرے کے ذریعے جنگی مقاصد کی تبلیغ کرنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔ ساغر واسطی اور بسمل اله آبادی ان کے شریک کار تھے۔

جنگ ختم ہوجانے کے بعد انیس سو چھیالیس عیسوی میں شوکت تھانوی دوبارہ پنچولی آرٹ پکچرز میں آگئے چونکہ دل سکھ صاحب (پنچولی آرٹ

---

[1] شوکت تھانوی: "حق لاہوری نمک" ماخوذ از لاہوریات، صفحہ = 26، 27، 32، 33، بار چہارم، اردو بک اسٹال، لاہور

پکچرز کے مالک) سے یہ وعدہ تھا کہ جب بھی کام ختم ہوجائے گا تو میں آپ کی طرف آجاؤں گا ۔ چنانچہ اس وعدہ کا پاس کرتے ہوئے شوکت تھانوی دوبارہ لاہور آگئے ۔ شوکت تھانوی کے بڑے بیٹے سعید عمر اس وقت نویں جماعت میں تھے اس لئے وہ لکھنو میں وکیل احمد صاحب کے یہاں ٹھہر گئے ۔ خورشید عمر رشید عمر اپنے والدین کے ساتھ لاہور آگئے ۔ لاہور آکر شوکت تھانوی مسلم ٹاون کی ایک کوٹھی " قصرِ راحت " میں قیام پذیر ہوئے ۔

انیس سو چھیالیس عیسوی میں پنچولی آرٹ پکچرز میں دوبارہ آئے تو شوکت تھانوی کے سپرد گانے لکھنے کے کام ہوا لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد سیاسی حالات نے ایسی صورت اختیار کرلی کہ اس فلم کی تکمیل جس کے گانے شوکت تھانوی نے لکھے تھے ، ستمبر انیس سو سنتالیس عیسوی تک ملتوی کردی گئی مگر تقسیم ملک کے بعد پنچولی آرٹ پکچرز کا کاروبار بند ہوگیا اور اس فلم کے بننے کی نوبت نہیں آئی ۔ ان باتوں کی تائید کے لئے سیّد امتیاز علی تاج کے مضمون سے ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے ۔ " آخر انیس سو چھیالیس عیسوی میں شوکت صاحب سے تعلقات زیادہ بڑھنے کی ایک صورت پیدا ہوگئی ۔ سانگ پبلسٹی کا کام چھوڑ کر وہ دوبارہ پنچولی آرٹ پکچرز میں آئے تو اس زمانے میں میں بھی اس کمپنی کے لئے کام کر رہا تھا ۔ کمپنی کے مالک نے مجھ سے ایک فلمی ڈراما لکھنے کی فرمائش کر رکھی تھی جسے میں کمپنی ہی کے دفتر میں اس خیال سے جا کر لکھا کرتا تھا کہ کوئی بات مالک کمپنی سے پوچھنے کی ہو تو وہیں کے وہیں تبادلۂ خیال کرلوں ۔ وہاں میرے کمرے کے برابر کے کمرے میں شوکت بیٹھتے تھے وہ اپنے کام سے اکتاتے تو میرے کمرے میں آجاتے ۔ کسی شگفتہ طبع ادیب سے گفتگو کرکے جس قسم کی فرحت ملتی ہے وہ تو ان ملاقاتوں سے ضرور حاصل ہوتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ہم نہ ایک دوسرے سے زیادہ قریب

ہو سکے اور نہ ان کے کمالات مجھ پر کھل سکے - میرے فلمی ڈرامے کے لئے گانے لکھنے کا سوال پیدا ہوا تو یہ کام شوکت صاحب کے سپرد کیا گیا - میں اور وہ گانوں کے مواقع اور انداز کے متعلق مل کر غور کیا کرتے - دو ایک گانے شوکت صاحب نے لکھ کر مجھے دئیے بھی جو میرے پرانے کاغذوں میں کہیں دبے پڑے ہوں گے - اسی زمانے میں ملک کے سیاسی حالات نے ایسی صورت اختیار کرلی کہ یہ فلم بنانا انیس سو سنتالیس کے ستمبر پر اٹھا رکھا گیا مگر تقسیم کے بعد پنچولی آرٹ پکچرز کا کاروبار بند ہوگیا اور اس فلم کے بننے کی نوبت نہ آئی -"[1]

شوکت تھانوی اس ملازمت سے فارغ ہو کر ریڈیو پاکستان لاہور کے اسٹاف میں شامل ہوگئے - یہاں ان کی ملاقات شنڈن صاحب سے ہوئی جو پہلے سے ہی ریڈیو میں ملازم تھے - ان کے خاندان کے تمام افراد ہندوستان جاچکے تھے - صرف وہ خود اور ان کی دادی یہاں رہتے تھے - ہنگاموں میں اضافہ ہوا تو انہیں خطرہ ہوا کہ ان کی کوٹھی کوئی جلا نہ دے اس لئے انہوں نے شوکت تھانوی سے گذارش کی کہ وہ ان کی کوٹھی میں منتقل ہوجائیں تاکہ یہ محفوظ ہو جائے - قصرِ راحت کے بعد شوکت تھانوی رسول سٹریٹ مسلم ٹاون کی کوٹھی میں مقیم تھے کہ شنڈن صاحب کی اس پیشکش پر انہیں کوٹھی نمبر 1 ، کینال پارک " شنڈن نواس" میں آنا پڑا -

تقسیم ملک کے بعد ظفر الاحسن لاہور کے ڈپٹی کمشنر تھے انہوں نے محسوس کیا کہ مہاجرین جس جذبہ کے تحت اپنا گھر بار چھوڑ کر اور طرح طرح کی مصیبتیں جھیل کر پاکستان پہنچ رہے ہیں اور پاکستان میں ان کا اس طرح سے خیر مقدم نہیں کیا جا رہا جس طرح کی انہوں نے امیدیں وابستہ کی تھیں - اس لئے ان کا جذبہ سرد پڑتا جا رہا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ

---

[1] سید امتیاز علی تاج : " شوکت تھانوی مطبوعہ نقوش لاہور ، شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ = 503 ، 504 -

ان کے جذبات کا خیال رکھا جائے اور ان کا " مورال " بلند کرنے کی کوشش کی جائے ۔ ظفر الاحسن نے تجویز پیش کی کہ اخبارات کے ذریعے یہ کام انجام دیا جائے لیکن سیّد امتیاز علی تاج نے مشورہ دیا کہ یہ کام ریڈیو پاکستان کے ذریعہ سر انجام دینے کی کوشش کی جائے ۔ ان کا یہ مشورہ قبول کرلیا گیا اور روزانہ نشر کے لئے ایک مرکب پروگرام کا منصوبہ تیار کیا گیا ۔ پروگرام کا نام " پاکستان ہمارا " تجویز ہوا ۔ شوکت تھانوی کو اس کام میں سیّد امتیاز علی تاج کی امداد کے لئے مقرّر کیا گیا ۔ اور کافی عرصہ تک یہ دونوں مل کر اسی پروگرام کو نشر کرتے رہے۔ سیّد امتیاز علی نے اپنے ایک مضمون میں شوکت تھانوی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے : " اسی زمانے میں ، میں نے شوکت کو " علّامہ " کہہ کر مخاطب کرنا شروع کردیا ۔ بات یہ تھی کہ آمنے سامنے بیٹھ کر لکھتے لکھتے جب کبھی مجھے کسی واقعے یا محاورے کے متعلق کچھ شبہ ہوتا تو میں سر اٹھاتا اور شوکت سے استفسار کرتا ۔ ان سے جو جواب ملتا ، کتاب اور لغت ہمیشہ اسی کی تصدیق کرتی ۔ خاص موقع تو اب مجھے یاد نہیں رہا لیکن اسی نوعیت کی کوئی اہم معلومات حاصل ہونے پر بے اختیار میرے منہ سے نکلا " یار آپ کو تو علّامہ کا لقب ملنا چاہئیے " بولے " لقب چونکہ مدح و ذم دونوں پر دلالت کرتا ہے اس لئے " علّامہ " کے لئے خصوصیت سے موزوں ہے " ۔ اس کے بعد میں نے انہیں علامہ کہہ کر مخاطب کرنا شروع کردیا ۔ چند روز وہ اس لقب سے بے چین سے رہے بعد میں اس کے عادی ہوگئے ۔ واقعہ یہ ہے کہ شوکت میں اِدّعا مطلق نہ تھا ۔ پہلی ملاقات میں وہ کسی طرح " ٹھوس " آدمی معلوم نہ ہوتے تھے۔ لیکن اگر ان سے کچھ پوچھا جاتا تو پتہ چلتا کہ ان کی معلومات غیر معمولی ہیں۔ "[1]

---

[1] سیّد امتیاز علی تاج : ماخوذ نقوش لاہور ، شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ = 505 ۔

اس پروگرام میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے اس میں ایک مزاحیہ کردار شامل کرنے کا مشورہ ہوا تو شوکت تھانوی نے ایک مزاحیہ کردار "قاضی جی" کے نام سے تخلیق کیا ۔ قاضی جی کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ پروگرام انیس سو سنتالیس عیسوی سے انیس سو تریسٹھ عیسوی تک مسلسل نشر ہوتا رہا ۔ ریڈیو اسٹیشن بدلتے رہے لیکن پروگرام نہیں بدلا ۔ شوکت تھانوی کراچی چلے گئے تو یہ پروگرام وہاں سے نشر ہونے لگا اور جب وہ راولپنڈی آگئے تو یہ پروگرام راولپنڈی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہونا شروع ہوگیا ۔ غرض ریڈیو پاکستان کی تاریخ میں اس پروگرام کو ایک طویل المیعاد پروگرام قرار دیا جاسکتا ہے ۔ "قاضی جی" کے سلسلہ کا آخری پروگرام 16 ، مارچ انیس سو تریسٹھ عیسوی کو ریڈیو پاکستان راولپنڈی میں ریکارڈ کروایا گیا ۔ اس روز بہت سے پروگرام اکٹھے ریکارڈ کرائے گئے تھے چونکہ شوکت تھانوی تمغۂ امتیاز حاصل کرنے کے لئے لاہور آرہے تھے ۔

شوکت تھانوی انیس سو اڑتیس عیسوی سے انیس سو تریسٹھ عیسوی تک ریڈیو سے وابستہ رہے ۔ اس دور میں انہوں نے بچوں کے لئے پروگرام لکھے ، عورتوں کے لئے پروگرام تحریر کئے ، ہزاروں ڈرامے لکھے ، تقاریر کیں ، صداکاری اور اداکاری کی ۔ ان سب حیثیتوں میں شوکت تھانوی نے اپنی صلاحیتوں کو منوایا ۔ وہ کئی طرح کی آوازیں بنانے پر قادر تھے ۔ انہوں نے ہزاروں فیچر لکھے اور ہر ایک میں شگفتگی برقرار رہی ۔ شوکت تھانوی نے نہ صرف ریڈیو پر اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے بلکہ ایک فلم " گلنار " میں نواب دلشاد کا پارٹ ادا کرکے لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ۔ انہوں نے نواب دلشاد کا کردار ایسے باکمال طریقہ سے پیش کیا ہے کہ انہیں دیکھ کر لکھنوی نوابوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے ۔

شوکت تھانوی میں شعری ذوق مولانا ارشد تھانوی نے پیدا کیا ۔ انہوں نے ابتداء میں شوکت تھانوی کی طرف سے نظمیں اور مضامین لکھ کر بچوں کے رسالوں میں چھپوائے ۔ شوکت تھانوی یہ نظمیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے ۔ بڑے ہوئے تو شعر کہنے کی باقاعدہ کوشش شروع کردی ۔ شوکت تھانوی کے بقول انہوں نے سات سال کی عمر میں جب بیماری کی وجہ سے انہیں کھانے کو بہت کم غذا ملتی تھی پہلا شعر کہا اور وہ شعر یہ ہے ــــ

نہ دانہ نہ پانی میں کس سے کہوں
ارے میرے اللہ میں اب کیا کروں [1]

شوکت تھانوی ابھی طالب علم ہی تھے کہ انہوں نے شعر کہنا شروع کردئیے تھے ۔ ایک مرتبہ ارشد تھانوی لکھنو تشریف لائے تو ماسٹر بخشش احمد نے انہیں شوکت تھانوی کی شاعرانہ صلاحیتوں کے بارے میں بتایا ارشد تھانوی نے امتحان لینے کے لئے ایک مصرع دیا ع

سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا

شوکت تھانوی نے اپنے مصرعہ پر اس مصرع کو لگا کر اس طرح شعر بنادیا ــــ

سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
غمناک سیاہی رات کی تھی اب اس کا اندھیرا دور ہوا

ارشد تھانوی نے یہ مطلع دیکھا تو بہت خوش ہوئے ۔ شوکت تھانوی بھی اس لئے خوش تھے کہ وہ امتحان میں کامیاب ہوگئے ۔

شوکت تھانوی مسلسل مشقِ سخن کرتے رہے ایک دن پوری غزل کہنے میں کامیاب ہوگئے ۔ دوستوں کو سنائی تو انہوں نے بہت تعریف کی ۔ اب ان

---

[1] شوکت تھانوی : " مابدولت " ادارہ فروغ اردو ، لاہور ، صفحہ = 21 ۔

کا دل چاہنے لگا کہ یہ غزل جلد از جلد کسی ادبی رسالہ میں چھپ جانی چاہئیے چنانچہ انہوں نے کئی رسالوں کو یہ غزل بھیج دی ۔ سب سے پہلے جس رسالہ کو ان کی غزل چھاپنے کا شرف حاصل ہوا اس کا نام " ترچھی نظر " ہے اور اس کے مدیر کا نام امین سلونوی ہے ۔ شوکت تھانوی کی پہلی غزل کے دو اشعار ؎

ہمیشہ غیر کی عزت تیری محفل میں ہوتی ہے
تیرے کوچہ میں ہم جا کر ذلیل و خوار ہوتے ہیں

اس غزل کا مقطع یہ ہے ۔

شفا پاتے ہوئے ان کو نہیں دیکھا کبھی شوکت
جو عشقِ مرضِ مہلک کے کبھی بیمار ہوتے ہیں [1]

شوکت تھانوی نے " مابدولت " میں یہ مقطع اس طرح لکھا ہے جبکہ اپنی دوسری کتاب "کچھ یادیں کچھ باتیں " میں یہ مقطع اس طرح ہے ۔

انہیں جانبر کبھی ہوتے ہوئے دیکھا نہیں شوکت
جو عشقِ مرضِ مہلک کے کبھی بیمار ہوتے ہیں [2]

ان دونوں مقطعوں کا موازنہ کیا جائے تو " مابدولت " والا مقطع زیادہ بہتر نظر آتا ہے ۔ یہ غزل "گہرستان " میں شامل نہیں ہے ۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی انیس سو اناسی عیسوی میں لکھنؤ گئے تو امین سلونوی سے ملاقات کی

---

[1] شوکت تھانوی : " مابدولت " ادارہ فروغ اردو ، لاہور ، بار چہارم صفحہ = 69 ۔

[2] شوکت تھانوی: " کچھ یادیں کچھ باتیں " ادارہ فروغ اردو ، لاہور 1964ء ، صفحہ = 10 ۔

اور راقم کے لئے ایک انٹرویو ریکارڈ کیا ۔ یہ انٹرویو یکم جون انیس سو اناسی عیسوی کو ریکارڈ کیا گیا ۔ راقم نے طاہر تونسوی کو کچھ سوال لکھ کر دئے تھے ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ ان دونوں مقطعوں میں سے کون سا مقطع آپ نے " ترچھی نظر " میں چھاپا تھا ۔ انہوں نے کہا کہ جہاں تک ان کا حافظہ کام کر رہا ہے " مابدولت " والا مقطع " ترچھی نظر " میں چھپا تھا ۔ " ترچھی نظر "کا یہ شمارہ امین سلونوی کے پاس سے بھی نہیں مل سکا ۔

امین سلونوی بھی شعر کہتے تھے ، شوکت تھانوی سے ملاقات ہوئی تو یہ شعر گوئی دوستی کا باعث بنی ۔ ایک دن امین سلونوی نے شوکت تھانوی کو اپنے استاد مولانا عبدالباری آسی کا ایک شعر سنایا جسے سن کر شوکت تھانوی بہت متاثر ہوئے اور امین سلونوی سے استدعا کی کہ ان کی ملاقات مولانا آسی سے کروائی جائے تاکہ وہ ان سے شرف تلمّذ حاصل کرسکیں ۔ امین سلونوی انہیں مولانا آسی کے یہاں لے گئے اور اس طرح شوکت تھانوی مولانا عبدالباری آسی کے باقاعدہ شاگرد ہوگئے ۔ مولانا آسی کے حکم پر " اناؤ " کے مشاعرہ میں سب سے پہلی غزل پڑھی ، غزل چونکہ محنت سے کہی گی تھی اس لئے اُس پر خوب داد ملی اور اب شوکت تھانوی لکھنؤ کے مشاعروں میں بھی غزلیں پڑھنے لگے ۔ ان کا مجموعۂ کلام " گہرستان " کے نام سے انیس سو چونتیس عیسوی میں منظر عام پر آیا جس میں ان کی بانوے غزلیں شامل ہیں ۔ انیس سو پینتیس عیسوی سے انیس سو تریسٹھ عیسوی تک نثر کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کی اور خاص طور سے ریڈیو کے لئے یا مشاعروں کے لئے جن میں انہیں شرکت کرنا ہوتی تھی وہ غزلیں کہا کرتے تھے ۔ اس دور کی بیاسی غزلیں راقم کے پاس محفوظ ہیں ۔ اس طرح شوکت تھانوی کی کل ایک سو چوہتر غزلوں کا ریکارڈ موجود ہے ۔

شوکت تھانوی نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم کو بھی اہمیت دی ۔ عمر کی آخری دہائی میں غزل کہنا کم کردی لیکن نظم کی طرف برابر توجہ دیتے رہے گھوستان ، غم غلط ، نقوش کے شوکت نمبر ماہنامہ کتاب لکھنؤ کے شوکت نمبر ، اردو کے چار مزاحیہ شاعر مرتّبہ احمد جمال پاشا ، ریڈیو پاکستان کے مشاعروں میں پڑھی جانے والی نظمیں ، اور روز نامہ "جنگ" راولپنڈی میں وقتاً فوقتاً شائع ہونےوالی نظموں کی کل تعداد پینسٹھ ہے ۔ شوکت تھانوی نے اپنی بیشتر نظموں میں طنز و مزاح سے کام لیا ہے ۔ وہ طنز کے نشتروں سے معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں ۔

شوکت تھانوی نے اپنے عہد کے تمام قابلِ ذکر رجحانات کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ہے ۔ انہوں نے سیاسی ، معاشرتی اور اخلاقی موضوعات پر بہت سی نظمیں ، رباعیاں اور قطعات کہے ہیں جو ان کی ذاتی زندگی کے علاوہ ان کے عہد کی ترجمانی کرتی ہیں ۔ ان خصوصیات کی بناء پر شوکت تھانوی کو اردو شاعری میں ایک بلند مقام دیا جاسکتا ہے ۔

دوسری شادی :۔

شوکت تھانوی نے مارچ انیس سو انچاس عیسوی میں زہرہ بیگم بنت شیخ نبی بخش سے عقدِ ثانی کیا ۔ زہرہ بیگم لاہور میں انیس سو انتیس عیسوی میں پیدا ہوئیں ۔ ان کی عمر ابھی صرف تیرہ برس کی تھی کہ والد کا انتقال ہوگیا ۔ والدہ نے پرورش کی ۔ ان کے دو بھائی ہیں ، شیخ ظفریاب علی اور شیخ ناصر علی ۔ ایک بہن جن کا نام عطیہ بیگم تھا لیکن شوکت تھانوی نے زہرہ کی مناسبت سے ان کا نام مشتری بیگم رکھ دیا ۔ ان کی شادی چوہدری محمد شریف سے ہوئی ۔

زہرہ بیگم نے ابتدائی تعلیم لیڈی میکلیگن سکول سے حاصل کی ۔ میٹرک تک باقاعدہ تعلیم حاصل کی لیکن میٹرک کا امتحان پرائیویٹ طالبہ کی حیثیت سے دیا ۔ اس کے بعد انٹر میڈیٹ کی تیاری شروع کی کہ اسی اثناء میں شادی ہوگئی ۔

زہرہ بیگم نے راقم سے ایک ملاقات میں بتایا کہ وہ بہت عرصے سے شوکت تھانوی کی کتابیں پڑھ رہی تھیں اور ان کی تحریروں کو بہت پسند کرتی تھیں ۔ وہ ایک مرتبہ وحیدہ روشن ، ہیڈ مسٹرس ، سردار گرلز ہائی اسکول کے ساتھ ریڈیو اسٹیشن دیکھنے گئیں تو ان کی ملاقات شوکت تھانوی سے ہوئی ۔ یہ ان کی پہلی ملاقات تھی ۔ وحیدہ روشن کا ریڈیو اسٹیشن مسلسل آنا جانا تھا چنانچہ شوکت تھانوی نے اگلی ملاقات میں زہرہ بیگم کے بارے میں بہت سے سوالات کرکے معلومات حاصل کیں اور کچھ عرصہ کے بعد شادی کے بارے میں اپنی سنجیدگی کا ذکر کیا ۔ وحیدہ روشن نے اس خیال سے کہ شوکت تھانوی کے پہلے سے ایک بیوی اور تین بیٹے موجود ہیں ، اس بات کو ٹالنے کی کوشش کی لیکن شوکت تھانوی کا اصرار مسلسل بڑھتا چلا گیا ۔ تو وحیدہ روشن نے زہرہ بیگم کی والدہ سے تذکرہ کیا انہوں نے پہلے تو صاف انکار کردیا لیکن وحیدہ روشن نے جب معاملہ کی سنجیدگی کا انہیں احساس دلایا تو وہ چند شرائط کے تحت شادی کرنے پر راضی ہوگئیں ۔ شوکت تھانوی نے یہ تمام شرائط منظور کرلیں اور ایک کاغذ پر بہ طور کوائف اور شرائط انہیں جو کچھ لکھ کر دیا وہ یہ ہے :

(1) میرا نام محمد عمر ہے ۔ لوگ مجھے شوکت تھانوی کے نام سے جانتے ہیں ۔

(2) میرے والد مرحوم کا نام صدیق احمد صاحب تھا ۔ جو یو ۔ پی ۔ پولیس میں انسپکٹر اور بھوپال میں انسپکٹر جنرل پولیس تھے ۔

(3) میں شیخ فاروقی ہوں ، حنفی ہوں ، میری عمر پینتیس سال ہے ۔

(4) تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کا رہنے والا ہوں ۔

(5) میری تعلیم انٹر میڈیٹ تک ہوئی اور بعد میں انٹر میڈیٹ کا ممتحن بھی رہ چکا ہوں ۔

(6) میری تنخواہ اس وقت ساڑھے چار سو روپے ماہوار ہے ۔

(7) میرا خاص مشغلہ کتابوں کی تصنیف ہے ۔ جس سے اوسطاً دو سو روپے ماہوار آمدنی ہے ۔ اس وقت تک پنتالیس کتابوں کا مصنّف ہوچکا ہوں ۔

(8) میں اب تک چھ روزانہ اخباروں کا چار ماہناموں کا ایڈیٹر رہ چکا ہوں ۔

(9) عقد ثانی کی ضرورت اس لئے ہے کہ میں اپنی زندگی کا سکون چاہتا ہوں ۔ بیوی سے میرے تعلقات کشیدہ ہیں ۔ میں نے بے حد اصلاح کی کوشش کی مگر بیوی اپنی دماغی افتاد اور مزاجی کیفیت سے مجبور ہیں ۔

(10) مجھے اس عقد کے سلسلہ میں تمام شرائط منظور ہوں گی اور میں مہر وغیرہ کے لئے ہر قسم کی لکھا پڑھی کے لئے تیار ہوں ۔

(11) رہائش کا انتظام الگ کروں گا ۔ میری زوجہ ثانیہ کو پہلی بیوی سے کوئی تعلق کسی قسم کا نہ ہوگا ۔

یہ شرائط نامہ زہرہ شوکت کے پاس ابھی تک محفوظ ہے ۔ راقم نے اسے دیکھا اور اس کی فوٹو سٹیٹ کاپی اپنے پاس محفوظ کرلی ہے ۔

اس کوائف نامے میں شوکت تھانوی نے اپنی عمر صرف پنتیس سال لکھی ہے جبکہ انیس سو انچاس عیسوی میں ان کی عمر چوالیس سال بنتی تھی ۔ نیز انہوں نے اپنی تعلیمی قابلیت انٹرمیڈیٹ بتائی ہے جبکہ ریکارڈ کے مطابق انہوں نے میٹرک کا امتحان بھی پاس نہیں کیا تھا ۔ انٹر میڈیٹ کا ممتحن رہنے والی بات ممکن ہوسکتی ہے چونکہ اردو زبان و ادب پر انہیں دسترس حاصل تھی اس لئے انٹر میڈیٹ میں وہ اردو کے ممتحن بننے کی اہلیت رکھتے تھے ۔

زہرہ شوکت نے راقم کو ایک ملاقات میں بتایا کہ ان کی نکاح کی تقریب آٹھ فروری انیس سو انچاس عیسوی کو 6 - برنی اسٹریٹ ، گڑھی شاہو میں ہوئی۔ بیس ہزار روپے مہر رکھا گیا اور رخصتی چار مارچ انیس سو انچاس عیسوی کو ہوئی - رخصت ہو کر شوکت تھانوی کے دوست حکیم جعفری صاحب کے یہاں منٹگمری روڈ پر گئی تھیں تقریباً ڈیڑھ مہینے تک شوکت تھانوی کے ساتھ وہیں رہیں پھر 6 - برنی اسٹریٹ ، گڑھی شاہو میں آ گئیں - اس کے بعد ایک اور گھر گڑھی شاہو میں کرایہ پر لیا لیکن وہ زیادہ اچھا نہ تھا اس لئے اسے چھوڑ دیا پھر گڑھی شاہو ہی میں ڈاکٹر ایثار کے کلینک کے سامنے ایک بلڈنگ کرایہ پر لی -

تیسری شادی کے بارے میں اختلاف رائے :-

ریڈیو اور ٹی وی کی ممتاز فن‌کارہ عرشِ منیر کا کہنا یہ ہے کہ وہ شوکت تھانوی کی بیوی ہیں[1] - لیکن شوکت تھانوی کی دوسری بیگمات اور ان کے بعض قریبی دوستوں کو اس میں کچھ شبہ ہے - راقم اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے تیئس فروری انیس سو اناسی عیسوی بروز جمعرات بوقت گیارہ بجے عرشِ منیر کے پاس فلیٹ نمبر 43 - ایف ، 5/8 ، فیڈرل کیپٹل ایریا کراچی گیا - ان کی گفتگو میرے پاس دو کیسٹوں میں محفوظ ہے - شوکت تھانوی کی پہلی بیگم سعیدہ شوکت نے ہمیں شوکت تھانوی کی انیس سو چھیالیس عیسوی کی ایک تحریر دکھائی جس کا متن یہ ہے - " میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر بقائمی ہوش و حواس لکھتا ہوں کہ میں نے مسماۃ عرشِ منیر سے نکاح نہیں کیا ہے اور نہ

---

[1] عرش منیر کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں ، بیٹوں کے نام ہیں ارشد عمر ، راشد عمر اور ارشاد عمر -

میرے مسماۃ مذکور سے کسی قسم کے تعلقات نہیں ۔ اگر اس کی طوف سے یا کسی اور طوف سے میرے اور اس کے نکاح کی خبو مشتہر کی جائے تو وہ قطعاً غلط اور ناقابل اعتبار ہے ۔

فقط

شوکت تھانوی بقلم خود

المرقوم یکم فروری ، انیس سو چھیالیس عیسوی "[1]

وہی وہانوی :-

بہت عوصہ تک یہ معمہ حل نہ ہوسکا کہ "وہی وہانوی " کے قلمی نام سے کون لکھتا ہے لیکن اب یہ بات منظر عام پر آچکی ہے کہ اس نام سے شوکت تھانوی نے لکھنا شروع کیا ۔ " سرپنچ " کے صفحات اس بات کی گواہی دیں گے ۔ جہاں غالب کے اشعار کی پیروڈی "وہی وہانوی " کے نام سے کی گئی " سرپنچ " کے ایک شمارہ میں "غالب اور وہی " کے عنوان کے تحت ایک غزل چھپی ۔ جس میں ہر شعو کا ایک مصوعہ موزا غالب کا ہے اور ایک مصوعہ وہی وہانوی کا ہے ۔ اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت جو وصالِ یار ہوتا ۔ شب وعدہ آ بھی جاتی تو ہمیں بخار ہوتا
تجھے ہم ازل سے جھوٹا ہی جان جاتے تھے ۔ کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح ۔ اور اگر بنا تھا ناصح تو وہ تھانیدار ہوتا
یہ شرر جو آجکل ہے یہی غم کی شکل پاتا ۔ جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا
اگر آگہی تھی شامت تو نجات کیسے ملتی ۔ غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم وہی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا [2]

---

[1] اس اہم دستاویز کا عکس راقم کے پاس محفوظ ہے ۔

[2] ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ = 280 ، 281 ۔

احمد جمال پاشا نے اپنے ایک مضمون میں وہی وہانوی کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے : " اسی ہنسی ، دل لگی بازی اور سنسنی خیزی کے بنیادی جذبہ نے سرپنچ کے صفحات پر وہی وہانوی کے رسوائے زمانہ کردار کو جنم دیا ۔ شروع میں شوکت تھانوی کے وہی وہانوی غالب پر مصرعے لگاتے اور تک بندی کرتے تھے ؎

تقدیر کا لکھا وہی کچھ بھی نہ پڑھ سکے
گویا کہ جو لکھا ہے بخطِ شکست ہے
محبت میں کیا جانے کیا کو رہے ہیں
نہ وہ دیکھتے ہیں نہ ہم دیکھتے ہیں
مئے گلرنگ ابھی انگور کی دوشیزہ بیٹی ہے
اڑا لے جو کوئی انگور کا داماد ہوجائے

اس کے بعد وہی وہانوی کا چلن بگڑا "تگڈّم" ، بھنور " اور "گناہ " کی " دلدل " میں ایسے پھنسے کہ الامان الحفیظ " [1]

احمد جمال پاشا کے اس اقتباس سے شوکت تھانوی کے ان تین ناولوں کے نام ہمارے سامنے آئے ہیں جو انہوں نے "وہی وہانوی " کے نام سے لکھے اور یہ تین ناول "تگڈّم " ، بھنور " ، اور "گناہ " کی دلدل " ہیں ۔ نادم سیتاپوری نے ایک مضمون میں وہی وہانوی کے کردار کی وضاحت اس انداز سے کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں: " وہی وہانوی کے نام سے کم ہی لوگ نا آشنا ہوں گے ۔ اس فرضی نام سے آج سینکڑوں فحش اور گندے ناول چوری چھپا فروخت ہو رہے ہیں ۔ حکومت ہند و پاک نے اس قسم کے اخلاق سوز لٹریچر

---

[1] ماخوذ : نقوش شوکت نمبر 1963 ء ، صفحہ = 592 ۔

کو ممنوع قرار دیا ، درجنوں کتب فروشوں کے یہاں چھاپے پڑے ، مقدمات چلے ، سزائیں ہوئیں مگر شاید اب تک یہ پتہ نہیں لگ سکا کہ یہ " وہی وہانوی " ہیں کون صاحب ! اور پتہ چلتا بھی تو کیسے ؟ اس قسم کا گندہ لٹریچر کسی ایک دماغ تک محدود نہیں ہے جس کا جی چاہا " وہی وہانوی " بن گیا ــــ لیکن شاید یہ کم ہی لوگوں کو معلوم ہوگا کہ " وہی وہانوی " کا فرضی نام دراصل شوکت کی جودتِ فکر کا نتیجہ ہے ۔ یہی نہیں ! اسی سلسلے میں شوکت نے فی البدیہہ ایک شعر بھی کہا تھا :

ہم آپ کے " وہی " ہیں ہمیں جان جائیے
پہچان پر ہے ناز تو پہچان جائیے

ہوا یہ ــــ !

نسیم انہونوی نے جب جنسیاتی افسانوں اور ناولوں کی اشاعت کا دھندہ شروع کیا تو نسیم بک ڈپو کے لئے " شرمناک افسانے " بھنور اور دلدل قسم کی کئی کتابیں لکھوائیں جو جنسیاتی ہونے کے باوجود اتنی گندی ، فحش اور اخلاق سوز تھیں جیسی آج کل " وہی وہانوی " کے نام سے شائع کی جارہی ہیں پھر بھی ہندوستانی ماحول اور اردو زبان کے لئے یہ نیا تجربہ ضرور تھا اسی لئے اس کے لکھنے والوں نے اپنا نام شائع کرنے کی اجازت نہیں دی ۔ چنانچہ یہ مسئلہ جب شوکت کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے ان فرضی مصنفین پر " وہی وہانوی " کا نقاب ڈال دینے کا مشورہ دیا اور یہ فرضی نام کچھ ایسا مقبول ہوا کہ درجنوں " وہی وہانوی " پیدا ہوگئے ۔ " [1]

---

[1] نادم سیتاپوری : ماخوذ نقوش شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ = 533 ۔

نادم سیتاپوری نے یہ مسئلہ تقریباً حل کر دیا ہے ۔ ہم نے شوکت تھانوی کے بہت سے دوستوں سے اس اہم مسئلہ پر بات کی تو انہوں نے بڑی حد تک نادم سیتاپوری کی اس بات سے اتفاق کیا کہ یہ ناول کسی ایک شخص نے تحریر نہیں کئے بلکہ دوستوں کا ایک پورا گروپ یہ ناول لکھ رہا تھا ۔ ان میں پیش پیش رفیع احمد خاں تھے جن کا تعارف جناب جوش ملیح آبادی نے اپنی کتاب " یادوں کی برات " میں اس طرح کروایا ہے :- " میرے آبائے اولین کے ، چند روزہ وطن فرخ آباد کے پٹھان ، تمام دنیا کے فحش نگاروں کے سلطان ، علی گڑھ کے گولڈ میڈلسٹ ایم ۔ اے ۔ متعدد کالجوں کے پروفیسر ، آخری دور میں لکھنؤ کواپریٹو سوسائٹی کے سیکرٹری ۔ متوسط القامت ، شگفتہ پیشانی ، تاش استاد ، سدا بشاش ، چوک رسیا ، پدر معتوب ، شہو محبوب ، جوانی میں امرد پرستار ، زوال جوانی میں طوائف گرفتار ، مرنجان مرنج قسم کے دل موہ لینے والے انسان تھے ۔ "[1]

جوش صاحب نے رفیع احمد خاں کو تمام دنیا کے فحش نگاروں کا سلطان قرار دیا ہے ان کی ہزلیہ شاعری کے چند نادر نمونے راقم نے ڈاکٹر سیّد صفدر حسین مرحوم کے ذخیرۂ کتب میں دیکھے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کبھی کبھی اپنی خاص نشستوں میں ان کا کلام ایک خاص انداز سے سنایا کرتے تھے ۔ شوکت تھانوی ، نسیم انہونوی ، خان محبوب طرزی اور جوش ملیح آبادی ، رفیع احمد خاں کی محفل کے خاص رکن ہوتے تھے ۔ جناب جوش ملیح آبادی نے اپنے ان دوستوں کی سرگرمیوں پر " یادوں کی برات " میں بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ۔ شام کے تفریحی پروگرام کے بارے میں وہ لکھتے ہیں :

---

[1] جوش ملیح آبادی : " یادوں کی برات " ، صفحہ = 454 ۔

" یہ وہ زمانہ تھا جب ہم لوگ یوسف مرزا ، ابرار اور شوکت تھانوی کو ہم راہ لے کر شام ہوتے ہی لکھنو کی خاص خاص جوانی مدار ، پر اسرار و شمو دار گلیوں میں ، بسلسلہ " تلاش معاش " گھوما کرتے تھے اور دن کے وقت ہمارے جاں نثار کارندے ، اس بات کی شوہ لینے نکل جایا کرتے تھے کہ کن کن بوڑھوں نے دوسری یا تیسری رچائی ہے ۔ ہم ان بوڑھوں کی فہرست تیار کر کے مختلف ذرائع اور مختلف و مشترک احباب کی وساطت سے ، ان بوڑھوں کے پاس جاتے ، ان پر اپنی پارسائی و دین داری کے سکے بٹھاتے تھے ۔ ان کی نظروں میں سماتے ان سے پینگ بڑھاتے ، اور اس طرح آخر کار ، ان کی بے آب و گیاہ دلہنوں تک آتے جاتے تھے ۔ "[1]

جوش ملیح آبادی کے اس اقتباس سے لکھنُو کے ماحول اور شوکت تھانوی کے شب و روز کا پتہ چلتا ہے ۔ ایسے ماحول میں بہت سے ذہین لوگوں کا اکٹھے ہونا اور ان میں سے ہر شخص کا باکمال ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لوگ لیکر کے فقیر ہوکر ادب تخلیق نہیں کرسکتے تھے ۔ چنانچہ انہوں نے ادب میں جنسیت کو شامل کر کے ایک نیا تجربہ کیا ۔ ان کا یہ تجربہ ان کی امیدوں سے کہیں زیادہ کامیاب رہا ۔ عام کتابوں کی نسبت یہ کتابیں دس گنا زیادہ فروخت ہوتی تھیں ۔

روز نامہ " طوفان " لکھنو کے گیارہ مئی انیس سو اڑتیس عیسوی کی اشاعت میں " شرمناک افسانے " کا ایک اشتہار شائع ہوا ہے جسے آپ بھی ملاحظہ کیجئے : " شرمناک افسانے ـــــ کا نوجوانی شباب کی دیوانی امنگوں کے ہاتھوں بہک کر تباہ ہوجانے والی آٹھ شریف خاندان ، مہذب ، تعلیم یافتہ

---

[1] جوش ملیح آباد : " یادوں کی برات " صفحہ = 454 ، 455 ۔

اور حسین کنواریوں کے افسانے انہیں کے الفاظ میں یکجا کئے گئے ہیں جو " شرمناک افسانے " کے نام سے " حضرت وہی وہانوی " کی رنگینیٔ قلم اور شباب خیز اندازِ بیان کی آئینہ دار ہیں ۔ اس کتاب کو عورتیں اور طالب علم نہ پڑھیں ۔ باقی حضرات فوراً آرڈر دیں ۔ قیمت مجلد ایک روپیہ ۔محصول ڈاک بذمہ خریدار ، کتابوں کے منگانے کا پتہ

مینجر شوکت بک ڈپو ، لاٹوش روڈ ، لکھنؤ "[1]

" شرمناک افسانے " کا ایک اور اشتہار شوکت تھانوی کی کتابوں کے ساتھ دیکھئیے ۔ یہ اشتہار چودہ جون انیس سو اڑتیس عیسوی کے " طوفان" لکھنؤ میں شائع ہوا ۔

" اخبار سرپنچ کے چندہ میں رعایت

حضرت شوکت تھانوی کی ادارت میں شائع ہونے والے ہر دلعزیز مزاحیہ اخبار " سرپنچ" کی خریداری کا نادر موقع

تین روپے آٹھ آنے کے بجائے صرف ایک روپیہ اس طرح کہ آپ اسی وقت تین روپے آٹھ آنے چندہ اخبار سرپنچ برائے ایک سال اور آٹھ آنے محصول پارسل کتب ذریعہ منی آرڈر روانہ فرماویں ۔ منی آرڈر وصول ہوتے ہی دو روپے آٹھ آنے قیمت کی کتب آپ کی خدمت میں ذریعہ پارسل روانہ کردی جاویں گی اور ایک سال تک اخبار سرپنچ آپ کی خدمت میں برابر جاری رہے گا ۔ کتابوں کے نام ہر دو جانب درج ہیں ان میں سے منتخب کیجئے یہ رعایت صرف بیس جون انیس سو اڑتیس عیسوی تک رہے گی اور منی آرڈر وصول ہونے کی صورت میں رہے گی ۔ وی ۔ پی طلب کرنے حضرت اس رعایت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے ۔

---

[1] ماخوذ از روز نامہ " طوفان " لکھنو ، 11 ، مئی 1938ء ، صفحہ=6

مینجر سرپنچ جرنلس ، لاٹوش روڈ ، لکھنُو " [1]

اس اشتہار کے ایک طرف یعنی دائیں طرف جن کتابوں کے نام لکھے ہوئے ہیں ان میں دل پھینگ ، بڑبھس ، خانم خاں ، سوتیاہ چاہ اور سودیشی ریل شامل ہیں جبکہ بائیں جانب شرمناک افسانے ، سیہ کاریاں ، شہزادی شب نور ، رنگین جوانی اورایکٹرسوں کی آپ بیتیاں شامل ہیں ۔

11 ، مئی انیس سو اڑتیس عیسوی کے اشتہار اور 14 ، جون انیس سو اڑتیس کے اشتہار کو دیکھنے سے یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ " شرمناک افسانے " جسے پہلے اشتہار میں وہی وہانوی کی تصنیف قرار دیا اور دوسرے اشتہار میں شوکت تھانوی کی کتابوں کے ساتھ اس کا اشتہار دیا گیا ، یقیناً " وہی وہانوی " اور شوکت تھانوی کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے ۔

ہم نے اسی تعلق کو مد نظر رکھتے ہوئے شوکت تھانوی کے دوستوں سے اس اہم موضوع پر گفتگو کی ۔ کچھ دوستوں نے فرمایا کہ اس ذکر سے شوکت تھانوی کی روح کو اذیت پہنچے گی ۔ لیکن بیشتر دوستوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ پہلے پہل " وہی وہانوی " کے نام سے شوکت تھانوی نے لکھنا شروع کیا اور یہ قلمی نام انہیں کی جدت طبع کا شاہکار ہے ۔: " امین سلونوی صاحب نے اپنی گفتگو کے دوران بتایا "جی ہاں ۔ وہی وہانوی کے نام سے شوکت تھانوی ہی لکھتے تھے ۔ حالانکہ بات صاف ہوگئی تھی کہ یہی وہی وہانوی ہیں لیکن پھر بھی وہ اپنا نام بدل کر لکھتے رہے ۔ اس دور میں سب لوگ ہی دوسرے ناموں سے لکھا کرتے تھے ۔ چار پانچ آدمی پورے رسالہ کا مواد لکھا کرتے تھے ۔

---

[1] ماخوذ روزنامہ " طوفان " لکھنو ، 14 ، جون 1938ء ، صفحہ 6 ۔

ہم نے بھی نعیمہ کے نام سے لکھا ۔ یہ سب چیزیں فحاشی کے زمرے میں آتی ہیں ہم چاہتے ہیں کہ ان کی روح کو اذیت نہ پہنچے اس لئے اس بات کو آگے نہ بڑھایا جائے ۔ "

عمر انصاری نے اپنی آٹھ جون انیس سو اناسی عیسوی کی گفتگو میں ڈاکٹر طاہر تونسوی سے کہا : " " سرپنچ " میں " وہی وہانوی " کا کالم شوکت تھانوی کے لئے مخصوص تھا ۔ کبھی کبھی یہ کالم امین سلونوی نسیم انہونوی ، اور محبوب طوزی بھی لکھا کرتے تھے ۔ اس کالم میں پیروڈی کا انداز اختیار کیا گیا اور اس کے بعد اس فرضی نام سے کتابیں شائع ہونے لگیں ۔ اس کی ضرورت اس طریقے پر پڑی کہ ایک منزل میں صحافی دوسروں کے ناموں سے لکھتے ہیں ، وہ اس منزل سے گذر گئے تھے کہ میں اپنے نام سے لکھوں اور مجھے شہرت ملے ، اس لئے جب ادیب اس منزل سے گذر جاتا ہے تو وہ دوسروں کے ناموں سے بھی لکھتا ہے ۔ فحش چیزوں کو وہ اپنے نام سے نہیں لکھنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے ایک جعلی نام سے لکھدیا ادب کو کس طرح فروخت کیا جاتا ہے اس کا شعور شوکت صاحب کے یہاں تھا ۔ وہ صرف نام ہی کے لئے نہیں بلکہ معاش کے لئے بھی کام کرتے تھے ۔ "

سیّد انصار ناصری نے اپنی گفتگو کے دوران بتایا :

" جی ہاں ۔ یہ شوکت تھانوی کی کتابیں ہیں ۔ وہ کمرشل رائیٹر بن گئے تھے اس لئے مختلف کرتب کیا کرتے تھے ۔ اس نام سے انہوں نے چند کتابیں لکھی ہیں پھر پبلشرز سے ناراضگی ہوگئی تو یہ کتابیں لکھنا بند کردیں ۔ ان کے پبلشر صدیق صاحب تھے ۔ سب انہیں منشی صدیق کہتے تھے ۔ صدیق بک ڈپو سے یہ کتابیں شائع ہوتی تھیں ۔ وہ بہت لالچی اور خود غرض آدمی تھے ۔ "

شوکت تھانوی کے لکھنو کے دوستوں کی اس گفتگو روز نامہ " طوفان " میں چھپنے والے اشتہارات اور چند مضامین سے اقتباسات؛ ان سب چیزوں کی روشنی میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہی وہانوی کے نام سے سب سے پہلے شوکت تھانوی نے سرپنچ میں ایک کالم لکھنا شروع کیا ۔ اس نام سے پھر پیروڈی لکھی ۔ چار کتابیں شرمناک افسانے ، بھنور ، گناہ کی دلدل اور تگڈم لکھیں ۔ اس کے بعد پبلشرز سے جھگڑا ہوگیا جس کی وجہ سے اس پبلشرز نے اس قسم کی کتابوں کے لئے دوسرے ادیبوں کی خدمات سے استفادہ کیا ۔

کراچی اور راولپنڈی میں ملازمت :-

جولائی انیس سو ستاون میں شوکت تھانوی کو پی ۔ آئی ۔ اے نے ایک پروپیگنڈہ مہم پر لندن بھیجا وہاں انہوں نے چند دن قیام کیا ۔ واپس آئے تو روز نامہ " جنگ " کراچی میں ملازمت اختیار کرلی ۔ اس ملازمت کا آغاز پندرہ اگست انیس سو ستاون عیسوی سے ہوا ۔ یہاں سے فکاہیہ کالم "وغیرہ وغیرہ" کے نام سے شروع کیا ۔ صرف دو سال کراچی رہے ۔ جب دارالخلافہ کراچی سے راولپنڈی منتقل ہوا تو ان کو " جنگ " کے ایڈیٹوریل اسٹاف کا انچارج بنا کر راولپنڈی بھیج دیا گیا ۔ راولپنڈی سے روزنامہ " جنگ " کا پہلا شمارہ تیرہ نومبر انیس سو انسٹھ عیسوی کو شائع ہوا ۔ روز نامہ " جنگ " راولپنڈی کے ریکارڈ کے مطابق اس وقت ان کی تنخواہ یہ تھی ۔

تنخواہ = 830 روپے

انکم ٹیکس = 27 روپے

اخبار سے قرض لیا ہوا تھا اس کی قسط ہر مہینہ کٹ جاتی تھی ۔

= 50 روپے

کل = ۔/753 روپے انہیں ملا کرتے تھے ۔

شوکت تھانوی کی یہ ملازمت ان کے انتقال تک جاری رہی ۔ اپریل انیس سو تریسٹھ عیسوی کی انہوں نے روز نامہ "جنگ" سے آخری تنخواہ وصول کی ہے اس وقت ان کی تنخواہ روز نامہ "جنگ" کے ریکارڈ کے مطابق یہ تھی ۔

بنیادی تنخواہ	=	720/- روپے
مہنگائی الاؤنس	=	85/- روپے
کنوینس الاؤنس	=	25/- روپے
دوسرے الاؤنسز	=	130/- روپے
کل	=	960/- روپے

روز نامہ "جنگ" راولپنڈی میں شوکت تھانوی نے بہت ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض سر انجام دئیے ۔ عام طور پر شاعروں اور ادیبوں کو انتظامی عہدوں پر نہیں لگایا جاتا ۔ چونکہ ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بہتر منتظم ثابت نہیں ہوسکتے لیکن شوکت تھانوی نے اپنے آپ کو یہاں ایک منتظم ثابت کیا ۔ وہ صبح دس بجے دفتر آجایا کرتے اور رات کو کافی دیر سے واپس گھر جاتے تھے ۔ انہیں اپنی ذمہ داریوں کا مکمل طور پر احساس تھا جس کا اظہار تیرہ نومبر انیس سو انسٹھ عیسوی کے کالم "پہاڑ تلے" کے آخری پیرے میں بھی کیا گیا ہے ۔

" صاحب سچی بات تو یہ ہے کہ ایک پہاڑ خود ہمارے چہرے سے برستا ہوا بھی لوگ دیکھ رہے ہوں گے وہ ہے ذمہ داریوں کا پہاڑ ۔ راولپنڈی سے جنگ کے اجراء نے جن ذمہ داریوں میں ہم کو مبتلا کردیا ہے وہ اتنی شدید ہیں کہ ان کے مقابلے میں نہ سردی کی شدت محسوس ہوتی ہے نہ مکانوں کی قلت نہ احباب کی فرقت کا احساس ہے نہ کسی راحت کے فقدان کا ہوش ۔ فکر ہے

تو صرف یہ کہ راولپنڈی کا "جنگ" اپنے روایتی معیار اور ان توقعات کا حامل ہو جو ادارہ "جنگ" سے وابستہ ہوسکتی ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اس مقصد میں کامیاب کردے تو ہم بھی اِدھر اُدھر کی باتوں پر غور کریں گے ۔ اپنے آپ کو سردی لگائیں گے ، مکان کے بجائے محل ڈھونڈیں گے ۔ ارزانی اور گرانی کے فرق کو محسوس کریں گے ہم سخن احباب کو ڈھونڈیں گے اور راولپنڈی میں سمندر نہ ہونے کا شکوہ کریں گے ۔ خدا وہ دن تو کرے ۔" [1]

بیماری :-

انیس سو تریسٹھ عیسوی کے آغاز سے ہی شوکت تھانوی کی علالت کا سلسلہ شروع ہوا ۔ انہیں اکثر کھانسی اور بخار کی شکایت رہتی تھی ۔ راولپنڈی میں ڈاکٹر یوسف کے زیر علاج رہتے تھے ۔ (ڈاکٹر صاحب موصوف کا کلینک ان دنوں مین بازار صدر راولپنڈی میں ہے) دن بدن بخار کی شدت بڑھتی چلی گئی لیکن شوکت تھانوی اپنے گھر والوں سے اپنی بیماری چھپاتے رہے ۔ اس بات کا اظہار انہوں نے اپنے منجھلے بیٹے خورشید عمر سے اٹھارہ مارچ انیس سو تریسٹھ عیسوی کے ایک خط میں کیا ہے : " میاں کاش میں تم کو لکھ سکتا کہ میں صحت کے سلسلہ میں کن حالات سے گذر رہا ہوں ۔ صحت بگڑتے بگڑتے اس حالت پر آپہنچی ہے کہ اب پندرہ دن سے بالکل صاحب فراش ہوں ۔ بخار تو نہ جانے کب سے شام کو ہوجایا کرتا تھا اور اندر ہی اندر مجھ کو گھلا رہا تھا مگر میں نے اس کی پروا نہ کی ۔ لاہور کے مشاعرے میں گیا تو بابا اور رشید صاحب کو خود دکھا دیا تھا کہ لو دیکھ لو بخار اس

---

[1] ماخوذ از روزنامہ جنگ راولپنڈی ، 13 ، نومبر 1959ء ۔

وقت بھی ہے ۔ بہر حال اس بخار کے بعد کھانسی اور کھانسی کے بعد بلغم کے معائنے اور نہ جانے کیا کیا شروع ہوا اور مجھ کو بالکل لِٹا دیا گیا ۔ مجھ سے اب تک کہا تو یہی جا رہا ہے کہ کوئی خاص بات نہیں ، کوئی خطرناک بات نہیں مگر بہت سی باتیں میں خود اپنے عزیزوں اور بچوں سے چھپا رہا ہوں کہ سب کو خواہ مخواہ پریشان کیوں کروں ۔" [1]

بائیس مارچ انیس سو تریسٹھ عیسوی کی رات کو تمغۂ امتیاز حاصل کرنے کی غرض سے شوکت تھانوی لاہور تشریف لائے ان کے ساتھ ان کی بیگم زہرہ شوکت اور تینوں بیٹیاں بھی تھیں ۔ شوکت تھانوی اس مرتبہ لاہور اس نیت سے آئے تھے کہ اپنا مکمل علاج کروا کر واپس جائیں گے ۔

تیئیس مارچ انیس سو تریسٹھ عیسوی کو گورنر ہاوس میں تمغۂ امتیاز لینے گئے اس وقت بھی ان کی طبیعت ناساز تھی اور ان کا ٹمپریچر 101 تھا ۔ گورنمنٹ ہاؤس میں ان کی ملاقات کمشنر نیاز احمد سے ہوگی وہ شوکت تھانوی کی حالت دیکھ کر سخت حیران ہوئے اور اگلے روز انہیں اپنے یہاں آنے کو کہا تاکہ ڈاکٹر صالح میمن کو دکھایا جا سکے ۔ ڈاکٹر صالح میمن کا شمار اس وقت پاکستان کے چند بڑے ڈاکٹروں میں ہوتا تھا ۔ چنانچہ اگلے روز شوکت تھانوی کا باقاعدہ معائنہ کیا گیا ۔ ڈاکٹر صاحب معائنہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ جگر میں پھوڑا ہے ۔ ہسپتال داخل ہوجانا چاہئیے ۔ لیکن شوکت تھانوی کو اصرار تھا کہ وہ ہسپتال میں داخل نہیں ہوں گے چونکہ وہ انجکشنوں اور دواؤں سے بہت گھبراتے تھے ۔ شوکت تھانوی کی بڑی صاحبزادی شوکیہ تھانوی

---

[1] شوکت تھانوی : "خط بنام خورشید شوکت بتاریخ 18 ، مارچ 1963ء" ماخوذ نقوش شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ = 468 ، 469 ۔

ایک مضمون میں ان کی بیماری کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں :

" گھر پر کرنل یوسف کا علاج شروع ہوگیا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا ۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے رؤف یوسف نے جو کہ میوہسپتال کے انچارج بھی ہیں معائنہ کیا اور کہا آپ فوراً ہسپتال میں داخل ہوجائیں لیکن ابّا اب تک اس بات پر بضد تھے کہ میں کسی قیمت پر ہسپتال نہیں جاؤں گا ۔ آخر جب گھر پر کسی قسم کا افاقہ نہ ہوا تو ابّا کے چند مخلص دوستوں نے اصرار کیا مگر کچھ اثر نہ ہوا ۔ آخر امّی نے کہا کہ شوکت صاحب اگر آپ اپنے لئے نہیں تو کم از کم ان بچیوں کے لئے ہی ہسپتال چلے جائیے ۔ رضا مند ہوگئے ۔ لیکن اس شرط پر کہ میرا اپریشن نہ ہو ۔ چھ اپریل کو ابّا البرٹ وکٹر کمرہ نمبر 15 میں بسترِ علالت پر لیٹ گئے اور علاج شروع ہوگیا ۔ امّی نے بہت محنت کی ۔ رات دن تیمارداری کے لئے کھڑی رہتی تھیں اور دعا کرتی رہتی تھیں لیکن اللہ تعالی کو کچھ اور ہی منظور تھا ۔ "[1]

انیس اپریل کو ڈاکٹروں کا ایک بورڈ بیٹھا ۔ ڈاکٹروں نے کینسر ہونے کا اعلان کیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اس بیماری کا مکمل علاج ان کے پاس نہیں ہے ۔ جو دوائیں وہ دے رہے ہیں ان سے شوکت تھانوی کچھ عرصہ کے لئے اور زندہ رہ سکیں گے ۔ شوکت تھانوی کی خواہش کے مطابق 28 ، اپریل کو انہیں ہسپتال سے 6 ۔ برنی اسٹریٹ ، گڑھی شاہو لایا گیا ۔ یہاں انہوں نے ہومیو پیتھک کا علاج شروع کردیا تقریباً چھ دن یہ علاج ہوا ۔ 3 ، مئی کو شام کو حالت بہت نازک ہوگئی ۔ 15 منٹ تک بے ہوشی کے عالم میں پڑے رہے ۔

---

[1] شوکیہ تھانوی : ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ = 462 ۔

4 ، مئی کی صبح کو پھر طبیعت خراب ہوئی ، ان کا جسم کانپنے لگا ۔ صبح کے ساڑھے آٹھ بجے یہ بلبلِ ہزار داستان ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا ۔ ہزاروں لوگوں نے جنازہ میں شرکت کی اور میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کردیا گیا ۔ ملک کی نامور سیاسی ، سماجی اور ادبی شخصیتوں نے شوکت تھانوی کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ۔ ان نامور ہستیوں کے تعزیت نامے محمد طفیل مدیر "نقوش" نے نقوش لاہور کے شوکت نمبر میں شائع کئے ہیں ۔

اولاد :-

شوکت تھانوی کے یہاں پہلی بیوی سے تین بیٹے اور دوسری بیوی سے تین بیٹیاں پیدا ہوئیں ۔ سب سے بڑے بیٹے سعید عمر تھانوی انیس سو اکتیس عیسوی میں پیدا ہوئے ۔ آج کل پی ۔ آئی ۔ اے میں پرنسپل انجینئر ہیں ۔ انیس سو باسٹھ عیسوی میں ان کی شادی عطیہ زہرا سے ہوئی جو اب عطیہ سعید کہلاتی ہیں ۔ ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں ۔ لڑکوں کے نام نوید عمر تھانوی اور ولید عمر تھانوی ہیں ۔ جبکہ لڑکیوں کے نام نبیلہ عمر تھانوی اور شمیلہ عمر تھانوی ہیں ۔ پہلے 43 ۔ ڈی ، بلاک "بی" نارتھ ناظم آباد کراچی میں رہتے تھے آج کل گلشنِ اقبال میں اپنا مکان بنا لیا ہے اس لئے وہاں رہائش پذیر ہیں ۔

خورشید عمر :-

شوکت تھانوی کے منجھلے بیٹے خورشید عمر انیس سو تینتیس عیسوی میں پیدا ہوئے ۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد انیس سو ساٹھ عیسوی میں پبلک ریلیشن آفس واپڈا میں سکریٹ رائیٹر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی ۔ 1966ء میں

واپڈا کے لیبر ڈیپارٹمنٹ میں آ گئے ۔ سنی ویو کشمیر روڈ پر ڈائریکٹر لیبر اینڈ ویلفیئر واپڈا کا دفتر ہے اس میں آج کل کام کر رہے ہیں ۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مشہور آرٹسٹ ہیں اور بہت سے ڈراموں میں کام کر چکے ہیں ۔ نو دسمبر انیس سو باسٹھ عیسوی کو ایم ۔ اے ۔ رشید کی صاحبزادی فریدہ خانم سے شادی ہوئی جو اب فریدہ خورشید کہلاتی ہیں ۔ ایم ۔ اے رشید لکھنؤ ریڈیو کے پرانے آرٹسٹ ہیں اور ان کا شمار شوکت تھانوی کے قریبی دوستوں میں ہوتا ہے ۔ خورشید شوکت آج کل اپنے ذاتی مکان II - 17/B سٹریٹ نمبر 10 ، شاہ کمال کالونی لاہور میں رہتے ہیں ۔

رشید عمر تھانوی :-

شوکت تھانوی کے سب سے چھوٹے بیٹے رشید عمر انیس سو چالیس عیسوی میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے ۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی ۔ اے کرنے کے بعد پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن میں پروڈیوسر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا ۔ اس کے بعد نیشنل کونسل آف آرٹ کے ڈائریکٹر ہو کر اسلام آباد آ گئے جہاں سے دو سال کی ٹریننگ کے لئے رومانیہ گئے اسٹیج لائیٹنگ میں اسپیشیلائزیشن کیا ۔ آج کل سکین کمیونیکیشن ایڈور ٹائزنگ کمپنی کے جنرل مینجر کی حیثیت سے لاہور میں کام کر رہے ہیں ۔ 103 ۔ شاہ جمال کالونی میں رہتے ہیں ۔ ان کی شادی 10 ، مئی انیس سو اکہتر عیسوی کو ابو ظفر صاحب ریٹائرڈ آئی ۔ جی ۔ مغربی پاکستان کی سب سے چھوٹی صاحبزادی شمیم ظفر سے ہوئی جو آج کل لاہور فاؤنڈیشن سکول ، ماڈل ٹاون کی پرنسپل ہیں ۔ دو بچے ہیں ایک لڑکا کاشف عمر تھانوی اور ایک لڑکی صائمہ عمر تھانوی رشید عمر تھانوی کا شمار ڈرامے کے صفِ اوّل کے اداکاروں اور ہدایت کاروں میں

ہوتا ہے ۔

شوکیہ تھانوی :۔

انیس سو اکیاون میں لاہور میں پیدا ہوئیں ۔ بارہ سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۔ اکتوبر انیس سو اکہتر عیسوی میں کپٹن الطاف احمد سے شادی ہوئی ۔ دسمبر انیس سو اکہتر عیسوی میں کیپٹن الطاف احمد سلہٹ کے مقام پر شہید ہوگئے ۔ ان سے ایک بچی پیدا ہوئی جس کا نام عائشہ الطاف ہے ۔ انیس سو اٹھہتر عیسوی میں شوکیہ تھانوی نے رانا ظہیر حسین سے دوسری شادی کرلی جو لاہور ٹیلیویژن اسٹیشن کی میک اپ سیکشن میں کام کرتے ہیں ۔ چھ جون انیس سو اُناسی عیسوی کو ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام علی ظہیر رکھا گیا ۔ شوکیہ تھانوی آج کل شوکیہ ظہیر کے نام سے ریڈیو اور ٹیلیویژن کے پروگراموں میں حصہ لیتی ہیں اور ان کا شمار صفِ اوّل کے آرٹسٹوں میں ہوتا ہے ۔ آج کل 151 ۔ حبیب اللہ روڈ ، ممتاز سٹریٹ لاہور میں قیام پذیر ہیں ۔

فوزیہ تھانوی :۔

ان کا تاریخی نام شمشاد ہے ۔ کوئین میری کالج سے بی ۔ اے کیا بیس نومبر انیس سو تراسی عیسوی کو جمشید احمد غوری سے لاہور میں شادی ہوئی ۔ غوری صاحب یونائٹڈ بنک لاہور میں ملازمت کرتے ہیں ۔

فیضیہ تھانوی :۔

ان کا تاریخی نام شاہدہ ہے ۔ شوکت تھانوی انہیں پیار سے شدّو کہا کرتے تھے ۔ کئی خطوط میں یہ نام بار بار آیا ہے ۔ کوئین میری کالج

سے بی - اے کیا - انیس سو اکیاسی عیسوی سے پی - آئی - اے میں بطور سیلز اسسٹنٹ کام کر رہی ہیں - عامو اشوف سے ان کی منگنی ہوچکی ہے - عنقریب شادی ہونے والی ہے -

: ———— :: ———— :

" شخصیت "

شوکت تھانوی کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی - وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے جس جگہ بیٹھ جاتے زندگی چہک اٹھتی - بات کرتے ہوئے ان کا چہرہ ہمیشہ پر سکون اور سنجیدہ رہتا - ہونٹوں پر ایک معصوم مسکراہٹ کھیلتی نظر آتی اور گہرے رنگ کی عینک کے پیچھے ان کی آنکھوں میں ایک نہ بجھنے والی چمک دیکھنے والوں کی نظر سے اوجھل رہتی - کسی بات کا تجزیہ کرکے اسے دلکش پیرایۂ اظہار عطا کرنے میں انہیں کمال تھا - وہ صرف ایک نکتہ کو پھیلا کر داستان بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے - شاہد احمد دہلوی نے 1932ء کے شوکت تھانوی کا حلیہ اپنے ایک مضمون میں اس طرح بیان کیا ہے:

> " آڑی مانگ نکلی ہوئی ، کسی قدر تنگ پیشانی ، گول چہرہ ، آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک ، شریر بے قرار آنکھیں ، موزوں بینی ، لبوں پر پان کی ہلکی سی سرخی ، ترشی ہوئی مونچھیں ، داڑھی گھٹی ہوئی ، بے شکن اچکن ، چست پاجامہ ، وارنش کا پمپ شو ، داہنے ہاتھ میں پتلی سی چھڑی -"[1]

شوکت تھانوی کی یہ تصویر 1932ء کی ہے - قیام پاکستان کے بعد اور بالخصوص عقد ثانی کے بعد اس تصویر میں نمایاں تبدیلیاں آچکی تھیں - داڑھی کے ساتھ مونچھوں کا بھی صفایا کر دیا گیا تھا اور ہاتھ میں چھڑی رکھنے کی عادت بھی ختم کردی تھی - چست پاجامے اور اچکن کے ساتھ ساتھ سوٹ کا استعمال بھی شروع کردیا تھا - سوٹ پہننے کا شوق تو انہیں بچپن سے ہی تھا لیکن لکھنوی ماحول میں شیروانی کا استعمال زیادہ ہوتا تھا اس لئے وہ بھی شیروانی پہننا

---

[1] شاہد احمد دہلوی: ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ 359 -

کرتے تھے ۔ شوکت تھانوی کی بڑی بہن ظہور فاطمہ بیگم جو شادی ہوجانے کے بعد خاتون ارشد کہلائیں اپنے ایک مضمون میں ان کے سوٹ پہننے اور صاحب بہادر بننے کے شوق کو اس طرح بیان کرتی ہیں : " ان حضرت کو چھٹپن ہی سے صاحب بہادر بننے کا بہت شوق تھا ۔ امّاں ابّا سے اور تو سب ضدیں پوری کرا لیتا تھا مگر والد صاحب (منشی صدیق احمد) اس شوق پر کہتے تھے کہ جب تک تم میٹرک نہیں کرلو گے سوٹ نہیں پہن سکتے ۔ 15 سال کی عمر تھی یہ میرے پاس اچھا در آئے ۔ یہ ریاست بھوپال کا ایک بڑا تھانہ ہے اور میرے شوہر (ارشد تھانوی) جو شوکت کے چچا زاد بڑے بھائی ہیں وہاں سب انسپکٹر تھے ۔ شوکت نے ان سے کہا کہ بھائی جان میرے لئے ایک سوٹ سلوا دیجئے ۔ ارشد صاحب خود ابّا سے ڈرتے تھے ۔ کہنے لگے چچا جان خفا ہوں گے کہ ننھے ننھے شوق قبل از وقت پورے کرتے ہو لیکن میری سفارش پر انہوں نے سوٹ بھی تیار کرا دیا اور میرے کہنے پر ہیٹ بھی منگا دی ۔ بھیّا بہت خوش ہوئے ۔" [1]

شوکت تھانوی کی یہ صاحب بہادر بنے رہنے کی عادت تمام عمر قائم رہی ۔ وہ ہمیشہ اپنے لباس میں خاص اہتمام سے کام لیتے تھے ۔ شیروانی پہنتے یا سوٹ ، کپڑوں کے رنگ اور وضع سے ہمیشہ ان کی خوش مذاقی کا ثبوت ملتا تنگ پاجامہ پہنتے تو ان کی چوڑیوں میں سلیقہ نظر آتا ۔ کرتوں کی آستینیں چنی ہوئی ہوتیں ۔ شیروانی کی تراش ایسی ستھری ہوتی کہ دیکھ کر خوشی ہوتی ۔ سوٹ پہنتے تو قمیض کا رنگ سوٹ پر اور ٹائی کا رنگ قمیض پر پھبتا ۔ ٹائی ، رومال اور موزے ہمیشہ بہت اعلیٰ استعمال کرتے تھے ۔ جوتے ہمیشہ پالش سے چمک رہے ہوتے ۔ عشرت رحمانی نے ایک مضمون میں شوکت تھانوی کے لباس کا تذکرہ

---

[1] خاتون ارشد : ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ 428 ۔

اس طرح کیا ہے : " شوکت کی خاص کمزوریوں میں سب سے بڑی کمزوری تو اس کی وہی شان ہے جس نے اس کو اتنی عمر میں بھی " جواں سال " بنائے رکھا ہے ۔ شوکت کو کھانے پینے سے کوئی دلچسپی نہیں ۔ وہ اس معاملے میں اسی قدر لاپرواہ ہے جس قدر لباس کے معاملے میں محتاط ۔ لباس کی خوش اسلوبی اور تراش خراش سے اس کو عشق ہے ۔ وہ یوں تو ہر قسم کا لباس پسند اور استعمال کرتا ہے مگر سب سے زیادہ اس کو مشرقی اور خصوصاً لکھنوی لباس مرغوب ہے ۔ چنانچہ مخصوص محفلوں میں وہ ہمیشہ سیاہ اچکن اور چوڑی دار چُست پاجامہ زیب تن کر کے خوش ہوتا ہے اور ایک بانکا سجیلا جوان بن کر اپنی شگفتہ بیانی کی روانی دکھاتا نظر آتا ہے ۔" [1]

شوکت تھانوی لباس کے معاملے میں اتنے زیادہ محتاط تھے کہ نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی ان کے لباس کی تعریف کرتی تھیں ۔ بیگم خورشید حفیظ جالندھری جو " قاضی جی " میں ان کی لاڈلی اکلوتی زبیدہ بہن کا کردار ادا کرتی تھیں اپنے ایک مضمون میں ان کے لباس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتی ہیں :

> " شوکت بھائی نفاست پسند بہت تھے ۔ صاف ستھرا لباس پہنتے تھے ۔ کبھی ان کے کپڑوں پر میں نے شکن تک نہیں دیکھی ۔ وہ جو لباس پہنتے ان پر بھلا معلوم ہوتا ۔" [2]

اپنی دماغی صلاحیتوں سے بر وقت کام لے لینا ایک بڑی صفت ہے ۔ اس کے سہارے آدمی اپنی غلطیوں کو بھی نباہ سکتا ہے اور بے موقع شرمساری سے

---

[1] عشرت رحمانی : ماخوذ از ماہنامہ کتاب لکھنو شوکت تھانوی نمبر جولائی 1963ء صفحہ 26 ۔

[2] بیگم خورشید حفیظ جالندھری: ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963ء صفحہ ۔ 563 ۔

دو چار نہیں ہوتا ۔ حاضر دماغی کے ساتھ ساتھ حاضر جوابی بھی ایک بہت بڑا ہنر ہے ۔ جو آدمی کو کامیاب بناتا ہے اور دوسروں کے لئے تفریح طبع کا باعث ہوتا ہے ۔ بذلہ سنجی اور فطری طور پر مزاح کا شعور شوکت تھانوی کی حاضر جوابی کو چار چاند لگاتا ہے ۔ وہ چھیڑ چھاڑ کرنے والے کو برمحل ، با موقع اور مختصر جواب سے لاجواب کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اختر جہاں نے ایک مضمون میں شوکت تھانوی کی حاضر دماغی کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے : "مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ عید کے موقع پر پروگرام ہو رہا تھا ۔ اسی دوران اچانک اسٹوڈیو کا دروازہ زور سے کھلا شاید کوئی شخص غلطی سے ادھر آ گیا تھا ۔ واہ رے حاضر دماغی ! شوکت صاحب سامنے ہی کھڑے تھے فوراً قاضی جی کی آواز میں بولے "امجد میاں دیکھو کوئی عیدی ویدی لینے آیا ہوگا ۔ نکال باہر کرو اور دروازہ بند کردو یہ کیا خرافات ہے ۔ اس طرح بات بنائی کہ سننے والوں کو شبہہ بھی نہ ہوا ہوگا کہ کوئی انجانے پن میں اس طرف چلا آیا تھا ۔" [1]

شوکت تھانوی بڑے سے بڑے پھکّڑ باز اور حاضر جواب کو اپنی حاضر دماغی اور حاضر جوابی سے مات دے دیا کرتے تھے ۔ مشہور ناول نگار عادل رشید نے ایک مضمون میں شوکت تھانوی کی حاضر جوابی کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے :

" ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک محفل میں ایک صاحب جو اپنے آپ کو بہت بڑا تیس مار خاں سمجھتے تھے شوکت صاحب سے ازراہِ مذاق تمسخر فرمانے لگے "جناب آپ کا تھان کہاں ہے جہاں آپ بندھتے ہیں" انہوں نے تھانوی کی رعایت سے یہ فائدہ اٹھانا چاہا تھا ۔ شوکت صاحب نے پہلے تو ان کی اس بکواس کو سنی

---

[1] اختر جہاں : ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963 ء ، صفحہ ۔ 567 ، 568 ۔

ان سنی کر دینے کی کوشش کی لیکن جب انہوں نے پھر یہی بات اس انداز میں دہرائی جیسے کہ انہوں نے شوکت صاحب کو لاجواب کردیا ہو تو شوکت صاحب نے کمال سنجیدگی سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا " جب میں آپ کی ہمشیرہ محترمہ یا آپ کی دخترِ نیک اختر کے لئے اپنا پیام آپ کو دوں گا تو اسوقت اپنا تھان ، اپنی حیثیت اور اپنا اتا پتہ سب آپ کو بتا دوں گا ۔" اس پر ایک پر زور قسم کا فرمائشی قہقہہ بلند ہوا اور وہ تیس مار خاں صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے ۔" [1]

شوکت تھانوی کی پہلی بیگم سعیدہ شوکت بھی ان کی حاضر جوابی کی بہت تعریف کرتی ہیں انہوں نے ان کی حاضر جوابی اور حاضر دماغی کے کئی واقعات راقم کو سنائے ۔ ان کا بیان ہے کہ ایک دفعہ شوکت تھانوی کے چھوٹے بیٹے رشید عمر کے حلق میں کچھ تکلیف تھی ۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ غدود بڑھ گئے ہیں اس لئے آپریشن کرا دینا چاہئیے شوکت صاحب آپریشن سے بہت گھبراتے تھے سوچا کہ یونانی علاج کراکے دیکھیں لہٰذا رشید کو لے کر حکیم نیر واسطی کے پاس مشورہ کرنے کے لئے گئے ۔ حکیم صاحب نے بہت توجہ سے رشید کو دیکھا اور ایک ایلو پیتھک نسخہ تجویز کردیا جس میں آپریشن کا ہونا لازمی تھا ۔ حکیم صاحب ایلو پیتھک اور یونانی علاج دونوں کرتے تھے ۔ شوکت صاحب کو غالباً اس وقت اس بات کا علم نہیں تھا ۔ یہ نسخہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے ۔ حکیم صاحب نے مسکرا کر کہا " شوکت صاحب آپ حیران نہ ہوں یہ نسخہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر تجویز کیا ہے ۔ شاید آپ کو یہ معلوم نہیں کہ میں آدھا تیتر آدھا بٹیر ہوں ۔ شوکت تھانوی نے بڑی معصومیت سے برجستہ جواب دیا " تو قبلہ پہلے

---

[1] عادل رشید : ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963 ء ، صفحہ 485 ۔

بیڑ سے بسم اللّٰہ کی ہوتی "۔ یہ سننا تھا کہ حکیم صاحب ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوگئے اور اسی وقت نسخہ پھاڑ کے یونانی علاج شروع کردیا ۔

حاضر دماغی اور حاضر جوابی کے علاوہ برجستہ فقرہ چست کرنے میں بھی شوکت تھانوی اپنی مثال آپ تھے ۔ اس فقرے بازی کی عادت کی وجہ سے ان کے دوست احباب اور عزیز و اقارب سب ہی خائف رہتے تھے کہ نہ معلوم کب ، کس کے سامنے ان کے ہاتھوں ان کی شامت آجائے ۔ عشرت رحمانی نے اس قسم کا ایک واقعہ اپنے مضمون میں بیان کیا ہے : " شوکت صاحب اور رفیع احمد خاں صاحب مرحوم قدیمی ہم پیالہ و ہم نوالہ تھے اور دونوں ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ۔ خاں صاحب مرحوم کی خالہ جنہوں نے مرحوم کو بیٹے کی طرح پرورش کیا تھا ۔ وفات پا گئیں ۔ ظاہر ہے کہ ایسی رفیقہ اور شفیق عزیزہ کی وفات پر خاں صاحب کو کس قدر صدمہ تھا اور ان کے احباب کی شرکت اس سانحہ میں کتنی ضروری تھی لیکن خاں صاحب کو دیکھا گیا کہ وہ آنسو پونچھ کر ہر طرف یہ دیکھ رہے ہیں کہ شوکت صاحب کدھر ہیں اور شوکت صاحب پر نظر پڑتے ہی رونا دھونا بھول کر انہیں مجمع سے الگ لے گئے اور ہاتھ جوڑ کر منت سماجت کی کہ میں نے عمر بھر تمہاری مرضی کے خلاف تمہیں کسی بات پر مجبور نہیں کیا مگر اس وقت یہ درخواست منوا کر چھوڑوں گا کہ تم یہاں سے ابھی چلے جاؤ ۔ شوکت حیران و پریشان تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں ۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر خاں صاحب کا یہ احتراز کیوں ہے ------- شوکت کا انکار بڑھتے دیکھ کر خاں صاحب نے کہا " تو پھر تم یہاں رہو ، میں خود کہیں چلا جاتا ہوں ورنہ ابھی تم کوئی نہ کوئی موقعہ تلاش کرلو گے اور میں بے ساختہ ہنسنے پر مجبور ہو جاؤں گا ۔ مجھے اس ذلت سے بچانا ہے تو فوراً چلے جاؤ " آخر شوکت لاچار ہوگئے اور اپنا سا منہ لے کر بادلِ نخواستہ

وہاں سے رخصت ہونا پڑا ۔"[1]

شوکت تھانوی نہ صرف یہ کہ دوسروں پر فقرے کستے تھے بلکہ اپنے آپ کو بھی معاف نہیں کرتے تھے ۔ ان کا رنگ کالا تھا اس لئے اس کی مناسبت سے اپنے آپ پر پھبتیاں کستے رہتے تھے ۔ نسیم ممتاز سیّد نے اس ضمن میں ایک واقعہ تحریر کیا ہے : " ایک روز میں ان کے گھر شام کو پہنچا ۔ برسات کا زمانہ تھا ۔ میرے پہنچتے ہی شدید بارش شروع ہوگئی ۔ بارش کی حد تک تو شوکت صاحب لطف اندوز ہوتے رہے لیکن جب بہت خوفناک قسم کی کڑک اور بجلی کی چمک شروع ہوئی تو یہ بہت گھبرائے ۔ اپنی بیگم کو اور مجھے ہدایت فرمائی کہ کھڑکیوں کے پردے پورے کھینچ دئیے جائیں ۔ ان کی بیگم کے لئے تو ممکن ہے یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی لیکن مجھے بہت تعجب ہوا ۔ میں نے بیگم شوکت سے پوچھا " آخر یہ کیا بات ہے " انہوں نے جواب دیا " یہ ان کی آج کی نہیں ہمیشہ کی عادت ہے کہ " جہاں بجلی چمکی اور ان کے اوسان خطا ہوئے " میں نے شوکت صاحب سے وجہ پوچھی تو نہایت معصومیت سے فرمانے لگے " آپ بھی خوب چیز ہیں ۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ بجلی ہمیشہ سیاہ رنگ کی چیز پر گرتی ہے " ان کے رنگ کے پیش نظر اگر یہی بات کوئی دوسرا کہہ دیتا تو نہ جانے ان کے غصے کا پارہ کہاں پہنچتا لیکن اپنے رنگ کے بارے میں خود فقرہ چست کئے بغیر نہ رہے ۔"[2]

اسی طرح ایک مرتبہ احمد سلمان نے شوکت تھانوی سے فرمائش کی کہ انہیں اپنی نئی کوٹھی میں لگانے کے لئے مختلف قسم کے گلاب کے پودے درکار ہیں ۔

---

[1] عشرت رحمانی: ماخوذ از ماہنامہ کتاب لکھنؤ جولائی 1963ء شوکت تھانوی نمبر ، صفحہ 26 ۔ 27 ۔

[2] نسیم ممتاز سیّد: ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ 540 ۔

چنانچہ کسی جان پہچان والے آدمی کے ہاتھ یہ پودے کراچی بھیج دئیے جائیں ۔ ایک دن پشاور سے سلمان صاحب کی بیٹی زرینہ کا خط موصول ہوا کہ وہ کراچی سے پشاور آئی ہوئی تھیں اور اب فلاں تاریخ کو فلاں ٹرین سے کراچی واپس جا رہی ہیں اس لئے آپ گلاب کے پودے لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچا دیں چنانچہ نسیم ممتاز سیّد اور شوکت تھانوی نے مل کر لاہور کے تمام ذخیروں کو کھنگالا اور اچھے سے اچھے گلاب کے پودے فراہم کئے لیکن کالا گلاب کہیں سے نہ مل سکا جبکہ زرینہ اور احمد سلمان کی فرمائش میں کالا گلاب خاص طور سے شامل تھا ۔ نسیم ممتاز سیّد لکھتے ہیں کہ اس موقع پر شوکت تھانوی نے اس طرح بات بنائی : " وقتِ مقررہ پر ہم دونوں اسٹیشن پہنچ گئے ۔ عزیزہ زرینہ نے جو دیکھا کہ دو تین قلیوں کے سروں پر پودوں کی ٹوکریاں لدی ہوئی ہیں۔ تو بہت خوش ہوئیں اور چھوٹتے ہی انہوں نے سوال کیا " نسیم بھائی ! کالے گلاب کے پودے بھی لائے " میں نے فوراً جواب دیا " یہ آپ اپنے شوکت چچا سے پوچھئیے " شوکت صاحب نے جو نفی میں جواب دیا تو زرینہ نے ٹھنکنا اور مچلنا شروع کیا ۔ جائیے ہم آپ سے نہیں بولتے ۔ ایک ذرا سی فرمائش کی تھی ۔ نہ بھائی سے پوری ہوئی۔ نہ چچا سے ۔ شوکت صاحب نے برجستہ جواب دیا " سارا لاہور چھان مارا ۔ کالا گلاب نہیں ملا ۔ کالا گلاب دیکھنے کی ایسی ہی خواہش ہے زرینہ تو سمجھ لو میں گملے میں اگا کھڑا ہوں " شوکت صاحب کا جواب سننے سے پہلے کہاں تو زرینہ بسور رہی تھی ۔ کہاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور ان کی شکایت رفع ہوگئی ۔" [1]

---

[1] نسیم ممتاز سیّد : ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ ۔ 541 ۔

شوکت تھانوی میں فقرے بازی کے ساتھ ساتھ نقل اتارنے کا ملکہ بھی موجود تھا وہ کسی سے پہلی بار ملتے تو باتیں کم کرتے زیادہ تر وقت اس شخص کی ایک ایک حرکت اور لہجے کی ایک ایک خصوصیت کا مطالعہ بہت غور سے کرتے رہتے ۔ بے تکلف احباب کے ساتھ تنہائی کا موقع ملتا تو بے حد اعتماد سے اس کی ایسی مکمل نقل اتارتے یا اس خوبی سے اس کی پیروڈی کرتے کہ ان کی قوتِ مشاہدہ کا ہر شخص کو قائل ہونا پڑتا تھا ۔ نقل اتارنے میں یہ مہارت وہ بچپن ہی سے حاصل کر چکے تھے اپنے اسکول کے زمانۂ طالبعلمی میں اپنے استادوں کی نقلیں اُتار اُتار کر اپنے دوستوں سے داد وصول کرتے تھے " مابدولت " میں اس زمانہ کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ :

> " یہ خاکسار اپنے تمام استادوں کی نقل اتارا کرتا تھا ۔ ان کے لب و لہجہ سے لے کر ان کی کمزوریوں تک کی نقل جو غیر شعوری طور پر سب ہی میں کچھ نہ کچھ ہوتی ہیں اور جن کا احساس اس وقت ہو سکتا ہے جب کوئی بتائے ۔" ـــہ[1]

شوکت صاحب اساتذہ کی نقل اتارنے کے بعد شاعروں کی طرف متوجہ ہوئے تو ہر شاعر کے طرزِ بیان کی ہوبہو نقل اتار لیتے تھے کبھی آپ جگر کے انداز میں شعر سناتے کبھی جوش صاحب کے انداز میں پڑھتے اور کبھی حفیظ جالندھری کے انداز کی نقل اتارتے اگر کوئی شخص دوسرے کمرے میں بیٹھ کر یہ کلام سنتا تو وہ یقیناً یہی کہتا کہ جگر ، جوش ، یا حفیظ پڑھ رہے ہیں ۔ نقل اتارنے کی خوبی کی تعریف کرتے ہوئے سیّد امتیاز علی تاج لکھتے ہیں : " مہاتما گاندھی پر گولی چلی تو اس روز ایک پورا پروگرام ان پر کیا گیا

ـــہ[1] شوکت تھانوی: " مابدولت " ادارہ فروغ اردو لاہور ۔ صفحہ ۔ 50 ۔

اس میں شوکت نے مہاتما گاندھی کی آواز کی نقل ایسی خوبی سے اتاری کہ کئی سننے والوں کو شبہ ہوا کہ ریڈیو اسٹیشن کے پاس مہاتما گاندھی کا کوئی ریکارڈ موجود ہے ۔ یہ پروگرام برِعظیم میں بے حد پسند کیا گیا ۔ بعض ہندو خواتین نے پروگرام لکھنے والوں کے لئے چیک بھیجے جو شکرئیے کے ساتھ انہیں واپس کردئیے گئے ۔" [1]

ذہانت کے ساتھ ساتھ شرارت کا ہونا بھی ایک فطری امر ہے ۔ شوکت تھانوی بچپن سے ہی ذہین بھی تھے اور شرارتی بھی ۔ اپنی کتاب " مابدولت " میں اپنی شرارتوں کے معیار کا تعین اس طرح کرتے ہیں: " اسکول کے ہر استاد کو معلوم تھا کہ تمام شرارتیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں مگر اسی کے ساتھ شرارتوں میں کوئی کمینہ پن ، کوئی چھوٹی بات اور کوئی ایسی بات کبھی نہ ہوتی تھی کہ جس سے اسکول کی عظمت یا گھرانے کی عزت پر حرف آئے ۔ اس کے علاوہ ان شرارتوں میں ذہانت کو بھی کافی دخل ہوتا تھا اور ہم تمام دوستوں میں اتفاق اس قدر تھا کہ کیا مجال کوئی استاد ہم میں سے کسی کا بھید پالے ۔" [2]

شوکت تھانوی کی شرارتوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ جس کسے ساتھ شرارت کرتے تھے وہ بجائے خفا ہونے کے ہنسنا شروع کردیتے تھے ۔ شوکت تھانوی کی بڑی بہن جو شادی کے بعد خاتون ارشد کہلائیں ، شرارتوں کا سب سے زیادہ نشانہ بنتی تھیں اور شوکت تھانوی انہیں خوب تنگ کرتے تھے

---

[1] سیّد امتیاز علی تاج : ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ ۔ 506 ۔

[2] شوکت تھانوی : " مابدولت " ادارہ فروغ اردو ، لاہور صفحہ ۔ 48 ، 49 ۔

انہوں نے اپنے ایک مضمون میں ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے : " ہماری ایک تائی تھیں - بیچاری کانوں سے بہری اور عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے کچھ سنکی ہوگئی تھی - سیدھی سادی تو وہ شروع ہی سے تھیں - ہمارے تائے ابّا جن کو ہم بابو ابّا کہتے تھے - مدّت ہوئی ہندوستان سے باہر چلے گئے تھے اور 25 ، 30 برس سے لندن میں مقیم تھے - اس فراق نے تائی اماں کی دماغی حالت خراب کردی پھر بھی وہ ان کی واپسی کی لو لگائے بیٹھی تھیں - محمد عمر یعنی شوکت کی عمر کوئی 11 سال کی تھی - ایک مرتبہ اس نے ماموں زاد چھوٹے بھائیوں کو آمادہ کیا کہ اندر جا کر کہو کہ بابو ابا آگئے اور خود سوٹ پہن کر ان کے پاس آ کر کھڑا ہوگیا - مغرب کا وقت تھا کچھ اندھیرا ہو چلا تھا - تائی اماں بے چاری کو یقین آگیا کہ سچ مچ ان کے میاں آگئے اور خوش خوش پیٹھ کر کے بیٹھ گئیں اور سر پر سے دوپٹہ ماتھے پر جھپکا کر گھونگھٹ کی طرح کر لیا - کچھ منٹ انتظار کرنے کے بعد گردن موڑ کر کن انکھیوں سے دیکھا تو بھتیجے کو دیکھ کر پیٹھ پر دوہتڑ مارا کہ مجھ کو بنانے چلا ہے - "[1]

شوکت تھانوی کی زندگی اسی قسم کی شرارتوں اور دلچسپیوں سے بھری ہوئی ہے ان کی پہلی بیگم سعیدہ شوکت نے راقم کو چند واقعات سنائے -

پہلا واقعہ اس زمانے کا ہے جب شوکت تھانوی آل انڈیو ریڈیو میں ملازم ہوئے تھے (1939ء) اور سرپنچ اخبار کے دفتر کے بالکل سامنے رہا کرتے تھے وہیں سرپنچ اخبار کے دفتر میں ایک ہندو رہتا تھا - شوکت تھانوی نے اسے اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا کہ تم بہت خوبصورت ہو ، بہت حسین ہو ، لڑکیاں تم پر جان دیتی ہیں اور پھر اس غلط فہمی میں ڈال دیا کہ میرے گھر پر ایک شمیم نامی لڑکی ہے جو میری بیوی کی سہیلی ہے اور تمہاری ایک جھلک

---

[1] خاتون ارشد : ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ - 427 -

دیکھ کر تم پر سو جان سے فدا ہوچکی ہے اور یہاں سے اب شوکت صاحب کا ڈرامہ شروع ہوا کبھی فرضی لڑکی کے نام سے پرچے لکھے جا رہے ہیں ، کبھی اندھیرے میں برآمدے میں پڑی ہوئی چک کے پیچھے سے دوپٹہ نکال کر باہر لٹکایا جا رہا ہے جب اس بے چارے کو اچھی طرح مجنوں بنالیا تو یہ بھانڈا پھوٹا کہ یہ فرضی لڑکی شمیم اور یہ اس کے خطوط ، یہ سب شوکت صاحب ہی کی کارستانی ہے ۔ اس واقعہ سے وہ اس قدر شرمندہ ہوا کہ منہ چھپا کر ایسا بھاگا کہ پھر نذار نہیں آیا ـــــ یہی واقعہ بعد میں شوکت صاحب کی کتاب " خانم خاں " کا پلاٹ بن گیا ۔

ایک دوسرا واقعہ انہوں نے یہ سنایا کہ ایک مرتبہ پڑوس میں کسی دھوبی کے گھر کوئی تقریب تھی ۔ شوکت تھانوی کی بڑی بہن نے ان سے کہا کہ " دھوبی کے گھر کے ماش اور چاول کھانے کو جی چاہ رہا ہے " یہ سننا تھا کہ شوکت صاحب چپکے سے اٹھے اور دھوبی کے گھر جا کر کہہ دیا کہ " ہماری بہن صاحبہ ماش اور چاول مانگ رہی ہیں " اور یہ کہہ کر غائب ہوگئے ۔ تھوڑی دیر بعد دھوبی ماش اور چاول کا تھال لئے دروازے پر تھا ۔ اس تحفہ پر ان کی بہن صاحبہ حیران ہوئیں ۔ تحقیقات کی تو معلوم ہوا یہ سب شرارت شوکت صاحب کی ہے ۔

شوکت تھانوی کو یہ شوخی ، مزاح اور بذلہ سنجی ورثہ میں ملی تھی ۔ ان کے والد صاحب بھی ایک زندہ دل انسان تھے ان کی زندہ دلی کے چند واقعات شوکت تھانوی نے اپنی کتاب " مابدولت " میں تحریر کئے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں یہ زندہ دلی ورثہ میں ملی ہے ۔ مولانا عبدالرحیم کلیم ، منشی صدیق احمد (شوکت صاحب کے والد) کے دوست تھے ۔ ان کا رنگ سیاہ ، قد چھوٹا ، دوہرا جسم اور چہرے پر بال نہ ہونے کے برابر ۔

ان کو دیکھ کر بہت سے جانوروں کی تصویریں آنکھوں کے سامنے پھر جاتی تھیں شوکت تھانوی نے " مابدولت " میں ان کے کئی واقعات بیان کئے ہیں : " ایک دعوت کے موقع پر والد صاحب کو پہنچنے میں ذرا دیر ہوگئی - پہنچےتو دیکھا کہ ان کے ایک دوست کے نہایت گورے چٹے بچے کو مولانا کِھلا رہے ہیں - بچہ ان کے کندھے پر بیٹھا تھا - لوگوں نے والد صاحب سے شکایت کی کہ آخر اتنی دیر کیوں کردی - آپ نے نہایت تشویش سے فرمایا - سال کا شگون نکل رہا تھا - میں بھی ذرا وہاں ٹھہر گیا مگر خدا ہی خیر کرے اب کی نو روز سؤر پر سوار ہے " محفل میں قہقہہ پڑا اور مولانا نے بدحواس ہو کر بچے کو کندھے سے اتار دیا -" [1]

منشی صدیق احمد کی بذلہ سنجی کا صرف یہ ایک واقعہ نہیں ان کی زندگی اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے - اسی طرح جب ہم شوکت تھانوی کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی زندگی میں بھی بذلہ سنجی کے بہت سے واقعات نظر آتے ہیں - ان کی بیگم سعیدہ شوکت ، محمد طفیل مدیر نقوش کو انٹرویو دیتے ہوئے فرماتی ہیں : " جب ان کا مذاق کا موڈ ہوتا تھا تو وہ گھر میں بھی کسی کو نہیں چھوڑتے تھے - چاہے والدہ ہوں ، چاہے بہن ، مجھ سے ، بچوں سے اور حد یہ کہ نوکر چاکر سے بھی مذاق کرنے سے نہیں چوکتے تھے اور وہ اس وقت ایک شریر لڑکے کی طرح ہر ایک کو چھیڑتے پھرتے تھے - میں نماز پڑھ رہی ہوں تو میرے گلے میں ہینڈ بیگ لٹکا دیا - اب نہ میں رکوع میں جا سکتی ہوں نہ سجدے میں ایک عجیب مخمصہ میں جان ہے اور وہ ہیں کہ لطف لے رہے ہیں اور ایک ایک کو بلا کر تماشہ دکھا رہے ہیں یا کبھی نماز پڑھتے ہوئے مجھے چوکی سے اٹھا کر زمین پر کھڑا کردیا ، کبھی میں

---

[1] شوکت تھانوی : " مابدولت " ادارہ فروغ اردو لاہور ، صفحہ - 42 -

سجدے میں ہوئی تو کسی بچے کو میری پیٹھ پر سوار کردیا اور میں سجدے ہی میں رہ گئی ۔" [1]

ہر شخص کی زندگی کے مختلف رخ ہوتے ہیں کبھی وہ اولاد کبھی بھائی کبھی شوہر اور کبھی باپ کے روپ میں جلوہ گر ہے شوکت تھانوی نے بھی یہ تمام مدارج طے کئے اور ہر جگہ ان کی شخصیت بڑی نمایاں نظر آتی ہے ۔ اولاد کی حیثیت سے انہوں نے اپنے والد کی بیماری کے دوران جو تیمارداری کی اس کی نظیر ملنا مشکل ہے ۔ انہوں نے " مابدولت " میں تحریر کیا ہے کہ جب والد صاحب کے سرطان کا پھوڑا نکل آیا تو انہیں ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا ۔ شوکت تھانوی ان کی تیمارداری کے لئے ہر وقت ہسپتال میں موجود رہتے تھے ۔ وہ لکھتے ہیں : " ان کی تیمارداری میں ماموں صاحب اور ہم شب و روز مصروف رہے ۔ اسی علالت کے زمانہ میں ایک روز جب کہ ہم ان کا پس پاٹ صاف کر رہے تھے اور پاخانہ کا برتن صاف کر کے رکھ چکے تھے ۔ ہمارے سر پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ اسی دن کے لئے لوگ اولاد کی تمنا کرتے ہیں ۔ کم سے کم میرے لڑکے نے حق ادا کردیا ۔ ماموں صاحب نے جو کبھی کسی بچے کی تعریف کرنا گناہِ عظیم سمجھا کرتے تھے ۔ آج پہلی مرتبہ فرمایا کہ اس لڑکے نے ایسی خدمت کی ہے کہ میرے دل میں گھر کر لیا ہے اور یہ انشاءاللہ بڑی ترقی کرے گا ۔" [2]

بھائی کی حیثیت سے انہیں مولانا ارشد تھانوی (عم زاد) سے جو محبت تھی وہ اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اپنے بھائی کا

---

[1] ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963 ء ، صفحہ 413 ، 414 ۔

[2] شوکت تھانوی : " مابدولت " ادارہ فروغ اردو ، لاہور ، صفحہ ۔ 84 ۔

احترام کیا اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی حتیٰ کہ جب تخلّص رکھنے کا وقت آیا تو ارشد تھانوی کی مناسبت سے اپنا تخلّص شوکت تھانوی رکھا اپنی بہن ظہور فاطمہ بیگم سے بے انتہا محبّت کرتے تھے ۔ وہ اس محبّت کا اظہار اپنے ایک مضمون میں اس طرح کرتی ہیں: " شوکت کیسا مجھے چاہتا تھا اور اس کی ہر چیز ہر بات سے میں کیسا کیسا خوش ہوتی تھی ۔ لڑکپن میں سب سے پہلے جب سائیکل چلانا سیکھی تھی تب مجھے پکارا تھا کہ باجی باجی جلدی آئیے دیکھو مجھ کو سائیکل چلانا آگئی اور باجی اپنے بھیّا کی ہر بات سے مارے خوشی کے پھولی نہ سماتی ۔ دنیا کی کوئی بات ایسی نہ تھی جس میں باجی سے مشورہ نہ کیا جاتا ہو ۔ باجی اور بھائی جان اس کی چیزوں سے جتنا خوش ہوتے اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا جتنی داد ہر نئی ذہانت کی اس کو میں اور ارشد صاحب دیتے اور کوئی نہ دے سکتا ۔ بڑے ہونے پر بھی وہ ہمارے ساتھ بچہ بن جاتا ۔" [1]

شوکت تھانوی نے دو شادیاں کیں ۔ پہلی شادی سعیدہ بیگم سے دسمبر 1926 ء میں اور دوسری شادی زہرا بیگم سے مارچ 1949 ء میں ۔ اپنی دونوں بیگمات سے بے انتہا محبت کرتے تھے ۔ دوسری شادی کرنے کے بعد پہلی بیوی بچوں کے اخراجات کے لئے ایک معقول رقم ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں ضرور بھیج دیا کرتے تھے ۔ سعیدہ بیگم نے راقم سے گفتگو کے دوران بتایا کہ وہ تین سو روپے ماہانہ بھیجا کرتے تھے ۔ بچوں کو اگر مزید ضرورت ہوتی تھی تو وہ ان سے جا کر لے آیا کرتے تھے جب تک لاہور رہے تو یہ سلسلہ جاری رہا ۔ جب شوکت تھانوی کراچی اور راولپنڈی چلے گئے تو بذریعہ منی آرڈر یہ رقم بھیجا

---

[1] ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963 ء ، صفحہ ۔ 432 ۔

کرتے تھے ۔ انہوں نے اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں محمد طفیل مدیرِ نقوش کو بتایا : " ہماری ازدواجی زندگی بڑی پر سکون تھی اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بے تحاشہ محبّت کرتے تھے اور کسی قیمت پر بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ دونوں میں سے کسی کے بھی جذبات مجروح ہوں اور جہاں یہ جذبہ ہو وہاں ناخوشگواری کا سوال ہی کیونکر پیدا ہوسکتا ہے لیکن پھر بھی اگر میں یہ کہوں کہ ہماری زندگی ہمیشہ خوشگوار رہی تو یہ بھی مبالغہ آرائی ہوگی ۔ برتن پاس ہوتے ہیں تو کھڑک ہی جاتے ہیں بس احتیاط یہ ہے کہ ٹوٹے نہیں" [1]

شوکت تھانوی کی اپنی بیگمات سے محبت کا اندازہ ان کے خطوط سے بھی کیا جا سکتا ہے ۔ سعیدہ شوکت اپنے میکے میں تھیں کہ شوکت تھانوی نے لکھنو سے 5 ستمبر انیس سو چالیس کو انہیں ایک خط تحریر کیا : آپ بھی دیکھئیے " سعیدہ ڈارلنگ ۔ کل تمہارا خط میری بے چینی اور تمہاری تکلیف سے انتہائی پریشانی کی حالت میں ملا ۔ خدا کرے جو تکلیف تم کو اب باقی ہو وہ بھی دور ہوجائے اور میرا یہ خط پہنچنے تک میری روح میری جان سے زیادہ عزیز میری محبوب بیوی بالکل تندرست ہو ۔ آمین ـــ تمہارے گھبرانے یا پریشان ہونے کی آخر کون سی بات ہے ۔ اس کو تو گھبرانا ہی نہ چاہئیے جس کا کوئی چاہنے والا موجود ہو ۔ تم نہ سمجھو مگر شوکت تمہارا دیوانہ وار پرستار ہے ۔" [2]

انیس سو انچاس میں شوکت تھانوی نے جب دوسری شادی کرلی تو سعیدہ بیگم کی ناراضگی کے سبب انہوں نے دوسری بیگم کے پاس گڑھی شاہو رہنا

---

[1] ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ 413 ۔

[2] ایضاً ، صفحہ 571 ۔

شروع کردیا ۔ ایسی حالت میں بھی وہ وقتاً فوقتاً اپنی پہلی بیگم کو خط لکھتے رہتے تھے ۔ اہم معاملات میں سعیدہ بیگم بھی خط لکھ کر شوکت تھانوی سے مشورہ لے لیا کرتی تھیں ۔ شوکت تھانوی کے 23 ، اگست انیس سو اکسٹھ کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ سعیدہ بیگم صاحبہ نے سعید عمر کی شادی کے موقع پر شوکت تھانوی سے اس رشتہ کے بارے میں ان کی مرضی دریافت کی جس کے جواب میں انہوں نے لکھا : " بیگم صاحبہ ۔ آداب ۔ آپ کا خط ملا ۔ میں نے اس پر غور کیا اور غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آپ کو مبارکباد دوں ۔ یہ خاندان ہر اعتبار سے اچھا ہے ۔ میں اس کے اکثر حضرات سے واقف ہوں اور ان کی شرافت نسلی اور ذاتی شرافت کا قائل ہوں ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سعید کی مرضی کو سب سے مقدم سمجھتا ہوں ۔ اور سعید اور عطیہ سلمہا کی راہ میں ناعاقبت اندیش باپ کی طرح حائل ہونا نہیں چاہتا پھر یہ کہ حائل ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے ۔ اوّل تو سعید خود ہی سمجھدار اور عاقبت اندیش ہے دوسرے اس خاندان میں واقعی کوئی خامی نہیں ہے لہٰذا اللہ مبارک کرے آپ بسم اللہ کیجئے ۔"[1]

دوسری شادی کے بعد شوکت تھانوی کی ازدواجی زندگی پر ارشد تھانوی نے اپنے ایک مضمون میں بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ۔ اس اہم معاملہ میں ان کی رائے اس لئے صائب معلوم ہوتی ہے کہ محمد عمر کو شوکت تھانوی بنانے والے اصل میں ارشد تھانوی ہیں اور شوکت تھانوی کی زندگی کے اہم معاملات میں انہیں بہت زیادہ دخل رہا ہے وہ لکھتے ہیں : " شوکت نے لاہور کی ایک پڑھی لکھی خاتون سے عقد کرلیا ۔ اس سلسلہ میں سعیدہ خاتون

---

[1] ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963 ء ، صفحہ 572 ، 573 ۔

سے تلخی پیدا ہوئی اور اس قدر بڑھی کہ شوکت اپنی کنال پارک والی شاندار سجی سجائی کوٹھی چھوڑ کر گڑھی شاہو کے ایک چھوٹے سے مکان میں نئی بیوی زہرہ بیگم کے ساتھ آ رہے ۔ اس وقت سے اب تک پندرہ سال کا عرصہ گذر چکا ہے ان میاں بیوی نے ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھی یہاں تک کہ جب شوکت مرض الموت میں مبتلا لاہور کے مُیو اسپتال میں زیر علاج تھے (غالباً ڈاکٹروں کے مشورہ پر) سعیدہ خاتون ان کو دیکھنے نہیں گئیں ۔ گھر پر بیٹھی کسی خطرہ کے احتمال سے لرزتی سر بسجدہ ہو کر دعائیں مانگتی رہیں ۔ پھر وفات ہو جانے پر جسدِ بے جان کا آخری دیدار بھی نہ کیا ------ اس پندرہ سالہ علیحدگی کے دوران میں میاں بیوی کے درمیان مراسلت کا سلسلہ جاری رہا اور شوکت ایک رقم اپنی بڑی بیوی کو پوری پابندی سے ماہ بہ ماہ بھیجتے رہے ۔"[1]

چھوٹی بیگم سے محبت کا اندازہ شوکت تھانوی کے بہت سے خطوط سے ہوتا ہے ۔ 17 ، جولائی انیس سو ستاون کے ایک خط میں وہ لندن سے لکھتے ہیں کہ :

" تم اس ملازمت کے سلسلہ میں بالکل رنجیدہ نہ ہو جو تم چاہو گی وہی ہوگا ۔ میری زندگی کا مقصد تمہاری خوشی ہے اگر تم ہی خوش نہ ہو تو میں رتبہ ، تنخواہ وغیرہ سب کو ہیچ سمجھتا ہوں ۔ تم اس سلسلہ میں ذرہ برابر پروا نہ کرو ۔ جو تمہارا فیصلہ ہوگا وہی میرا ہوگا ۔ "[2]

زہرا بیگم کو شوکت تھانوی سے کتنی محبت تھی اس کا اندازہ ان کی تیمارداری سے لگایا جا سکتا ہے ۔ وہ رات دن تیمارداری میں لگی رہتی تھیں ۔ ان کے تمام دوستوں اور رشتہ داروں نے ان کی اس تیمارداری کی بہت تعریف کی ہے ۔

---

[1] ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ 450 ، 451 ۔

[2] ایضاً ، صفحہ 576 ، 577 ۔

ارشد تھانوی بھی ایک مضمون میں ان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> " زہرہ بیگم دن رات مریض شوہر کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں اور ہسپتال سے اسی کے گھر پر جانے کے دو تین روز بعد مرنے والے نے جانِ شیریں جان آفریں کے سپرد کی ۔" [1]

شوکت تھانوی کو اپنے بچوں سے بڑی محبت تھی ۔ وہ اپنے بچوں کی تمام خواہشات پورا کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے ۔ بیگم سعیدہ شوکت صاحب نے اپنے انٹرویو کے دوران راقم کو بتایا کہ وہ اپنے تینوں بیٹوں سے بہت پیار کرتے تھے اور ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ بچوں کی ہر خواہش کو پورا کریں اور اسی بات پر بیگم صاحبہ کی ان سے جھڑپ بھی ہو جاتی تھی کیونکہ بیگم صاحبہ کا خیال تھا۔ کہ بچوں کی ہر ضد پوری کرنے سے بچے خراب ہوجاتے ہیں لیکن اس معاملہ میں شوکت تھانوی اپنی بیگم صاحبہ کی کوئی بات نہ سنتے اور بچوں کی ہر جائز و ناجائز ضد کو پورا کرتے رہتے ۔ خود ان کے ساتھ بچہ بن کر کھیلتے تھے ۔ شوکت تھانوی نے اگر اپنے کسی بیٹے کو کسی بات پر ڈانٹ دیا ہے تو وہ خود ہی تھوڑی دیر بعد گلے لگا کر چمکار بھی لیا کرتے تھے رات کو جب تک کوئی بچہ ان کے ساتھ نہ لیٹے ان کو نیند نہیں آتی تھی ۔ بیگم صاحبہ نے گفتگو کے دوران بتایا کہ شوکت صاحب نہ صرف اپنے بیوی بچوں سے محبّت کرتے تھے بلکہ اپنے تمام رشتہ داروں کے ساتھ بھی ان کا سلوک بہت مشفقانہ ہوتا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے تمام رشتہ داروں میں ہر دلعزیز تھے ۔

دوسری شادی کے بعد جب پہلی بیوی اور بچوں کے ساتھ کچھ کھچاؤ کی کیفیت پیدا ہوئی تو اس زمانے میں بھی شوکت تھانوی نے اپنے بچوں کی ہر ضرورت

---

[1] ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963 ء ، صفحہ 451 ۔

کا خیال رکھا - بڑے بیٹے سعید عمر کو پی - آئی - اے میں اور منجھلے بیٹے خورشید عمر کو واپڈا میں اپنے اثر و رسوخ سے ملازمت دلوائی اور مرتے دم تک ان کی بہتری کے لئے کوشاں رہے - راولپنڈی سے 31 ، اگست انیس سو باسٹھ کو سعیدہ شوکت صاحبہ کے نام ایک خط تحریر کیا جس کے متن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کے کتنے خیر خواہ تھے -: " کمال کردیا آپ سب نے کہ دیوروں کو بھابی جان مل گئیں اور ساس کو بہو مل گئی لہٰذا اب اس بڈھے کو گھاس ڈالنے کی کوئی ضرورت ہی نہ رہی - انتہائی پریشانی کے عالم میں جب انعام الحق اور اقبال سلمہٗ کو خط لکھا تو معلوم ہوا کہ جناب مع دلہن بیٹی کے لاہور پہنچ چکی ہیں - آج سڈنی سے سعید کا خط بھی آیا ہے - اللّٰہ تعالیٰ اسے ساتھ خیریت کے واپس لائے اس پیارے پیارے احمق نے لکھا ہے کہ ابا اپنے سوٹ کی پیمائش بھیج دیجئیے میں آپ کے سوٹ لاؤں گا - میں نے اس کو سختی سے منع کردیا ہے کہ خبردار جو سوٹ لائے اس لئے کہ وہ جب تک سڈنی میں لنگوٹی باندھ کر نہ پھرے ، میرے لئے سوٹ لانے کی گنجائش نہیں نکال سکتا - میں نے لکھ دیا ہے کہ جو کچھ لانا ہے وہ میری بیٹی یعنی اپنی دلہن کے لئے لانا مجھے اس کی زیادہ خوشی ہوگی اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اپنی امی جان کے لئے ایک کنگارو کا بچہ ضرور لانا - بھئی خدا کے لئے اس اونٹ یعنی خورشید کو بلا کر اور کسی اسٹول پر کھڑی ہوکر ذرا اس کے کان تو پکڑ لو یعنی مجھے اس نے خط ہی نہیں لکھا نہ یہ لکھا کہ میں نے حامد جلال صاحب کو اس کے متعلق جو خط لکھا ہے اس کا کیا نتیجہ ہوا - میں نے حامد جلال صاحب کو بڑے زور دار الفاظ میں لکھدیا ہے کہ خورشید کو رسالہ کے شعبہ میں لے لیں - حامد جلال صاحب نے مجھ کو اب تک جواب نہیں دیا ہے - لہٰذا خورشید کو بلا کر کہو کہ وہ حامد جلال صاحب کو یاد دلائے کہ میرے خط کا جواب ان کے ذمہ ہے - بابا بیچارہ تو امتحان کی تیاریاں کر رہا

ہوگا لہذا اگر خط لکھا تو سخت خلل واقع ہوگا ۔ کوئی پروا نہیں ، کچھ دن کے بعد انشاء اللہ میرا پوتا مجھے خط لکھا کرے گا ۔" [1]

اس خط کے اقتباس سے شوکت تھانوی کی بیٹوں سے محبت اور ہمدردی ظاہر ہوتی ہے ۔ مولانا ارشد تھانوی نے بھی اپنے ایک مضمون میں شوکت تھانوی کی صفات بیان کرتے ہوئے اس صفت کی خاص طور سے تعریف کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں : " ان کے بیٹے بھی زہرہ بیگم والے گھر پر نہ جاسکتے تھے ، ریڈیو اسٹیشن پر ضرورتاً جا کر مل لیتے تھے ۔ پھر جب وہ روز نامہ "جنگ" کے ادارے میں کراچی آکر شامل ہوئے تب بھی ان کے بیٹے ان کے گھر نہ جا پاتے تھے ۔ پھوپھی یا خالہ کے یہاں رہتے اور دفتر روز نامہ " جنگ " میں جا کر ملتے ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شوکت کو اپنے بیٹوں سے محبت نہ رہی تھی ۔ وہ رفع شر کے لئے ایسا کرتے تھے ورنہ بچوں کی بہبود کا پوری شدت سے خیال رکھتے تھے ، ایک موقع پر تار دے کر سعید عمر کو لاہور سے بلایا ۔ اپنے تعلقات سے کام لے کر پی ۔ آئی ۔ اے کے شعبہ انجینئری میں بھرتی کرایا ۔ جہاں اب وہ آٹھ سو روپیہ ماہوار پاتے ہیں ۔ دوسرے بیٹے کو واپڈا میں ایک معقول جگہ دلوائی ۔ دونوں کی شادیوں میں شریک تو نہیں ہوئے مگر مصارف کے لئے بڑی بڑی رقوم بھیجیں ۔" [2]

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شوکت تھانوی کو اپنے بچوں سے محبت تھی وہ ان کی تمام ضرورتیں پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے اور انہوں نے بڑے بیٹے سعید عمر اور منجھلے بیٹے خورشید عمر کی شادیوں کے موقع پر ان کی مالی امداد بھی کی لیکن وہ ان دونوں شادیوں میں شریک نہیں ہوئے ۔ ہم نے اس سوال کا جواب پانے کے لئے سعید عمر ، خورشید عمر اور بیگم سعیدہ شوکت سے گفتگو

---

[1] ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ 573 ، 574 ۔

[2] ایضاً ، صفحہ 451 ۔

کی تو ان سب نے ایک جیسا ہی جواب دیا ان کا کہنا ہے کہ دوسری شادی کے بعد شوکت تھانوی اپنی دوسری بیگم زہرہ شوکت سے بہت ڈرتے تھے جس کی وجہ سے وہ ان شادیوں میں شریک نہ ہوسکے - ہم نے یہی سوال بیگم زہرہ شوکت سے کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ شوکت صاحب کا اپنی پہلی بیگم صاحبہ اور بچوں سے یہ مطالبہ تھا کہ وہ میری دوسری بیوی اور بچیوں کو بھی شادی میں بلائیں- تو وہ بھی شرکت کر سکتے ہیں ورنہ ان کے لئے شرکت کرنا ممکن نہ ہوگی - بیوی بچوں نے چونکہ یہ مناسب نہ سمجھا کہ وہ مجھے دعوت دیتے اس لئے شوکت صاحب نے ان شادیوں میں شرکت نہیں کی - اگر بیگم سعیدہ شوکت روا داری کا ثبوت دیتیں اور دوسری بیگم کو بھی شادی میں مدعو کرلیتیں تو یہ صلح صفائی کا بہت اچھا موقع تھا - عام طور پر اس قسم کی ناراضگیاں کسی خوشی کے موقع پر وسیع القلبی کا ثبوت دیتے ہوئے ختم کردی جاتی ہیں - حالات و واقعات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ شوکت تھانوی دل و جان سے دونوں بیگمات کے درمیان مفاہمت کروانا چاہتے تھے لیکن پہلی بیگم سعیدہ شوکت کی ضد آڑے آئی اور یہ مفاہمت نہ ہوسکی - بیگم سعیدہ شوکت نہ تو بیماری کے دوران انہیں دیکھنے گئیں نہ ہی قبرستان جاکر ان کا آخری دیدار کرنے کی کوشش کی -

شوکت تھانوی کے پہلی بیگم سے تین بیٹے تھے اور دوسری بیگم سے تین بیٹیاں - انہیں بیٹی کا باپ بننے کی تمنا بہت عرصہ سے تھی اور وہ یہ طے کر چکے تھے کہ اپنی بیٹی کا نام شوکیہ رکھیں گے وہ اس نام کو کیوں پسند کرتے تھے اس کا پس منظر مولانا ارشد تھانوی اپنے مضمون میں بیان کرتے ہیں - وہ لکھتے ہیں: شوکیہ ترکی لفظ ہے جس کے معنی تابانی اور درخشندگی کے ہیں ، اس نام کی بھی ایک خاص وجہ ہے - بھوپال سے کسی زمانہ میں ایک نسوانی رسالہ " الحجاب " کے نام سے نکلتا تھا اس میں ایک ترکی افسانہ کا ترجمہ شائع ہوا

شوکیہ اس کا عنوان تھا ۔ شوکت کی باجی کو یہ نام بہت پسند آیا ۔ کہا کرتی تھیں کاش یہ نام میرا ہوتا ۔ جب ان کے بھیا نے اپنا تخلص شوکت رکھا تو انہوں نے کہا ، میں اس کی بچی کا نام شوکیہ رکھوں گی ۔ شوکت بھی باجی کے اس خیال میں شریک ہوگئے مگر ان کے متواتر لڑکے تو ہوتے رہے لڑکی کوئی نہ ہوئی ----- انہوں نے دوسرا عقد کیا اور بچی پیدا ہوئی تو بہن کو خط لکھا ۔ اللہ کا شکر ہے بڑے انتظار کے بعد آخر شوکیہ آگئی ۔ "[1]

حقیقت یہ ہے کہ شوکت تھانوی نے شوکیہ کی پیدائش پر اتنی خوشی منائی کہ لوگ لڑکے کی پیدائش پر بھی اتنی خوشی نہیں مناتے ۔ منتوں اور مرادوں کے بعد ان کی زندگی کی یہ تمنا شوکیہ کے روپ میں پوری ہوئی ۔ شوکیہ تھانوی نے اپنے ایک مضمون میں اپنی والد کی محبت کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے : "جب میں پانچ برس کی تھی تو مجھے کنوینٹ سکول میں داخل کرایا گیا ۔ ابا ریڈیو اسٹیشن پر تھے ہی ، اسکول ابا کے راستے میں پڑتا تھا اس لئے ان کے ساتھ آنے جانے میں بہت خوشی محسوس کرتی ۔ شام کے وقت فرش پر گھوڑا بننا ، ہم کو اپنی پیٹھ پر سوار کرنا ابا کا خاص مشغلہ تھا جب پیٹھ پر بٹھا کر ادھر ادھر ہوتے تو امی کو ہمارے گرنے کی بہت فکر ہوتی لیکن ابا ہنستے ہوئے کہتے کہ میں اس نسل کا گھوڑا ہوں جو کہ مالک کے گرنے پر بسم اللہ پڑھتا ہے اور چوٹ نہیں لگتی ۔ تین سال کی عمر میں ہم نے گھر میں ایک کتا پال رکھا تھا جس کا نام "جیکی" تھا ایک دن میں نے ابا کی ڈبیا جس میں پان کتھا اور چونا تھا ابا سے چوری اٹھا کر جیکی کے پاس لے گئی اور جا کر کہا "جیکی" تو ماکو" کھائے گی ۔ ابا نے مجھے دیکھ لیا اور گود میں اٹھا کر کہنے لگے میری بیٹی بہت مہمان نواز بنے گی ۔ "[2]

---

[1] ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ 452 ، 453 ۔

[2] ایضاً ، صفحہ ۔ 460 ۔

شوکت تھانوی کی پدرانہ شفقت کے صرف چند واقعات ہم نے یہاں تحریر کئے ہیں - ہم نے ان کے تینوں بیٹوں اور تینوں بیٹیوں سے ملاقات کی ہے بلا استثنیٰ سب کے سب اپنے باپ کی محبت اور عظمت کے دل سے قائل ہیں - عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بچے اپنے باپ کی نسبت اپنی ماں سے زیادہ مانوس ہوتے ہیں لیکن یہاں معاملہ الٹ ہے چونکہ شوکت صاحب کے بچے ماں کی بجائے باپ سے زیادہ مانوس ہیں اور اس بات کا اعتراف بیگم سعیدہ شوکت نے اپنی گفتگو کے دوران بھی کیا ہے - دوسری بیگم زہرہ شوکت بھی اس بات کا اعتراف کرتی ہیں -

شوکت تھانوی کی طبیعت شگفتہ تھی اس لئے دوستوں کا حلقہ وسیع تھا اور جس سے ایک مرتبہ دوستی ہوجاتی اسے آخر دم تک نبھانے کی کوشش کرتے - ان کی دوست داری کا ایک نمونہ نسیم انہونوی کی شکل میں دیکھا جاسکتا ہے - ستمبر انیس سو اکتیس عیسوی، میں سر پنچ کا اجراء ہوا اور شوکت تھانوی جب تک لکھنؤ رہے بغیر کسی معاوضے کے مختلف حیثیتوں میں اس کی امداد کرتے رہے - کچھ عرصے تک اعزازی ایڈیٹر بنے رہے - اس کے لئے مستقل کالم لکھا کرتے تھے - بعض کالم دوسرے قلمی ناموں سے بھی لکھے - نادم سیتاپوری نے ایک مضمون میں نسیم انہونوی اور شوکت صاحب کی دوستی ان الفاظ میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے : "شوکت ، نسیم کی جدید ترین دریافت تھا - نسیم اس سلسلہ میں ہمیشہ خوش نصیب رہے کہ جہاں اپنے مطلب کا آدمی نظر آیا - یہ اس کے پیچھے لگ گئے - نسیم کی دیدہ وری کو شوکت میں وہ سب کچھ نظر آیا جو انہیں ہر حیثیت سے آگے بڑھا سکتا تھا - نسیم کا تیر نشانے پر ٹھیک ہی بیٹھا - شوکت ، نسیم کی " دیدہ وری " کا شکار ہوگئے اور باقاعدگی کے ساتھ انعامی بسکٹ فیکٹری پہنچنے لگے جو فیکٹری تو نام ہی کی تھی ایک چھوٹی سی دکان

ضرور تھی ۔ زیادہ پابندی سے نہیں مگر اکثر امین سلونوی بھی آجاتے تھے ۔ گھر گرہستی کا سارا کام نسیم کے سپرد تھا ۔ " سٹوو " پر چائے بنانا ، توسٹ پر مکھن لگانا اور نفاست کے ساتھ سب کے سامنے پیش کرنا ۔ شوکت کے چبھتے ہوئے فقرے ، امین کی پر وقار سنجیدگی اور الہام بھائی کی روندھی ہوئی ہنسی ۔ مدتوں اس ماحول کا روز مرہ بنی رہی ۔" [1]

نسیم انہونوی اور امین سلونوی کے ساتھ اتنی دوستی بڑھی کہ دنیا انہیں ایک جان ایسی اور تین قالب سمجھنے لگی اور اس دوستی کی شہوت ہوئی کہ لوگوں نے باپ ، بیٹا اور روح القدس والی بات بھی کہہ ڈالی ۔ اسی طرح عشرت رحمانی کے ساتھ تعارف ہوا اور یہ تعارف دیکھتے ہی دیکھتے دوستی میں ڈھل گیا ۔ عشرت رحمانی لکھتے ہیں : " اس کے بعد شوکت اور عشرت قریب سے قریب تر ہوتے گئے ۔ چنانچہ ادبی دنیا میں یہ دونوں نام کچھ اس طرح لازم و ملزوم ہوگئے کہ شوکت کے مضمون کی فرمائش عشرت کو اور عشرت کے مضمون کے لئے شوکت کے پاس تقاضے آنے لگے اور آتے رہتے ہیں اور یہ ملاپ اب پیار ،محبت جھگڑے لڑائی کی تمام پر خلوص حدود سے تجاوز کر کے محض قربت بن گیا ہے !" [2]

نسیم انہونوی نے اپنے ایک مضمون میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ہفت روز " سرپنچ " کی اسکیم شوکت تھانوی نے بنائی تھی ۔ وہ لکھتے ہیں :

> " حریم کے چند ہی پرچے شائع ہوئے تھے کہ شوکت صاحب نے ایک مزاحیہ ہفتہ وار نکالنے کی اسکیم بنا کر مجھے اس کا مالک بنایا خود ایڈیٹر بنے اور امین سلونوی صاحب کو مینجر کی کرسی دی گئی ۔ ہم تینوں نے باپ بیٹے روح القدس کا لقب حاصل کیا اور حالت یہ تھی جہاں بھی نظر آتے ہم ہم تینوں ہی ساتھ ہوتے ۔" [3]

---

[1] ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ 529 ۔

[2] ماخوذ " ماہنامہ کتاب " لکھنؤ جولائی 1963 ء ، صفحہ 23 ۔

[3] ایضاً ، صفحہ 21 ۔

محمد طفیل کے ایک مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دوستوں سے وعدہ نبھانے کی کوشش کرتے تھے انیس سو پنتالیس عیسوی میں انہوں نے ایک ناول دینے کا وعدہ کیا تو محمد طفیل لاہور سے لکھنؤ وہ ناول لینے کے لئے پہنچ گئے ۔ ناول ابھی تیار نہیں تھا لیکن انہیں اس بات کا احساس بھی تھا کہ ایک دوست اتنی دور سے ان کے پاس پہنچا ہے اس لئے انہوں نے ایک رات میں ناول لکھوا کر ان کے حوالے کیا ۔ محمد طفیل کی زبانی ناول لکھوانے کا حال سنئیے : " شام کا کھانا کھانے کے بعد انہوں نے قلم ، دوات اور کاغذ میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا کہ لکھو ناول ، تو میں سمجھا کہ مذاق کر رہے ہیں ۔ جب میں متواتر چار پانچ گھنٹے لکھتا رہا اور یہ زبانی لکھواتے رہے تو مجھے یقین ہوا کہ یہ مذاق نہیں تھا ۔ آخر میں کہاں تک لکھتا ۔ لکھتے لکھتے ہاتھ دکھنے لگے تو میں نے ان سے اپنی معذوری کا اظہار کیا ۔ اس وقت رات کے بارہ بجے ہوں گے لیکن یہ ایک صاحب کو جا کر پکڑ لائے اور ان سے لکھنے کو کہا ۔ وہ بے چارے بھی آنکھیں ملتے ملتے لکھتے رہے ۔ جب وہ بھی تین چار گھنٹے کے بعد آؤٹ ہوگئے تو پھر میری باری آئی ۔ چنانچہ اس طرح رات بھر شوکت صاحب لکھواتے رہے اور ہم لکھتے رہے اور جب صبح ان کا نوکر چائے لے کر آیا تو ڈھائی سو صفحے کا ناول ختم تھا ۔ اس ناول کا نام " بیوی " ہے ۔ "[1]

شوکت تھانوی نے اپنے تمام دوستوں سے دوستی نبھانے کی کوشش کی ۔ نسیم انہونوی اور محمد طفیل سے ان کی دوستی ایک مثالی دوستی ہے ۔

---

[1] ماخوذ ماہنامہ " کتاب " لکھنؤ ، جولائی 1963 ء ، صفحہ = 11

شوکت تھانوی کی شخصیت میں دیانت اور انکساری بھی تھی ۔ "سیلابِ تبسم" کے مقدمہ میں مرزا عظیم بیگ چغتائی نے شوکت تھانوی کی مزاح نگاری کی تعریف کرتے ہوئے فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی کا ہم پلہ قرار دیا تو شوکت تھانوی نے اسی کتاب میں " من آنم کہ من دانم " کے تحت اسے گستاخی تصور کیا اور لکھا کہ : "غضب خدا کا کہ مرزا فرحت اللہ بیگ ، جناب پطرس ، اور مسٹر رشید احمد صدیقی ایسے پہاڑوں سے مجھ جانِ ناتواں کو ٹکرایا گیا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ خود بدولت تو گویا بالکل ہی ذرۂ بیمقدار بن کر رہ گئے ہیں اور سب سے پہلے مجھ غریب کو اپنے ہی سے ٹکر دی ہے ۔ ان تمام باتوں کے باوجود جناب کا یہ اصرار کہ تم عرضِ حال نہ لکھو ۔ ذرا یہ زبردستی تو ملاحظہ فرمائیے یعنی

" زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا "

لیکن میں اس طرح خاموشی کے ساتھ پاگل بننے کے لئے تیار نہیں ہوں اور ان الفاظ کو میری طرف سے ڈھنڈورہ سمجھا جائے کہ میں دراصل مرزا فرحت اللہ بیگ ، جناب پطرس ، جناب رشید احمد صدیقی اور مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کے سامنے کسی حیثیت سے بھی مقابلتاً آنیکے خیال کو بھی مزاحیہ قسم کا کفر سمجھتا ہوں اور اس اعتراف کے بعد میں ان بزرگوں کی خدمت میں معذرت خواہ ہوں جن کی شان میں مقدمہ کے اندر مجھ سے مقابلہ کرکے گستاخیاں کی گئی ہیں ۔" [1]

ڈاکٹر میمونہ بیگم انصاری بہت عرصے تک بزمِ اردو راولپنڈی کے تحت ادبی محفلیں اور مشاعرے منعقد کرواتی رہیں ۔ اس زمانے میں شوکت تھانوی راولپنڈی کی ادبی محفلوں کی جان تصور ہوتے تھے اس لئے ڈاکٹر میمونہ بیگم انصاری کی ان سے کافی ملاقاتیں ہوئیں انہوں نے ان کی شخصیت کے بارے میں ایک مضمون میں لکھا

---

[1] شوکت تھانوی : سیلابِ تبسم مطبوعہ اشاعت العلوم پریس ، فرنگی محل ، لکھنؤ ، بارِ اوّل ۔ صفحہ = 14 ۔

ہے : " سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے متاثر کیا ہے وہ مرحوم کی انکساری تھی ۔ بزم میں کام کرنے کے دوران میں نے اکثر محسوس کیا اور مجھے خوشی ہوئی ہے کہ رفقائے بزم اور ان فنکاروں کے ساتھ کام کرکے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اگر خواتین اپنے اصولوں کی پابندی کے ساتھ کوئی سماجی کام کرنا چاہیں تو ہمارے مردوں میں آج بھی یہ صلاحیت ہے کہ ان سے قرارِ واقعی احترام ملنے کی توقع رکھی جا سکتی ہے ۔ شوکت صاحب سے راولپنڈی میں اکثر و بیشتر ملنے کا اتفاق ہوا ۔ ہر موقعہ پر مجھے ان کی انسانیت ، شرافت ، انکساری ، بذلہ سنجی اور حاضر دماغی کا معترف ہونا پڑا ۔" [1]

شوکت تھانوی کی مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی دشمن بھی مہمان بن کر آجائے تو وہ اس کی اتنی خاطر مدارت کرتے تھے کہ اسے شرمندہ ہونا پڑتا تھا ۔ اگر کوئی دوست مہمان بن کر آجائے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں کوئی خزانہ مل گیا ہو ۔ مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے تھے ۔ مالی حالت جیسی بھی ہو لیکن خاطر تواضع میں کمی نہ ہونے پاتی تھی ۔ بیگم سعیدہ شوکت نے راقم کو شوکت تھانوی کی مہمان نوازی کا ایک واقعہ سنایا کہ شوکت صاحب جب سانگ پبلیسٹی آرگنائزیشن میں تھے تو ان کے ایک دوست کا آل انڈیا ریڈیو دہلی سے لکھنؤ تبادلہ ہوگیا ۔ لکھنؤ آکر وہ شوکت صاحب کے مہمان بنے خیال یہ تھا کہ جب کوئی مکان مل جائے گا تو وہ چلے جائیں گے لیکن شوکت صاحب کی مہمان نوازی نے انہیں ایسا گرویدہ کیا کہ جب تک وہ محکمہ قائم رہا اور شوکت صاحب سرکاری کوٹھی میں رہے ، وہ ان کے ساتھ ہی رہے جب سانگ پبلیسٹی آرگنائزیشن کا محکمہ ٹوٹا تو شوکت صاحب کو اس بات فکر نہیں تھی کہ اب اپنے مکان کا کیا بندوبست ہوگا فکر تھی تو یہ کہ اب ان

---

[1] ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ = 559 ۔

کے دوست کے رہنے کا انتظام کہاں ہوگا ۔

بیگم زہرہ شوکت سے ہم نے شوکت تھانوی کے مذہبی معاملات کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ ذہنی طور پر مذہب کے بہت قریب تھے ۔ وہ روزے نماز کے بارے میں زیادہ پابندی تو نہ کرتے تھے لیکن رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے شیدائی تھے اور خدا کی عظمت کے دل سے قائل تھے ۔ ان کی مذہبی عقیدت کے سلسلہ میں اقبال صفی پوری نے اپنے مضمون میں ایک واقعہ بیان کیا ہے : " ایک دن صبح میں اپنے گھر سے نکل کر ان کے پاس پہنچا تو انہیں ناشتہ کرتے ہوئے پایا ۔ ایک چائے کی پیالی زبردستی میری طرف بڑھا کر کہنے لگے کہ بس میں چل رہا ہوں یہ کہہ کر وہ اپنے بیڈ روم میں چلے گئے ۔ میں بھی چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے یوں ہی ان کے پیچھے چلا گیا ۔ بیڈ روم کے دروازے پر پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ وہ اپنی مسہری کے سرہانے پر آویزاں ایک طغرے کو عقیدت کے ساتھ والہانہ چوم رہے ہیں اور آنکھوں سے مس کر رہے ہیں ۔ ان کا چشمہ ان کے ہاتھ میں تھا جوں ہی ان کو میری موجودگی کا علم ہوا وہ ٹھٹک گئے ۔ میری حیرت اور مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے یہ دیکھا کہ وہ طغرہ جس کو وہ یوں والہانہ بوسہ دے رہے تھے اس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضۂ اطہر کی شبیہہ مبارک تھی ------ مجھے اس کے بعد شوکت بھائی کے اس دل پر رشک آنے لگا جس میں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اس طرح جلوہ افروز تھی جس کا اظہار بھی شاید ان کی نظروں میں ریاکاری کے مترادف تھا ۔ " [1]

انسان میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ کچھ خامیاں بھی ہوتی ہیں اور بھلا کون سا انسان ایسا ہے جو برائیوں سے بالکل مبرا ہو ۔ قدرت کا کچھ اصول ہی

---

[1] ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963 ء ، صفحہ = 500 ۔

ایسا ہے کہ ہر بڑے سے بڑے انسان میں کوئی نہ کوئی خوبی ہوتی ہے اور ہر اچھے سے اچھے انسان میں کوئی نہ کوئی برائی ضرور پائی جاتی ہے ۔ شوکت صاحب کی شخصیت میں جہاں بے پناہ اچھائیاں تھیں وہاں چند خامیاں بھی موجود تھیں لیکن ان کی خامیوں پر خوبیاں غالب تھیں ۔ شوکت تھانوی کی ایک کمزوری یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ :

> " دوسروں سے مذاق کرنے میں تو یہ حد سے بھی تجاوز کر جاتے ، لیکن خود دوسرے کا مذاق برداشت نہ کرسکتے تھے ۔ "[1]

شوکت تھانوی ماں باپ کے بے حد لاڈلے تھے اور بڑے ناز و نعم سے پرورش پائی تھی چونکہ بچپن میں کافی بیمار رہے اس لئے ان کی ہر جائز و ناجائز ضد پوری کی جاتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی ہر ضد منوانا ان کی عادت بن گئی ۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان کی ضد میں بھی اضافہ ہوتا گیا ۔ یہ ان کی ضد ہی تھی جس کی وجہ سے وہ آخری علالت کے ایام میں ہسپتال میں داخل ہونے سے منع کرتے رہے ۔ دوستوں کے اصرار اور بیگم صاحبہ کی گذارش پر جب ہسپتال میں داخل ہوگئے تو ڈاکٹروں کی مرضی کے خلاف واپس گھر آ گئے اور پھر اس ضد کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہئیے تھا ۔

شوکت تھانوی کے دوست بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ بہت ضدّی تھے ۔ محمد طفیل نے ایک مضمون میں اس بات کی تائید اس طرح کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں:

> " بچوں کی طرح یہ ضد بھی کرتے تھے اور بڑوں کا سا حوصلہ بھی رکھتے ہیں ۔ بعض اوقات یہ کسی معمولی سی بات پر اڑ جائیں گے اور

---

[1] نسیم ممتاز سید: نقوش ، شوکت نمبر 1963 ء ، صفحہ = 540 ۔

دنیا جہاں   ایک کرکے اس بات کو منوا کے رہیں گے ۔" [1]

بچپن کی آسائشات کی بناء پر ان میں خوشامد پسندی پیدا ہوگئی تھی اور یہ خوشامد پسندی بڑے ہو کر بھی ان کی طبیعت میں شامل رہی ۔ اسی عادت کی وجہ سے ایک اور کمزوری پیدا ہوگئی کہ وہ اپنی برائی کسی سے سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے ۔ اس لئے دوستوں کو بھی اور گھر والوں کو بھی یہ ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ ان کی برائی کی نشاندہی کر سکیں ۔ نسیم انہونوی ایک مضمون میں لکھتے ہیں : " شوکت صاحب میں میرے خیال سے جو سب سے بڑی کمزوری تھی وہ یہ تھی کہ ان کی کسی کمزوری پر تنقید کردی جائے اگر کبھی ایسا ہوجاتا تو شوکت صاحب اس طرح برہم ہوجاتے کہ الفاظ میں اس برہمی کا لکھنا آسان نہیں ۔ اور اسی لئے مجھے اعتراف ہے کہ میں شوکت صاحب کی کمزوریوں پر کبھی تنقید نہ کر سکا ۔" [2]

شوکت تھانوی کی ضد اور ہٹ دھرمی نے ان میں بعض ایسی عادتیں بھی پیدا کردیں جس کی وجہ سے گھر کا سکون تباہ و برباد کر دیا مثال کے طور پر انہوں نے اپنی بیگم سے چھپ کر تاش کھیلنا شروع کئے اس کا جواز وہ "مابدولت" میں اس طرح پیش کرتے ہیں ۔: " کوئی نہ کوئی کاروبار ہونا چاہئیے تھا ۔ یا یوں کہیے کہ کاروبار وہ کرے جو بیکار ہو ۔ ہم خدانخواستہ بیکار تو تھے نہیں کہ خواہ مخواہ بک ڈپو کھولتے پھرتے ۔ مقصد تو روپیہ لگانے سے تھا اور منافع کمانے سے تھا لہذا ہم نے سب سے زیادہ چلتا ہوا کاروبار تاشوں کو سمجھا ۔

---

[1] ماخوذ از ماہنامہ " کتاب " لکھنؤ جولائی 1963 ء ، صفحہ =11

[2] ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963 ء ، صفحہ = 395 ۔

اس کاروبار میں نتیجہ فوراً معلوم ہوتا ہے یعنی یا تو وارے نیارے ورنہ ہمارے تو بھاگے -------- ہم تو اس سلسلہ میں تدبیر سے زیادہ تقدیر کے قائل تھے اور تقدیر کی آزمائش کا موقع جس قدر تاشوں میں حاصل ہوتا ہے اتنا کسی اور کاروبار میں حاصل نہیں ہوسکتا۔"[1]

نسیم انہونوی نے ان کی یہ عادت چھڑانے کی بہت کوشش کی لیکن جب وہ اپنی کوشش میں ناکام رہے تو انہوں نے یہ تدبیر نکالی کہ "سرپنچ" کے دفتر میں فلش کھیلنے کا اہتمام کیا اور چند دوست اس کھیل میں حصہ لیتے تھے اس کا مقصد شوکت تھانوی کی خواہش کا احترام اور انہیں پیشہ ور جواریوں سے دور رکھنا تھا۔ نسیم انہونوی نے اس مسئلہ پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

"شوکت صاحب کو فلش کھیلنے سے بڑی دلچسپی تھی اس لئے میں نے ان کے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے ایسا انتظام کیا کہ ہر شام دفتر میں فلش ہوتی اس میں شوکت صاحب مرحوم، طوزی صاحب مرحوم، پیارے لال، الطاف بھائی مرحوم اور عزیز بھائی کے ساتھ ہی میں بھی شریک ہوتا۔ رقم برائے نام یعنی دو پیسہ فی چال ہوتی اور لمٹ دو آنے کی رکھی جاتی اور اس طرح کھیل گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے ہوتا تو بھی روپیہ دو روپیہ سے زیادہ ہار جیت ممکن نہ ہوتی۔ چال کی یہ لمٹ بھی صرف اس لئے رکھی گئی تھی کہ شوکت صاحب تفریح کسے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ جوئے کی اسپرٹ سے کھیلتے اور چال اتنی بڑھا دیتے کہ تفریح ختم ہوجاتی۔ پھتّے اچھے ہوتے تو دوسرے بھی چال بڑھانے پر مجبور ہوجاتے اس لئے میں نے سختی کے ساتھ لمٹ کردی تھی۔ بہو حال اس سے شوکت صاحب کی تشفّی ہوئی ہو یا نہیں۔ لیکن وہ اس صحبت کو چھوڑ کر کہیں

---

[1] شوکت تھانوی: "مابدولت" ادارہ فروغ اردو، لاہور، صفحہ = 177، 178۔

اور نہ جاتے ۔" [1]

تاش کی عادت میں اتنے مبتلا ہوئے کہ فلاش کھیلتے کھیلتے رمی کی طرف آ گئے ۔ شوکت تھانوی کی دوسری بیگم زہرہ شوکت کو ان سے یہی شکایت تھی کہ وہ جب رمی کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں تو دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہوجاتے ہیں ۔ وہ اپنے انٹرویو میں محمد طفیل کو بتاتی ہیں : " کسی زمانے میں شوکت صاحب رمی بہت کھیلتے تھے اس کی وجہ سے ہاتھ بھی تنگ رہتا تھا مگر یہ شوق بھی دوستوں کی خوشنودی کے لئے ہی پورا کیا کرتے تھے ۔ مگر صاحب توبہ ہے رمی کیا ہوتی تھی ایک عذاب ہوتا تھا ۔ دو دو دن بیٹھے ہیں ۔ تین تین دن بیٹھے ہیں زیادہ تر یہ ان دنوں ہوتا تھا جب جگر صاحب آتے تھے ورنہ کھیلتے تو تھے، یوں دنیا کو بھول کر نہ کھیلتے تھے ۔ بعد میں ، میں نے طریقوں طریقوں سے یہ عادت بھی چھڑا دی تھی ۔ اس کے لئے وہ میرے شکر گذار بھی تھی ۔" [2]

شوکت تھانوی کی بزدلی کا اعتراف ان کے دوستوں کو بھی ہے اور بیگمات کو بھی ۔ بیگم زہرہ شوکت نے راقم سے گفتگو کے دوران میں کہا کہ شوکت صاحب اتنے بزدل اور ڈرپوک تھے کہ شوکیہ ، فوزیہ اور نفیسہ کے پیدائش پر انہوں نے انہیں ہمیشہ لاہور بھیج دیا اور وہ اپنی والدہ کے پاس رہا کرتی تھیں ۔ محمد طفیل نے لکھا کہ : " آپ فرسٹ کلاس قسم کے بزدل ہیں ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مزاح نگار ہیں اگر اپنا دل مضبوط ہوتا تو لوگوں کو رلانے پر بھی قادر ہوتے اور پھر آپ شوکت تھانوی نہ ہوتے علامہ راشد الخیری ہوتے ---

---

[1] ماخوذ از نقوش شوکت نمبر 1963ء ، صفحہ = 394 ، 395 ۔

[2] ایضاً ، صفحہ = 424 ۔

------ آپ خدا سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا کہ سانپ سے ۔ سانپ سے ڈرتے تو سبھی ہیں لیکن آپ تو سانپ کے ذکر تک سے ڈرتے ہیں ۔ جس رات سونے سے پہلے سانپ کا ذکر آجائے تو پھر طے ہے کہ اس رات آپ کو نیند نہیں آسکتی بلکہ لیٹے لیٹے ہر لمحہ یہ سوچتے رہتے ہیں کہ اب آیا سانپ کہ اب ، اب کمرے کے فلاں کونے سے نکل رہا ہے ۔ اب میری چارپائی کے نیچے پہنچا ۔ اب وہ چارپائی پر چڑھ رہا ہے ۔ اب ہے میرے بستر پر اور اب ۔ اب ۔ اسی اب میں رات کو صبح کردیں گے ــــــ اگر رات کو کہیں کھٹکا ہو ، تو یہ خود تھوڑی اٹھیں گے ۔ الٹا بیگم سے کہیں گے ۔ " سنتی ہو ذرا اٹھ کے دیکھنا ، کیا بات ہے ۔ مجھے تو کچھ گڑبڑ نظر آتی ہے اور جب بیگم اٹھ کر دیکھیں گی اور انہیں بتائیں گی کہ بلی تھی ۔ تب ان کی گھگی بندھنا بند ہوگی ۔" [1]

مختصر یہ کہ شوکت تھانوی بہت سی انسانی خامیوں کے باوجود دلچسپ شخصیت اور کردار کے انسان تھے ۔ انہیں اپنی خامیوں کا احساس تھا جس کا ذکر انہوں نے " مابدولت " میں جا بجا کیا ہے ۔ انہوں نے اپنی خامیوں پر منافقت کا پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی ۔ وہ دل کے بہت اچھے تھے ان کے دل میں انسان کا غم تھا ۔ وہ سراپا محبت تھے اور دلکش شخصیت کے حامل تھے ۔ ان کی شخصیت بڑی باہمہ اور بے ہمہ تھی اور ان کی اس سحر طراز شخصیت کی جھلک ان کی تخلیقات میں جا بجا دکھائی دیتی ہے ۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اور ان کی موجودگی سے زندگی چہک اٹھتی تھی جو بجائے خود ان کی سیرت کا ایک بہت بڑا شخصی امتیاز ہے ۔

---

[1] ماخوذ از ماہنامہ "کتاب" لکھنؤ جولائی 1963ء ، صفحہ = 9 ، 10۔

: ــــــ : : ــــــ :

دوسرا باب

تصنیفی سرمایہ

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

محمد ثاقب ریاض: 03447227224
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

شوکت تھانوی کی بحیثیت مصنّف مختلف حیثیتیں ہیں ۔ وہ شاعر مضمون نگار ، افسانہ نگار ، ناول نگار ، ڈراما نگار ، خاکہ نگار اور صحافی ہیں لیکن ان کا بنیادی رویّہ ایک مزاح نگار کا ہے ۔ مضمون ہو یا افسانہ ناول ہو یا ڈراما وہ ہر جگہ اپنے اس دل پسند رجحانِ طبع کے مطابق مزاح پیدا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

شوکت تھانوی نے انیس سو اٹھائیس عیسوی میں روز نامہ "ہمدم" کی ملازمت اختیار کی ۔ جہاں انہوں نے فکاہیہ کالم " دو دو باتیں " لکھنا شروع کیا اور پھر فکاہیہ کالموں کا یہ سلسلہ دوسرے اخبارات و رسائل تک پھیلتا چلا گیا ۔ یہی فکاہیہ کالم شوکت تھانوی کی مزاح نگاری کی بنیاد بنے ۔ انہوں نے ہزاروں کالم لکھے لیکن یہ کتابی شکل میں ابھی نہیں مرتب ہوئے ۔ اخبارات اور رسائل کی فائیلیں دیکھ کر ہم نے اہم کالم حاصل کئے اور ان کا تجزیہ صحافت کے باب میں پیش کیا ہے ۔

اس باب میں ہم شوکت تھانوی کے اس تصنیفی سرمائے کا جائزہ لے رہے ہیں جو کتابی صورت میں شائع ہوچکا ہے یا شائع ہونے کی امید ہے ۔ تاکہ اگلے ابواب میں اس تصنیفی سرمائے کی بنیاد پر شاعر ، مضمون نگار ، افسانہ نگار ، ناول نگار ، ڈراما نگار ، خاکہ نگار ، خود نوشت سوانح نگار اور صحافی کی حیثیتوں میں ان کے کام کا تنقیدی جائزہ لیا جائے اور شوکت تھانوی کی ادبی حیثیت کا تعین کیا جاسکے ۔

" مضامین اور افسانوں کے مجموعے "

موج تبسم :-

شوکت تھانوی کا پہلا مجموعۂ مضامین انیس سو بتیس عیسوی میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا مقدمہ نسیم انہونوی نے لکھا ۔ اس کا دوسرا ایڈیشن انیس سو تینتیس عیسوی میں صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے تین نئے مضامین کے ساتھ شائع کیا ۔ اور نسیم انہونوی نے اپنے مقدمہ پر نظر ثانی کی جس پر یکم ستمبر انیس سو تینتیس عیسوی کی تاریخ درج ہے ۔ اس کتاب میں جو مضامین شامل ہیں وہ یہ ہیں (1) قندِ مکرر ، (2) سودیشی ریل ، (3) میٹھے چاول ، (4) مشاعرہ اور جوتا ، (5) مہمان ، (6) سودیشی سے بدیشی ، (7) دوست ، (8) خدا سردے تو سودا دے ، (9) شاعر اور شاعری ، (10) مروّت ، (11) مطب ، (12) سودیشی ڈاک ، (3) فیشن ، (14) وی ۔پی ، (15) خودکشی (16) آسیبی خلل ۔

بحرِ تبسم :-

یہ شوکت تھانوی کا دوسرا مجموعۂ مضامین ہے جسے نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا ۔ مقدمہ مولانا نیاز فتحپوری نے تحریر کیا ۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن صدیق بک ڈپو ۔ امین آباد پارک لکھنؤ نے با اہتمام عابد علی خاں پرنٹر شاہی پریس ، نعمت اللّٰہ روڈ لکھنؤ سے شائع کیا ۔ تاریخِ اشاعت اس پر درج نہیں ہے ۔ پاکستان میں اسے اردو اکیڈمی سندھ نے انیس سو اٹھہتر عیسوی میں شائع کیا ۔ اس کتاب کے مضامین یہ ہیں ۔ (1) میز ، (2) چاء ، (3) ماسٹر صاحب ، (4) جس کے لئے کیا سفر ، (5) اڈیٹر ، (6) السلام علیکم ،

(7) بس جھانسی تک ، (8) مشرقی اور مغربی کتّا ، (9) واحد حاضر جمع غائب ، (10) شاہکار ، (11) سودیشی ریل کے بعد ، (12) نسیم انہونوی ، (13) معاف کیجئیے گا ، (14) بیکاری ، (15) اتوار ، (16) یکہ ، (17) سودیشی عدالت ، (18) گومتی سے جمنا میں ، (19) مٹھو بیٹے ، (20) سائیکل کی تعلیم ، (21) بڑے اچھے آدمی تھے ، (22) منشی ۔

سیلابِ تبسّم :-

شوکت تھانوی کا یہ تیسرا مجموعۂ مضامین ہے جسے صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے اشاعت العلوم پریس فرنگی محل لکھنؤ سے چھپوا کر شائع کیا ۔ مقدمہ مرزا عظیم بیگ چغتائی نے تحریر کیا ہے ۔ " من آنم کہ من دانم " میں شوکت تھانوی نے اپنے دستخطوں کے ساتھ بیس دسمبر انیس سو تینتیس عیسوی کی تاریخ لکھی ہے جس سے سن اشاعت کا تعین کیا جاسکتا ہے ۔ اس کتاب کے مضامین یہ ہیں ۔ (1) تعزیت ، (2) چالیسواں ، (3) ہم زلف ، (4) آرام کرسی ، (5) گھاگھرا پار ، (6) بیوی کا پروپیگنڈہ ، (7) تار کا منی آرڈر ، (8) امرود کا چور ، (9) بوا جعفری خانم ، (10) پکچر پیلس ، (11) برقعہ ، (12) جی ہاں پٹے ہیں ، (13) علاج بالغذاء ، (14) پان ، (15) عشق کی گولیاں ، (16) بہن کی ہمسائی ، (17) بسم اللہ اللہ اکبر ، (18) سگریٹ ، (19) قطع کلام ، (20) شامت ۔

طوفانِ تبسّم :-

یہ چوتھا مجموعۂ مضامین ہے جسے شوکت تھانوی نے " سیلابِ تبسّم " کے فوراً بعد شوکت بک ڈپو لکھنؤ سے مولوی محمد عثمان احمدی کی مالی اعانت

سے شائع کیا - مقدمہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے لکھا - دوسرا ایڈیشن مینجر صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے باہتمام سیّد توسل حسین یونائٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کیا - " سچ بولتا ہوں گو کہ یہ عادت نہیں مجھے " کے تحت شوکت تھانوی نے چھبیس جنوری انیس سو بیالیس عیسوی کی تاریخ لکھی ہے جس سے اس کے دوسرے ایڈیشن کی تاریخ اشاعت کا تعین ہوتا ہے - اس کتاب کے مضامین یہ ہیں (1) ٹائیگر ، (2) سناؤں تمہیں بات اک رات کی ، (3) اشتہاری شادی (4) ایک سنجیدہ بات ، (5) برادرِ عزیز مرحوم ، (6) چوری ، (7) افیونی ، (8) لاٹری کا ٹکٹ ، (9) ہوم ممبر ، (10) مغلوب الغضب ، (11) الہ آباد کے امرود ، (12) ہنسی ، (13) سالیاں ، (14) درگاہ شریف ، (15) برت (16) اصلاحِ سخن ، (17) آبنوس کا کندہ ، (18) نہ ہوا میں بیوی -

دنیائے تبسّم :-

یہ شوکت تھانوی کا پانچواں مجموعۂ مضامین ہے جس میں تیرہ مضامین اور آٹھ افسانے شامل ہیں اور دو سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے - یہ پہلی مرتبہ دسمبر انیس سو سینتیس عیسوی میں شائع ہوئی - اس کا مقدمہ " کچھ شوکت صاحب کی دنیائے تبسّم پر " کے عنوان سے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے تحریر کیا ہے - " دنیا کی بات " میں شوکت تھانوی نے لکھا ہے " میرے مضامین کا یہ پانچواں مجموعہ آخر کیوں شائع ہو رہا ہے ؟ قسم لے لیجئیے جو اس سوال کا جواب خود مجھ کو معلوم ہو - البتہ اس سلسلہ میں آپ برادرم خواجہ اظہر عباس صاحب بی - اے نبیرہ خواجہ الطاف حسین حالی علیہ الرحمتہ سے براہ راست خط و کتابت کر سکتے ہیں جو اس مجموعہ کی اشاعت کے سولہ آنے محرک اور سولہ آنے سے بھی زیادہ ذمہ دار ہیں -" اس کتاب کو خواجہ اظہر عباس مینجنگ

ڈائریکٹر حالی پبلشنگ ہاؤس "کتاب گھر" دہلی نے شائع کیا۔ جس کی فہرست مضامین یہ ہے۔ (1) مقروض، (2) مینار میں گنبد، (3) لکھنؤ کانگریس سیشن، (4) اختلاج، (5) تکیہ کا غلاف، (6) ایک شعر، (7) ڈبلو۔ٹی، (8) کرفیو آرڈر، (9) موحومہ، (10) قلم فوجدار، (11) موازنہ لکھنؤ و لاہور، (12) احمق اداکار، (13) شوہر یا ایڈیٹر، (14) شہتوت، (15) مکھّیاں (16) پروفیسر، (17) ڈاکٹر، (18) بر دکھوّا، (19) میں ایک بے روزگار ہوں (20) سرود خانۂ ہمسایہ (21) بحر العلوم۔

پاکستان میں اس کتاب کو اردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی نے دسمبر انیس سو اٹھہتر عیسوی میں باب الاسلام پرنٹنگ پریس، کراچی میں چھپوا کر شائع کیا ہے جو دو سو تین صفحات پر مشتمل ہے۔

گِوگِٹ :-

شوکت تھانوی کے ساتھ مضامین کا مجموعہ ہے جسے نسیم انہونوی نے سیّد توسل حسین یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ سے چھپوا کر نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔ یہ مجموعہ 177 صفحات پر مشتمل ہے۔ ہمیں اس کا پہلا ایڈیشن خورشید شوکت کی لائبریری سے ملا ہے لیکن اس مجموعۂ مضامین پر سنِ اشاعت درج نہیں ہے۔ اس میں جو مضامین شامل کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں: (1) گِوگِٹِ خالص، (2) مسٹر، (3) قلم اشار، (4) ریشائیمل، (5) لیڈر، (6) ملک التجار، (7 سجادہ نشین۔

مجھے خرید لو :-

ہندوستانی پبلشرز دلّی نے انیس سو بیالیس عیسوی میں افسانوں کے

مجموعے کی حیثیت سے چھاپا ہے ۔ اس کا دوسرا ایڈیشن جون انیس سو چھیاسٹھ عیسوی میں نگارستان ایجنسی اردو بازار دلّی نے دیال پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر شائع کیا ۔ پاکستان میں کتاب محل کراچی نے مشہور آفسٹ پریس کراچی سے چھپوا کر شائع کیا ۔ ستمبر انیس سو پچپن عیسوی تک اس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوچکا تھا ۔ یہ کتاب دو سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے اس کتاب میں دس افسانے شامل کئے گئے ہیں ۔ (1) بردکھوّا ، (2) کایا پلٹ ، (3) اتوار ، (4) کون جیتا ، (5) میر صاحب کی عید ، (6) مقروض ، (7) پہلی جنوری ، (8) رات گئے ، (9) سمجھوتہ ، (10) الٹ پھیر ۔

لاہوریات :-

مارچ انیس سو پینتالیس عیسوی میں اردو بک سٹال ، بیرون لوہاری دروازہ ، لاہور نے شائع کیا ۔ یہ ایڈیشن خورشید شوکت کی لائیبریری میں محفوظ ہے ۔ ہمارے پاس اس کا چوتھا ایڈیشن ہے جو اپریل انیس سو باون عیسوی میں استقلال پریس ، لاہور سے چھپا ۔ یہ مجموعہ دو سو تیئیس صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس میں انیس مضامین شامل ہیں : (1) لاہوریات ، (2) حق لاہوری نمک (3) پرابلم ، (4) پشرول ، (5) رضائی ، (6) عمدۃ الحکماء ، (7) پڑوسی عذاب ، (8) لکھنؤ ، (9) برائیوں کی اچھائیاں ، (10) بیوی کے رشتہ دار ، (11) اگر میں بیوی ہوتا ، (12) مسافروں کے جھگڑے ، (13) خواہ مخواہ کی لڑائی ، (14) تکلّفاتِ لکھنؤ ، (15) ادیبوں کی لڑائی ، (16) آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے ، شاعری ، (17) آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے ، ضعفِ بصر ، (18) آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے ، اس کا لب پر آنا ، (19) آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے ، لب پر آجائے تو پھر ؟ ۔

وغیرہ وغیرہ :-

انیس سو سنتالیس عیسوی میں ادارہ فروغ اردو لاھور نے پی - آر - بی - ایس پریس لاھور سے چھپوا کر شائع کیا - اس کا پہلا ایڈیشن دو سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ھے - اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن انیس سو ترپپن عیسوی میں سویرا آرٹ پریس لاھور میں چھپ کر منظر عام پر آیا - جو ایک سو اٹھانوے صفحات پر مشتمل ھے اس میں تین افسانے اور دس مضامین شامل ھیں - (1) جلوس ، (2) ھمنوا میں بھی کوئی گل ھوں ، (3) دو منٹ ، (4) ضرب تقسیم ، (5) سائن بورڈ ، (6) فلمیریا ، (7) تندرستی ھزار نعمت ھے ، (8) جھوٹ کا سچ ، (9) قوم ، (10) آزادی ، (11) اقبالیات ، (12) نبھے کیوں کر ؟ ، (13) لحاف اندر لحاف + اس مجموعے کو بھارت میں ادارۂ ضیائے ادب - مراد آباد نے شائع کیا ھے جس کے ایک سو اٹھاون صفحات ھیں -

بُھوے بھلے :=

پہلی موتبہ اپریل انیس سو چھیالیس عیسوی میں ادارہ فروغ اردو ، اندرون لوھاری دروازہ ، لاھور نے تعلیمی پریس بیرون اکبری دروازہ لاھور سے چھپوا کر شائع کیا - اس میں سات افسانے اور دس مضامین شامل کئے گئے ان کی ترتیب یہ ھے : (1) سودیشی ریل ، (2) جس کے لئے کیا سفر ، (3) صدر مشاعرہ ، (4) تعزیت ، (5) سناؤں تمھیں بات اک رات کی ، (6) شاھین بچے ، (7) لکھنؤ کانگریس سیشن ، (8) خدا سر دے تو سودا دے ، (9) بے کاری ، (10) لحاف اندر لحاف ، (11) جی ھاں پٹے ھیں ، (12) ٹائیگر ، (13) عمدۃ الحکماء ، (14) اختلاج ، (15) پرابلم ، (16) قاضی جی ، (17) منشی جی -

مضامینِ شوکت :-

یہ مجموعۂ مضامین ادارہ فروغ اردو ، لاہور نے 1952ء میں پہلی مرتبہ شائع کیا ۔ اس میں سات افسانے اور تیرہ مضامین شامل ہیں ۔ اس کی فہرست یہ ہے (1) اے دلربا تیرے لئے ، (2) شاہین بچے ، (3) آزادی کا شوق ، (4) لیاقت نہرو معاہدہ ، (5) مشاعرہ ، (6) بخیالِ خویش خبطے ، (7) جنسِ ہنر بیچتا ہوں ، (8) کافی ، (9) میں ایک شاعر ہوں ، (10) ان کی سسرال ، (11) اے روسیاہ تجھ سے تو ، (12) جگر کے مریض (13) سو کا نوٹ ، (14) سسرالی رشتہ دار ، (15) میں میراجی کو نہیں جانتا ، (16) اپنے مضامین اپنی نظر میں ، (17) ہم زلف کا بکرا ، (18) خان بہادر صاحب ، (19) بوہمنی میں السیٹ ، (20) کرکٹ میچ ۔

مونڈی کاٹے :-

مونڈی کاٹے کے مضامین شوکت تھانوی نے رسالہ حریم کے لئے 1934ء میں تحریر کئے تھے ۔ نسیم انہونوی نے " تعارف " میں لکھا ہے کہ " مونڈی کاٹے " دراصل مجموعہ ہے شوکت صاحب کے ان مضامین کا جو انہوں نے آج سے سترہ سال قبل اس وقت لکھے تھے جب رسالہ حریم کا اجراء ہوا تھا " اس کا مطلب یہ ہوا کہ مضامین کی یہ کتاب انیس سو اکیاون

میں شائع ہوئی ۔ یہ کتاب ناشر نسیم انہونوی نے یوسفی پریس لکھنؤ سے چھپوا کر نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع کی ۔ یہ کتاب 110 صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس میں بارہ مضامین شامل ہیں جن کی فہرست یہ ہے : (1) نگوڑے ، مونڈی کاٹے ، (2) اوئی نوج ، (3) نگلو ۔ زہر مار کرو ، (4) دور ۔ دفعان ، (5) چولہے میں جاؤ ۔ بھاڑ میں جاؤ ، (6) چل ۔ ہٹ ، (7) موئے ۔ مردے ، (8) اے ہے ۔ ہے ہے ، (9) اوں ۔ واہ ، (10) توبہ ۔ اللہ ، (11) آگ لگے ، جھاڑو پھرے (12) بھئی اللہ ، اوئی اللہ ، ہائے اللہ ۔

برقِ تبسّم :-

یہ کتاب اکتوبر 1951ء میں نسیم انہونوی نے سرفراز پریس لکھنؤ سے چھپوا کر نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع کی ۔ اس میں پانچ افسانے اور سولہ مضامین شامل ہیں جن کی فہرست یہ ہے : (1) افیونی کی جنّت ، (2) اگر میں لڑکی ہوتا ، (3) تکلّفات ، (4) اگر میں بادشاہ ہوتا ، (5) وکیل ، (6) بے روزگار ، (7) میر صاحب کا ریل کا سفر ، (8) پنشن ، (9) اگر میں لیڈر ہوتا ، (10) مناشرہ انجمن بہارِ ادب لکھنؤ 1938ء ، (11) غالبیات ، (12) شوہر کی جنّت ، (13) شوہر یا ایڈیٹر ، (14) حادثات ، (15) بابو ، (16) اگر میں ہٹلر ہوتا ، (17) برلن کا اسپتال ، (18) میں جاتا ہوں ، (19) بوہمنی میں السیٹ ، (20) اگر میں تھانیدار ہوتا ، (21) سسرال ۔ یہ کتاب 239 صفحات پر مشتمل ہے ۔

مسکراہٹیں :-

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن " نسیم انہونوی مالک نسیم بک ڈپو لکھنؤ "

نے شائع کیا ہے۔ یہ ایڈیشن بیگم زہرہ شوکت اور خورشید شوکت کی لائبریریوں میں محفوظ ہے۔ اس پر سنِ اشاعت درج نہیں۔ یہ 192 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں پانچ افسانے اور چودہ مضامین شامل ہیں۔ ان کی فہرست یہ ہے :
(1) خضاب ، (2) پھر وہی عید ، (3) بلّی ، (4) الکشن کی دلچسپیاں
(5) کھجلی ، (6) طوطی خانے میں نقّارہ ، (7) ڈولی ، (8) آئینہ کے سامنے
(9) نادرشاہ ، (10) لاڈلا بیٹا ، (11) نو روپیہ تیرہ آنے ، (12) مرد بیوی ،
(13) خدا کا روزنامچہ ، (14) کیرم بورڈ ، (15) قیامت ، (16) جھوٹ سچ
(17) فلم اسٹار دلہن ، (18) وکیل ، (19) بشیر باز ۔ پاکستان میں اس کتاب
کو لارک پبلشرز ، کراچی نے اکتوبر 1961ء میں شائع کیا جس میں یہ تمام مضامین موجود ہیں۔ یہ ایڈیشن 224 صفحات پر مشتمل ہے۔

کائناتِ تبسّم :-

افسانے کے مجموعے کے طور پر علوی بک ڈپو ، محمد علی روڈ ، بمبئی نے اتحاد پریس سے چھپوا کر جنوری 1959ء میں شائع کیا۔ اس میں بیشتر افسانے اور مضامین ایسے شامل کئے گئے ہیں جو پہلے سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ فہرست یہ ہے : (1) بیگم کی جنّت ، (2) افیونی کی جنّت ،
(3) اگر میں لڑکی ہوتا ، (4) اگر میں گھوڑا ہوتا ، (5) اگر میں بادشاہ ہوتا ،
(6) بابو ، (7) امن کی تصویر ، (8) پرائیویٹ سیکرٹری ، (9) فلم اسٹار
(10) سونا ، (11) شعر نہ لکھا کرو ، (12) دامادِ فرنگ ، (13) وکیل آج
کیا ہے ، (14) وکیل کل کیا ہوگا ۔ (15) آخری روزہ ، (16) میں مدقوق تھا ،
(17) ناشرہ انجمن بہارِ ادب لکھنؤ 1938ء ، (18) بشیر باز ، (19) منگیتر ،
20) بال کی کھال ۔

یہ کتاب زہرہ شوکت کی لائیبریری میں محفوظ ہے اس کے 172 صفحات ہیں ۔

جی ہاں پٹے ہیں :-

افسانوں کا یہ مجموعہ سلیمان برادرز ، سول ایجنٹ ۔ مکتبہ اردو ادب ، لیاقت بازار حیدرآباد نے جاوید پریس کراچی سے چھپوا کر پہلی مرتبہ اکتوبر 1959ء میں شائع کیا ۔ فہرست مشمولات یہ ہے : (1) شوہرِ نامدار ، (2) رخصتِ علالت ، (3) سانپ مار خاں ، (4) چھلانگ ، (5) شادی کا اشتہار ، (6) نواب منجھو ، (7) کانا پردہ ، (8) کیا میں شاعر ہوں ، (9) جی ہاں پٹے ہیں ، (10) آسیب ، (11) ایک ملازم کی ضرورت ہے ۔ (12) بیوی اور ڈھیلے (13) دوزخ ، (14) حضور ، (15) آئینہ ، (16) چور دروازہ ، (17) زنانہ مشاعرہ اور مردانہ خطبہ ، (18) پیدل ، (19) کرکٹ ۔

نمک مرچ :-

ادارۂ فروغ اردو لاہور نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا ۔ اس کتاب پر سنِ اشاعت درج نہیں ۔ محمد طفیل مالک ادارہ کو یاد نہیں اور ادارہ فروغ اردو کا ریکارڈ اس سلسلہ میں خاموش ہے ۔ بھارت میں یہ کتاب خالد بک ڈپو لکھنؤ نے چھاپی ہے جس کے 190 صفحات ہیں ۔ ادارہ فروغ اردو سے شائع ہونے والی کتاب 202 صفحات پر مشتمل ہے ۔ اسے بھی افسانوں کا مجموعہ کہکر شائع کیا گیا ہے ۔ لیکن اس میں دس افسانے اور دس مضامین ہیں ایسا کیوں ہے ؟ راقم نے محمد طفیل صاحب سے سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس زمانے میں افسانوں کا بہت چلن تھا اس لئے افسانوں کی کتابیں آسانی سے

بک جاتی تھیں ۔ اس کتاب کے موضوعات یہ ہیں : (1) دولت خانہ ، (2) تعبیر طلب ، (3) بیگم نخیس کے میاں ، (4) نمک مرچ ، (5) بیوی سلام کہتی ہیں ، (6) غربا کشتن روزِ اول ، (7) " ب " ، (8) مسور کی دال ، (9) کرکٹ سے شاعری تک ، (10) پڑوس ، (11) ذرا ترنم سے ، (12) بلائےجان ، (13) ناصح مشفق ، (14) سالگرہ ، (15) خانہ بدوش ، (16) آخری ارمان (17) افسانۂ ما ، (18) اندلیب صاحب کے نام ، (19) بیسویں صدی ، (20) سفارش ۔

شوکتیات : -

ایم ظہیرالدین پرنٹر پبلشر نے استقلال پریس لاہور سے چھپوا کر 1951 ء میں شائع کیا ۔ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن 1954 ء میں شائع ہوا ۔ اس کتاب میں جو مضامین شامل کئے گئے ہیں ان کی ترتیب یہ ہے : (1) صدر مشاعرہ ، (2) عالی جاہ ، (3) افسانہ نگار ، (4) ماسٹر چھوٹے لال عاصم ، (5) مادری اور سوتیلی زبانیں ، (6) کالا برقعہ ، (7) ایک مکان کی ضرورت ہے ، (8) دولہا بھائی ، (9) یہ اقبالئے ، (10) کبھی کا دن بڑا کبھی کی رات ، (11) بیری اور ڈھیلے ، (12) ایک ملازم کی ضرورت ہے ، (13) فیصلہ کن قدم ، (14) روزہ چور ، (15) وکیل اور زیبِ داستان ، (16) جس محلہ میں ہے ہمارا گھر ، (17) بناسپتی شیر ، (18) پھلجھڑیاں ، (19) اقربا ہوگئے میرے آگاہ ، (20) جل ککڑی خالہ ، (21) ہندوستان میں اردو ، (22) 1957 ء کا ایک مشاعرہ ، (23) ارے (ایک تمثیل) (24) یادداشت (ایک خاکہ) یہ کتاب 240 صفحات پر مشتمل ہے ۔

سودیشی ریل اور دوسرے افسانے :-

ادارۂ فروغِ اردو لاہور نے اس کتاب کو 1951 ء میں شائع کیا ۔ حقیقت میں یہ کتاب " برے بھلے " کا دوسرا ایڈیشن ہے ۔ ادارہ فروغِ اردو کے مالک نے دوسرا ایڈیشن چھاپتے وقت اس کا نام بھی بدل دیا یہ کتاب 263 صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس میں وہی سترہ مضامین شامل ہیں جو " برے بھلے " کی فہرست میں دئیے گئے ہیں ۔

خبطی :-

یہ مجموعۂ مضامین لارک پبلشرز کراچی نے شائع کیا ہے ۔ سنِ اشاعت اس پر درج نہیں ہے ۔ 288 صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس میں بیشتر مضامین برقِ تبسّم اور دوسرے مجموعوں میں شائع ہوچکے ہیں ۔ کوئی نیا مضمون اس میں شامل نہیں کیا گیا ۔ اس کے مضامین کی فہرست یہ ہے : (1) افیونی کی جنّت ، (2) اگر میں لڑکی ہوتا ، (3) تکلّفات ، (4) اگر میں بادشاہ ہوتا ، (5) وکیل ، (6) بے روزگار
(9) اگر میں لیڈر ہوتا ، (10) زیادہ حدِّ ادب ، (11) غالبیات ،
(7) میر صاحب کا ریل کا سفر ، (8) پنشن ٪ (12) شوہر کی جنّت ، (13) شوہر یا ایڈیٹر ، (14) حادثات ، (15) بابو ، (16) برلن کا اسپتال ، (17) بوہنی میں السیٹ ، (18) اگر میں تھانیدار ہوتا ، (19) میں جانتا ہوں ، (20) سسرال ، (21) دیمک ، (22) اک نجومی ۔

الٹ پھیر :-

اقبال بک ڈپو سموسٹ اسٹریٹ ، صدر کراچی نے 1976 ء میں اس کتاب کو شائع کیا ہے اس میں وہی دس مضامین شامل کردئیے گئے ہیں جو " مجھے خرید لو " میں چھپ چکے ہیں ۔ فہرست یہ ہے : (1) بردکھوّا ، (2) کایا پلٹ ، اتوار ، (4) کون جیتا ، (5) میر صاحب کی عید ، (6) مقروض ، (7) پہلی جنوری ، (8) رات گئے ، (9) سمجھوتہ ، (10) الٹ پھیر ۔

ہم زلف :-

اس کتاب کو لارک پبلشرز ، اورنگ زیب مارکیٹ ، بندر روڈ کراچی نے جاوید پریس ، کراچی سے چھپوا کر شائع کیا ہے اس میں وہی بیس مضامین شامل ہیں جو " سیلابِ تبسّم میں شائع ہوچکے ہیں ۔

خواہ مخواہ :-

یہ مجموعۂ مضامین لارک پبلشرز نے جاوید پریس کراچی سے چھپوا کر شائع کیا ہے ۔ اس میں وہی اٹھارہ مضامین ہیں جو شوکت تھانوی کے چوتھے مجموعۂ مضامین " طوفانِ تبسّم " میں شائع ہوچکے ہیں ۔ یہ مجموعۂ مضامین 256 صفحات پر مشتمل ہے ۔

راجہ صاحب :-

میری لائبریری ، لاہور نے پہلی بار 1964 ء میں استقلال پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا ۔ اس کا دوسرا ایڈیشن 1965 ء میں چھپا ۔ یہ مضامین شوکت تھانوی نے مسٹر آر ۔ سہگل کے ہفتہ وار ہندی اخبار " کرم یوگی " کے لئے 1945 ء میں لکھے ۔ ان مضامین کو وہ اردو میں لکھتے تھے لیکن ان کو ہندی رسم الخط میں ہندی اخبار میں چھاپا جاتا تھا ۔ 1946 ء میں ان مضامین کو " راجہ صاحب " کے عنوان سے ہندی میں کتابی شکل میں چھاپا گیا ۔ شوکت تھانوی کی وفات کے بعد بیگم سعیدہ شوکت نے رضوانہ مجیب سے ان ہندی مضامین کا ترجمہ کروا کر اردو میں شائع کروایا ۔ یہ کتاب 128 صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں چودہ مضامین شامل ہیں : جن کی تفصیل یہ ہے ، (1) راجہ

(1) راجہ صاحب کی حضوری ، (2) راجہ صاحب کا شکار ، (3) راجہ صاحب کی تلوار ، (4) راجہ صاحب کا عشق ، (5) راجہ صاحب کا سفر ، (6) راجہ صاحب کا سنگ ، (7) راجہ صاحب کی سالگرہ ، (8) راجہ صاحب کی لیڈری ، (9) راجہ صاحب کی لڑکی کی شادی ، (10) راجہ صاحب کے مینجر ، (11) راجہ صاحب کی بیماری ، (12) راجہ صاحب کا خطاب ، (13) راجہ صاحب کا ادھار کھاتہ ۔ (14) راجہ صاحب کا دیوالہ ۔

ہنس مکھ اور چٹخارے :-

ان دو کتابوں کا اشتہار افسانوں کے مجموعے کی حیثیت سے نقوش لاہور شوکت نمبر کے صفحہ 622 پر دیا گیا ہے لیکن یہ کتابیں دسمبر 1984ء تک شائع نہیں ہوسکیں ۔ محمد طفیل مالک ادارہ فروغ اردو نے بتایا کہ ان کے پاس یہ کتابیں موجود ہیں جو عنقریب شائع ہو کر منظر عام پر آجائیں گی ۔

:——::——:

"ناول"

::::::::::::::::

بڑبھس :-

یہ شوکت تھانوی کے پہلے ناول کا نام ہے جس کے معنی ہیں بوالہوس یا بڑھاپے کی بے عقلی ۔ یہ ناول 1933ء میں "سرپنچ" لکھنؤ میں قسط وار شائع ہونا شروع ہوا اور 1934ء میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے اسے کتابی شکل میں شائع کیا ۔ احمد جمال پاشا لکھتے ہیں : "شوکت تھانوی کا ناول "بڑبھس" جب سرپنچ میں قسطوں میں شائع ہونا شروع ہوئی تھی تو اس کی قسطوں کا پڑھنے والوں کو بے قراری کے ساتھ انتظار رہتا تھا ۔"[1] اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا ۔ پاکستان میں پہلی مرتبہ نومبر 1961ء میں احمد برادرس کراچی نے سپر آرٹ انگریورز پریس کراچی سے چھپوا کر شائع کیا جو 189 صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس میں بوالہوس بڑے میاں کو ایک کم سن دوشیزہ سے نادیدہ محبّت ہوجاتی ہے ۔ وہ اس سے شادی رچانے پر مصر ہیں لیکن ان کی بجائے ان کے بیٹے سے اس دوشیزہ کی شادی ہوجاتی ہے۔

دل پھینک :-

1935ء میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے پہلی بار شائع ہوا ۔ اس میں ایک نواب صاحب کی عادتیں بیان کی گئی ہیں ۔ وہ ہر حسینہ پر ہر وقت قربان ہونے کے لئے تیار رہتے ہیں اور جس دوشیزہ کو دیکھتے ہیں اس کی محبّت کا دم بھرنے لگتے ہیں گویا "دل پھینک" واقع ہوئے ہیں ۔ ایک مرتبہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کے ایک گروہ نے ان کو ایک تقریب میں گھیر کر ان سے توبہ

---

[1] نقوش لاہور شوکت نمبر ، صفحہ = 593 -

کروائی - 1937ء میں صدیق بک ڈپو، امین آباد پارک لکھنؤ نے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا - 1942ء میں تیسرا ایڈیشن شائع ہوا -

سوتیاہ چاہ :-

1935ء میں ماہنامہ "حریم" لاٹوش روڈ لکھنؤ میں قسط وار چھپا جسے نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے 1936ء میں کتابی صورت میں شائع کیا - اس کا مقدمہ شوکت دلہن کے نام سے شوکت تھانوی کی پہلی بیگم سعیدہ شوکت نے لکھا مقدمہ میں وہ لکھتی ہیں : " زیرِ نظر مسلسل افسانہ "سوتیاہ چاہ" بھی شوکت صاحب سے میں نے سنا نہیں بلکہ "حریم" کے صفحات پر قسط وار میں نے دیکھا ہے اور اس افسانہ کے متعلق میرا ہمیشہ سے یہ دل چاہتا رہا کہ میں تفصیل کے ساتھ اس کے متعلق اظہارِ خیال کروں - چنانچہ جب یہ کتابی صورت میں شائع ہونے لگا اور نسیم صاحب نے مجھ سے مقدمہ کے لئے کہلوایا تو مجھ کو گویا منہ مانگی مراد ملی " اس ناول کی بنیاد اس واقعہ پر ہے کہ ایک شوہر اپنی بیوی کے اس اصرار پر کہ وہ اولاد کے لئے دوسری شادی کرلے بظاہر نہایت برہمی کے ساتھ انکار کرتا ہے اور اس کی لاعلمی میں خود اسی کی ایک سہیلی سے عقد ثانی کے انتظامات کرتا ہے اور دوسری شادی ہوجاتی ہے ان دونوں سوتوں کے درمیان نہایت محبّت کے تعلقات قائم رہتے ہیں اور وہ دونوں شوہر کو وقتاً فوقتاً بے وقوف بناتی رہتی ہیں -

سودیشی ریل :-

شوکت تھانوی نے " نیرنگِ خیال " کے سالنامہ میں چھپنے والے افسانہ کو جون 1936ء میں شوکت بک ڈپو لکھنؤ سے ناول کی شکل میں چھاپا - اس کا

دوسرا ایڈیشن 1938ء میں صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا جو 112 صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس کے دوسری طرف افسانہ " سودیشی ریل " کا انگریزی ترجمہ چھاپا گیا ہے ۔ جناب رفیع احمد خاں ایم ۔ اے ۔ علیگ نے یہ ترجمہ کیا ہے جو چودہ صفحات پر مشتمل ہے ۔

خانم خاں :-

1937ء میں صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے تنویر پریس لکھنؤ سے چھپوا کر شائع کیا جس میں پسِ چلمن حسینہ کا رومان بیان کیا گیا ہے جس نے بہت سے لوگوں کو مدتوں بے وقوف بنائے رکھا ۔ آخر میں پتہ چلا کہ اس گھر میں کوئی خاتون نہیں رہتی بلکہ ایک شخص ان عاشقوں کو بے وقوف بنا رہا ہے ۔ اس ناول کا دوسرا ایڈیشن 1938ء میں صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا ۔ پاکستان میں پہلی مرتبہ فروری 1958ء میں سلطان حسین اینڈ سنز ، بندر روڈ ، کراچی نے ادبی پریس کراچی سے چھپوا کر شائع کیا جو 160 صفحات پر مشتمل ہے ۔

معمہ خاتون :-

1938ء میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے تنویر پریس لکھنؤ سے چھپوا کر شائع کیا ۔ اس ناول میں ایک ایسے شوہر کو موضوع بنایا گیا ہے جو اپنی بیوی کی قابلیت کا ڈنکا بجانے کے لئے خود اس کے نام سے مضامین ، افسانے اور شاعری ملک کے معروف رسائل میں شائع کرواتا ہے ۔ بیگم صاحبہ کو رسائل میں چھپنے والی چیزوں کا علم نہیں ہوتا اور اس طرح یہ پول کھل جاتا ہے ۔ اس ناول کا چوتھا ایڈیشن نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے 1953ء میں شائع ہوا ۔

ڈھونگ :-

1940 ء میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے اسے شائع کیا ۔ اس کے بعد مئی 1947 ء میں اس ناول کو دیال پرنٹنگ پریس دلّی نے باہتمام منشی گلیشر خاں چھاپ کر ہندوستانی پبلشرز نے شعبۂ اردو نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلیکیشنز لمیٹڈ (بمبئی) کے لئے شائع کیا ۔ یہ ناول 222 صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس ناول کی ہیروئین " ناہید " کو شعر و شاعری سے دلچسپی اور بذلہ سنجی میں کمال حاصل ہے وہ اپنی محبّت کو ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ جس کی وجہ سے اس ناول کے ہیرو نے اپنے دوستوں کی مدد سے ایک ڈھونگ رچانے کی کوشش کی اور ناہید کو چاروں شانے چت کردیا ۔

بکواس :-

1943 ء میں ایم ظہیرالدین پرنٹر پبلشر نے استقلال پریس لاہور سے چھپوا کر اردو بکستال لاہور سے شائع کیا اس ناول کے 255 صفحات ہیں ۔ اس ناول میں " نجمہ " مذہبی اور " جمال " ولایت پاس اور مذہب سے بیگانہ ہے ۔ پورے ناول میں " اسلام " اور " سوشلزم " کی بحث ہے ۔ آخیر میں " جمال " کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوجاتا ہے اور اس طرح جیت اسلام کی ہوتی ہے ۔ یہ ناول شوکت تھانوی کا نظریۂ حیات کو ظاہر کرتا ہے ۔ قارئین نے اس کتاب کو اتنا پسند کیا کہ جولائی 1954 ء تک اس کتاب کے نو ایڈیشن شائع ہو چکے تھے ۔ بھارت میں اس ناول کو سلطان بک ڈپو دہلی نے شائع کیا جس کے 184 صفحات ہیں ۔

بیوی : -

1945 ء میں ادارہ فروغ اردو لاہور نے نیشنل لٹریچر کمپنی لاہور کے تعاون سے شائع کیا - اس کی پرنٹ لائن پر یہ الفاظ درج ہیں " لالہ گوپال داس مالک نیشنل لٹریچر کمپنی لاہور نے اتحاد پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا " یہ کتاب شوکت تھانوی نے محمد طفیل ، مالک ادارہ فروغ اردو لاہور کو ایک رات میں لکھوائی تھی - کتب خانہ علم و ادب کراچی نے اس ناول کو پہلی بار 1946 ء میں شائع کیا اور 1951 ء میں اس کا پانچواں ایڈیشن نکلا - اس ناول میں مشرقی بیوی کو موضوع بنایا گیا ہے - وہ یہ چاہتی ہیں کہ شوہر دفتر سے سیدھے گھر واپس آجایا کریں - دوستوں کی محفل اور کلب کی سرگرمیوں کو وہ پسند نہیں کرتیں - بعض شوہر جب ان کی بات تسلیم نہیں کرتے اور وہ پانی کو سر سے اونچا ہوتے ہوئے دیکھتی ہیں تو مجبوراً شوہر کی خواہش کے مطابق زندگی بسر کرنا شروع کردیتی ہیں -

کتیا : -

یکم جنوری 1946 ء کو محمد طفیل مالک ادارہ فروغ اردو لاہور نے پی - آر - بی - ایس - پریس لاہور سے چھپوا کر پہلی مرتبہ شائع کیا - اس ناول میں کیپٹن اعجاز کو ناکام و نامراد عاشق کے طور پر پیش کیا گیا ہے - شہناز نے سیکنڈل کے طور پر اس سے محبّت کرنا شروع کی اور بعد میں پروگرام کے مطابق راہِ فرار اختیار کرلی تو کپتان صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے - یہ ناول 296 صفحات پر مشتمل ہے - اکرام اکبر کاتب نے 19 ، دسمبر 1945 ء کو اس کی کتابت مکمل کی - اس کتاب کو کتب خانہ علم و ادب کراچی نمبر 1 نے بھی شائع

کیا اور بھارت میں خالد بک ڈپو ، لکھنؤ نے 1951 ء میں شائع کیا ۔

انشاء اللہ :-

یہ ناول 3 ، مئی 1946 ء کو ادارہ فروغِ اردو لاہور نے نیشنل لٹریچر کمپنی کے تعاون سے شائع کیا ۔ اس کی پرنٹ لائن اس طرح ہے " گوپال داس مالک نیشنل لٹریچر کمپنی نے مرکنٹائل پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا ۔" یہ ناول 247 صفحات پر مشتمل ہے اس ناول میں شوکت تھانوی نے ایک معاشرتی مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اولاد کی شادی کے موقع پر میاں بیوی میں اکثر لڑائی ہوتی ہے ۔ میاں اپنے رشتہ داروں کو ترجیح دیتا ہے جبکہ بیوی کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ بیٹے کی شادی اس کے رشتہ داروں میں ہو اس ناول میں شکیل اور بنّو میاں میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن بیگم صاحبہ نے اپنا رشتہ دار ہونے کی وجہ سے بنّو میاں کو شکیل پر ترجیح دی ۔ اس ناول کو کتب خانہ علم و ادب کراچی نے بھی شائع کیا جس کے 221 صفحات ہیں ۔ بھارت میں اس کتاب کو حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے 1952 ء میں شائع کیا ۔

کارشون :-

شوکت تھانوی کا یہ ناول پہلی مرتبہ اپریل 1947 ء کو عنایت حسین مینجر کوہ نور بک ڈپو نے مرکنٹائل پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا ۔ ادارہ فروغ اردو لاہور کے مالک محمد طفیل کا کہنا ہے کہ اس زمانے میں ہر آدمی کو کتابیں چھاپنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی ۔ صرف رجسٹرڈ پبلشرز ہی کتابیں چھاپ سکتے تھے ۔ یہ ناول حقیقت میں ادارہ فروغِ اردو نے شائع کیا لیکن پرنٹ لائن پر عنایت حسین مینجر کوہِ نور بک ڈپو کا نام آیا چونکہ انہیں کتابیں چھاپنے کی

اجازت تھی ۔ اس طرح یہ کتاب ادارہ فروغ اردو نے کوہ نور بک ڈپو کے اشتراک سے شائع کی ۔ یہ ناول 336 صفحات پر مشتمل ہے ۔ 1950 ء میں اسے مکتبۂ اردو لکھنؤ نے بھی شائع کیا ۔ جس کے 256 صفحات ہیں ۔

جوڑ توڑ :-

یہ ناول جون 1947 ء میں پہلی مرتبہ پبلشر محمد طفیل ، ادارہ فروغِ اردو لاہور نے سویرا آرٹ پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا ۔ یہ ناول 360 صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس ناول کا ہیرو محبوب اپنی چالاکیوں کے باعث شریف اور عزت دار لوگوں کی چھوٹی چھوٹی کمزوریاں پکڑ کر ان کو بلیک میل کر کے ہزاروں روپے کماتا ہے ۔ محبوب صاحب نے تمام دنیا کو دھوکہ دیا لیکن اپنے صاحبزادے شکیل میاں سے مات کھا گئے اور شکیل نے اپنے والد کے منصوبے پر پانی پھیر دیا ۔ اس ناول کو کراچی میں کتب خانہ علم و ادب نے بھی شائع کیا ہے ۔

غزالہ :-

محمد طفیل مالک ادارہ فروغِ اردو ایبک روڈ لاہور نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کی ، اس کتاب کے تیسرے ایڈیشن پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے لیکن سنِ اشاعت تحریر نہیں کیا گیا ۔ محمد طفیل صاحب نے اپنے انٹرویو میں اس کا سنِ اشاعت اگست 1947 ء بتایا ہے ۔ غزالہ لکھنؤ کے نواب فلک رفعت کی اکلوتی بیٹی ہے ۔ ان کے یہاں اچانک آگ لگ جاتی ہے اور غزالہ کو آگ کے شعلوں میں سے نکالنا مشکل نظر آ رہا ہے کہ پڑوس میں رہنے والا ایم ۔ اے کا طالب علم " نسیم " غزالہ کو اس آگ سے نکالنے میں کامیاب ہوجاتا ہے ۔ نواب فلک رفعت اس کے اس احسان کے بدلہ " غزالہ کی شادی " نسیم " سے کردیتے

ہیں۔ یہ ناول 544 صفحات پر مشتمل ہے۔

سسرال :-

ادارہ فروغ اردو ، لاہور نے پہلی مرتبہ 1948ء میں سویرا پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔ یہ ناول 192 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا انتساب یہ ہے " ان پاکستانیوں کے نام جن کی بیویاں اور سسرالیں ہندوستان میں ہیں۔" اس ناول کا موضوع اس انتساب کے گرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے۔ شفقت (ہیرو) لاہور کے ایک کالج میں پروفیسر ہے جبکہ اس کی بیوی بلقیس اور بیٹا فردوس دہلی میں سکونت پذیر ہیں۔ ایسے حالات میں معاشی مسائل اور معاشرتی مشکلات کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ مصنّف نے ان مسائل کا جا بجا تذکرہ کیا ہے۔ اس ناول کو کتب خانہ علم و ادب کراچی نے 1950ء میں شائع کیا ہے۔ اور اس کا تیسرا ایڈیشن 1955ء میں شائع ہوا۔

چار سو بیس :-

اقبال بک ڈپو سمرسٹ اسٹریٹ ، صدر کراچی نے 1949ء میں شائع کیا۔ 1953ء تک اس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوچکا تھا۔ اس کتاب کو کتب خانہ علم و ادب کراچی نے بھی شائع کیا ہے۔ اس کا چوتھا ایڈیشن 1961ء میں ضیاء پریس کراچی سے چھپا۔ یہ ایڈیشن ہماری نظر سے گذرا ہے اس کے 288 صفحات ہیں۔ ناول کا نام دیکھتے ہی یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی چار سو بیس شخص کے " کارنامے " اس میں بیان ہوں گے۔ لیکن یہاں ایسا نہیں ہے۔ " ناہید " تیز و طرار اور ادبی ذوق رکھنے والی لڑکی ہے جو " مسعود " سے محبت تو کرتی ہے لیکن ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ دوستوں اور سہیلیوں نے اس کے خلاف سازش

تیار کی اور بالآخر ناہید کو محبت کا اقرار کرنا پڑا ۔

بقراط :-

محمد طفیل پرنٹر و پبلشر نے پی ۔ آر ۔ بی ۔ایس پریس سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اردو لاہور سے جنوری 1950 ء میں شائع کیا ۔ یہ ناول 123 صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس کا انتساب یہ ہے " ڈاکٹر سیّد ممتاز حسین کے نام ۔ بقراط حکیم تھا یہ ڈاکٹر ہیں ۔ اگر اس ڈاکٹر نے میرا علاج نہ کیا ہوتا تو میں یہ کتاب نہ لکھ سکتا " اس ناول میں مرزا صاحب حکمت کی ابتدائی معلومات بھی نہیں رکھتے لیکن ہر وقت حکیم بقراط بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں شوکت تھانوی نے اپنے مخصوص انداز میں ان کے واقعات بیان کر کے انہیں ہر فن مولا بنانے کی کوشش کی ہے ۔

سپنے :-

ایم ظہیر الدین پرنٹر پبلشر نے استقلال پریس لاہور سے چھپوا کر اردو بکسٹال لاہور سے پہلی مرتبہ اگست 1950 ء میں شائع کیا ۔ اپریل 1952 ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا ۔ یہ ناول 248 صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس ناول میں مصنّف نے اپنے مخصوص انداز میں میر صاحب کا کردار پیش کر کے زندگی کے مختلف زاویوں کو اس طرح دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ زندگی بجائے خود کامیڈی نظر آنے لگتی ہے ۔ مزاحیہ انداز کے ساتھ ساتھ انہوں نے سنجیدہ پاکستانی مسائل بھی پیش کئے ہیں ۔ وہ تعمیری دور میں بے عملی کو پسند نہیں کرتے ۔

سانچ کو آنچ :-

سانچ کو آنچ کے نام سے شوکت تھانوی نے پہلے ایک افسانہ لکھا جو نقوش لاہور کے شمارہ نمبر 15 ، 16 ، 1950 ء میں شائع ہوا ۔ پھر اس افسانے کو بڑھا کر ناول بنا دیا ۔ یہ ناول پہلی مرتبہ ادارہ فروغ اردو لاہور سے 1954 ء میں شائع ہوا جو 287 صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس کا انتساب یوں ہے " اپنی بھتیجی زرینہ سلمان کے جہیز میں " ۔ بھارت میں یہ کتاب سردار پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ نے شائع کی ۔

بیگم صاحبہ :-

1955 ء میں پہلی بار شمع بک ڈپو ، شاہ عالم گیٹ ، لاہور نے علمی پرنٹنگ پریس لاہور میں فوٹو آفسٹ کے ذریعے چھاپ کر شائع کیا اس کا دوسرا ایڈیشن جنوری 1963 ء میں شائع کیا گیا ۔ یہ ناول 184 صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس ناول کا موضوع یہ ہے کہ نواب صاحب کا انتقال ہوگیا تو بیگم صاحبہ تنہا رہ گئیں ۔ دولت کی وجہ سے بہت لوگوں نے ان سے شادی کرنا چاہی لیکن بیگم صاحبہ کو معلوم تھا کہ یہ سب لوگ ان کی بجائے ان کی دوست میں دلچسپی رکھتے ہیں اس لئے انہوں نے دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ۔ اس ناول کا انتساب بہت دلچسپ ہے " اقربا پروری کے اس دور میں اپنے نام ـــ شوکت تھانوی "

داماد :-

1956 ء میں پہلی مرتبہ شمع بک ڈپو ، شاہ عالم گیٹ ، لاہور نے علمی پرنٹنگ پریس لاہور میں فوٹو آفسٹ کے ذریعے چھاپ کر شائع کیا ۔ اس ناول

کا دوسرا ایڈیشن جنوری 1963 ء میں چھاپا گیا ۔ یہ ناول 127 صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس ناول میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اہلِ ثروت ہر چیز کو دولت سے خریدنے کی کوشش کرتے ہیں حتی کہ اپنی بیٹی کا رشتہ بھی کسی ایسے شخص سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں جسے گھر داماد بنایا جاسکے ۔ مسعود کے والد کا انتقال ہوگیا تو نواب ممتاز الدولہ نے اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اس لئے قبول کرلی تا کہ بعد میں وہ اپنی اکلوتی بیٹی نیّر سے اس کی شادی کرسکیں ۔

پگلی :-

شوکت تھانوی کے اچھے ناولوں میں اس کا شمار کیا جاسکتا ہے ۔ اسے ایم ۔ آر ۔ خاں چودھری نے ضیا برقی پریس کراچی سے چھپوا کر لارک پبلشرز ، جہانگیر روڈ ، کراچی نمبر 5 سے شائع کیا ۔ اس کا انتساب یہ ہے " اپنی بیوی زہرہ شوکت کے نام ، جو پگلی نہیں ہیں " اس کتاب پر سنِ اشاعت درج نہیں کیا گیا ۔ اس ناول میں گل رخ کے والد حکیم صاحب پرانی روایات اور اقدار پر خود بھی سختی سے عمل کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی اس کی توقع کرتے ہیں ۔ وہ پسند کی شادی کو غیر شریفانہ فعل سمجھتے ہیں ۔ وہ اپنی بیٹی گل رخ کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کردیتے ہیں تو اس کا دماغی توازن خراب ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے مصنّف کو یہ نتیجہ نکالنا پڑا کہ دنیا کی ہر کشش سے زیادہ ہم خیالی کی کشش ہوتی ہے ۔

نیلوفر :-

ہماری نظر سے اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن گذرا ہے جس پر لکھا ہے

" محمد طفیل پرنٹر و پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کی ۔"

ہندوستان میں اس کتاب کی طباعت کی اجازت آزاد بک ڈپو امرتسر کو دی گئی ۔ اس

کتاب پر سنِ اشاعت درج نہیں ہے ۔ ادارہ فروغ اردو کا ریکارڈ بھی اس سلسلہ میں خاموش ہے ۔ اس ناول کا موضوع " غزالہ " کے موضوع سے کافی حد تک ملتا ہے ۔ اس ناول میں ڈاکٹر لطیفی کی اکلوتی بیٹی نیلوفر کو ڈاکو اٹھا کر لیے جا رہے تھے تو " شہاب " ان ڈاکوؤں کا مقابلہ کر کے نیلوفر کو ان سے چھڑانے میں کامیاب ہوجاتا ہے ۔ ڈاکٹر لطیفی شہاب کو اپنے گھر لے آئے اور نیلوفر سے شادی کر دی ۔ یہ ناول 504 صفحات پر مشتمل ہے ۔ اسے آزاد بک ڈپو امرتسر نے بھی شائع کیا ہے جس کے 464 صفحات ہیں ۔

مولانا :-

یہ ناول ادارہ فروغِ اردو ، لاہور نے شائع کیا ۔ اس کا سن اشاعت معلوم نہیں ہوسکا ۔ اس کا انتساب " مولانا عبد المجید سالک کے نام ، جنھوں نے مجھ کو کچھ نہیں سکھایا اور جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا ۔" اس ناول کا موضوع یہ ہے کہ اعلیٰ مرتبہ پر فائز لوگ مذہب سے بیگانگی اختیار کرتے چلے جاتے ہیں ۔ شہاب ایک کالج میں لیکچرار ہیں وہ جج صاحب کے یہاں گئے تو حسبِ عادت وہاں بھی نماز پڑھی اور اس نماز کی بدولت جج صاحب کے یہاں سب نے انہیں مولانا کہنا شروع کر دیا ۔ یہ ناول 271 صفحات پر مشتمل ہے ۔

خدا نخواستہ :-

یہ ناول ادارہ فروغِ اردو ، لاہور نے انشا پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا ۔ سنِ اشاعت کتاب پر درج نہیں ہے ۔ شوکت تھانوی نے " اپنی بات " میں اس کے موضوع کے بارے میں وضاحت کی ہے " 1939 ء میں ریڈیو کے لئے میں نے ایک ڈرامہ لکھا تھا " کایا پلٹ " روح اس ڈرامہ کی یہی تھی کہ اگر

عورتیں پردہ کے باہر آ جائیں اور مرد پردہ نشین ہوجائیں تو کیا ہو ؟" اس ناول کا موضوع اسی مرکزی خیال کے گرد گھومتا ہے - اس ناول میں موازنہ اور صورت واقعہ کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے - اس ناول کو کتب خانہ علم و ادب کراچی نے بھی شائع کیا ہے -

بھابی :-

یہ شوکت تھانوی کا ان کی زندگی میں چھپنے والا آخری ناول ہے - جسے ادارہ اردو لاہور نے پہلی مرتبہ دسمبر 1959ء میں شائع کیا - یہ ناول 324 صفحات پر مشتمل ہے - کتب خانہ علم و ادب کراچی نے اسے 1950ء میں شائع کیا اور ادارہ فروغ اردو لاہور نے اس ناول کا دوسرا ایڈیشن 1963ء میں نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا جس کے 290 صفحات ہیں - ریاض اور شہاب بچپن کے دوست ہیں - شہاب ریاض کو طالب علمی کے زمانہ سے ہی بھائی کہتا ہے اس کا کہنا ہے کہ ان " بھائی صاحب " کو " بھابیاں " بدلنے کا بہت شوق ہے - موصوف تین شادیاں کر چکے ہیں - شوکت تھانوی کا یہ ایک معاشرتی ناول ہے - جس میں بار بار شادی کرنے کے اثرات مزاحیہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں -

بہروپیا :-

یہ ناول لارک پبلشرز ، اورنگ زیب مارکیٹ بندر روڈ - کراچی نے شائع کیا ہے - اس پر سنِ اشاعت درج نہیں ہے - یہ ناول 112 صفحات پر مشتمل ہے - یہ ناول شوکت تھانوی کے انتقال کے کافی عرصہ بعد شائع ہوا - اس ناول کی زبان اور اسلوب بیان سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شوکت تھانوی کی تحریر کردہ کتاب نہیں ہے -

پہلی بیگم :-

لارک پبلشرز ، کراچی کی شائع شدہ فہرست میں اس ناول کا نام بھی شامل ہے - کوشش کے باوجود لاہور ، راولپنڈی اور کراچی کی کسی لائبریری سے یا کسی بک سیلر سے ہمیں یہ کتاب دستیاب نہیں ہوئی -

رعنا :-

یہ شوکت تھانوی کے ایک غیر مطبوعہ ناول کا نام ہے جس کے صرف دو باب محمد طفیل مدیرِ نقوش نے نقوش لاہور کے شوکت نمبر میں صفحہ 145 تا 150 چھاپ دئیے ہیں - یہ ناول محمد طفیل مالک ادارہ فروغِ اردو لاہور چھاپنے کا ارادہ رکھتے ہیں -

نواب صاحب :-

نقوش لاہور شوکت نمبر کے آخری صفحہ پر اس ناول کا اشتہار ہے - محمد طفیل صاحب مدیرِ نقوش نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ شوکت تھانوی کا یہ نامکمل ناول ہے اس لئے شائع نہیں ہوسکا - ان کا ارادہ ہے کہ اسے اسی حالت میں کچھ ضروری کاموں سے فارغ ہونے کے بعد شائع کردیں -

مسٹر - 58 :-

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے کیٹلاگ میں شوکت تھانوی کی تصانیف میں اس کتاب کا نام ناول کی حیثیت سے شامل ہے - جسے گوشۂ ادب لاہور نے شائع کیا ہے - لائبریری سے یہ کتاب گم ہوچکی ہے - بازار سے تلاش کرنے کے باوجود یہ کتاب نہیں مل سکی -

* * *

" ڈراما "

منشی جی :-

یہ کتاب شوکت تھانوی کے گیارہ ریڈیو ڈراموں پر مشتمل ہے جسے مولوی محمد صدیق پبلشر نے بہ اہتمام سیّد توسل حسین یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ میں چھپوا کر صدیق بک ڈپو لکھنؤ سے 1939ء میں شائع کیا ۔ اس کا مقدمہ خواجہ حسن نظامی نے " پیر جی نے بسم اللہ پڑھائی " کے عنوان کے تحت تحریر کیا ہے ۔ یہ کتاب 183 صفحات پر مشتمل ہے جس کے موضوعات یہ ہوں : (1) منشی جی نے کہانی کہی ، (2) منشی جی نے چاء بنائی ، (3) منشی جی نے خط لکھا ، (4) منشی جی نے دوا پی ، (5) منشی جی نے صفائی کی ، (6) منشی جی نے تصویر کھنچوائی ، (7) منشی جی سودا لائے ، (8) منشی جی نے سبق پڑھایا ، (9) منشی جی نے سفر کیا ، (10) منشی جی نوکر ہو گئے ، (11) منشی جی نے مکان بدلا + پاکستان میں سلطان حسین اینڈ سنز ، کراچی نے آدمی پریس کراچی سے چھپوا کر شائع کیا جو 184 صفحات پر مشتمل ہے ۔

سنی سنائی :-

یہ بارہ ریڈیائی تمثیلوں کا مجموعہ ہے جسے پریم چند اگروال پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر الائیڈ ٹریڈرز لمیٹڈ لاہور سے 1943ء میں شائع کیا ۔ یہ کتاب 204 صفحات پر مشتمل ہے جس کے موضوعات یہ ہیں : (1) نہیں مگر ہاں ، (2) برلن کا اسپتال ، (3) لاٹری کا ٹکٹ ، (4) سچ ، (5) لاڈلا بیٹا تھا اک ماں باپ کا ، (6) زندگی بنام زندہ دلی ، (7) خدا حافظ ، (8) جھوٹا خواب ، (9) پارٹی کے بعد ، (10) ملازمہ کی تلاش ، (11) انتیس کا چاند ، (12) سالگرہ ۔

غالب کے ڈرامے :-

محمد طفیل پرنٹر و پبلشر نے سویرا آرٹ پریس لاہور سے چھپوا کر 1951ء میں شائع کی ۔ یہ کتاب 224 صفحات پر مشتمل ہے اس کا انتساب یہ ہے " اپنی ننھی سی بچی شوکیہ کے نام ، جس کو میں غالب کے اشعار کی طرح مرغوب ، مگر غور طلب سمجھتا ہوں " ۔ اس کتاب میں غالب کے جن اشعار کو موضوعِ ڈراما بنایا گیا ہے ان کی تفصیلات ڈراما نگاری کے باب میں پیش کی جا رہی ہیں ۔

قاضی جی :-

جلد اوّل ، جلد دوم ، جلد سوم

ادارہ فروغ اردو لاہور نے قاضی جی جلد اوّل 1948ء میں جلد دوم 1949ء میں اور جلد سوم 1950ء میں شائع کی ۔ جلد اوّل کے 255 ، جلد دوم کے 256 اور جلد سوم کے 255 صفحات ہیں ۔ ریڈیو ڈراموں کی تعداد جلد اوّل میں 24 جلد دوم میں 20 اور جلد سوم میں 19 ہے ۔ اس طرح تریسٹھ ڈرامے ان تینوں جلدوں میں محفوظ ہیں ۔

قاجی جی :- (حصّہ چہارم)

غیر مطبوعہ اردو ریڈیو ڈرامے محمد طفیل مالک ادارۂ فروغ اردو لاہور کے پاس محفوظ ہیں جنہیں وہ قاضی جی حصّہ چہارم کی شکل میں چھاپنے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔

کھی کھی :-

یہ گیارہ ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ ہے جسے شوکت تھانوی کے انتقال کے بعد 1964ء میں محمد طفیل مالک ادارہ فروغ اردو لاہور نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔ جو 238 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے موضوعات یہ ہیں: (1) پہلی تاریخ، (2) پارٹی کے بعد، (3) تین سو چھیاسٹھ، (4) دربار، (5) جہاں پناہ، (5) آم اور جامن، (7) نقش و نگار (8) مرقّع، (9) وہمی، (10) ڈاکٹر صاحب۔ (11) دو رُخ۔

" شاعری "

گہرستان :-

شوکت تھانوی نے یہ مجموعۂ کلام شوکت بک ڈپو لکھنؤ سے خود چھاپا ہے اس کا مقدمہ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے تحریر کیا ہے۔ یہ مجموعۂ کلام 1934ء میں شائع ہوا جو 208 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کلام میں 93 غزلیں، دو نعتیں اور دو نظمیں شامل ہیں۔

گہرستان کے بعد :-

یہ قلمی نسخہ خورشید شوکت کی لائیبریری میں محفوظ ہے۔ جس میں " گہرستان " کے بعد کی صرف 22 غزلیں لکھی ہوئی ہیں۔ جو 16 صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔

:——::——:

"آپ بیتی"

مابدولت :۔

یکم دسمبر 1945ء کو محمد طفیل مالک ادارہ فروغِ اردو نے تعلیمی پرنٹنگ پریس، بیرون اکبری دروازہ، لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔ جو 256 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شوکت تھانوی کے منجھلے بیٹے خورشید شوکت کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ ہمارے پاس اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن ہے جو نقوش پریس لاہور سے چھپا۔ یہ 240 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ شوکت تھانوی کی آپ بیتی ہے جس میں انہوں نے پیدائش، تعلیم، شاعری، مضمون نگاری، والد کی وفات، صحافت اور ریڈیو لکھنؤ کی ملازمت تک کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔

کچھ یادیں کچھ باتیں :۔

محمد طفیل مالک ادارہ فروغِ اردو لاہور نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر شوکت تھانوی کی وفات کے بعد 1964ء میں پہلی مرتبہ شائع کی۔ "کچھ یادیں کچھ باتیں" کے نام سے شوکت تھانوی نے روزنامہ "جنگ" راولپنڈی میں ایک کالم شروع کیا تھا جس میں وہ اپنی گذری ہوئی زندگی کے واقعات لکھا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ شوکت تھانوی کا انتقال ہوگیا۔ اس میں بھی وہی واقعات بیان ہوئے ہیں جو "مابدولت" میں بیان ہو چکے تھے۔ یہ کتاب 168 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں شاعری، والد کا انتقال، صحافت اور سودیشی ریل وبالِ جان کے موضوعات پر تفصیل سے لکھا ہے۔

: ——— :: ——— :

"خاکے"

شیش محل :-

1943ء میں ایم ظہیر الدین پرنٹر پبلشر نے استقلال پریس لاہور سے چھپوا کر اردو بک اسٹال لوہاری دروازہ لاہور سے شائع کیا۔ جو 240 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک سو بارہ (112) شخصیتوں کے مختصر خاکے پیش کئے گئے ہیں۔

قاعدہ بے قاعدہ :-

یہ کتابچہ محمد طفیل پرنٹر و پبلشر نے فردوس پریس (شاہ عالمی) لاہور سے چھپوا کر شائع کیا اس کا پہلا ایڈیشن ہمارے پاس موجود ہے لیکن اس پر سنِ اشاعت درج نہیں ہے۔ یہ 118 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں امتیاز علی تاج، میاں بشیر احمد، احمد شاہ پطرس بخاری صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم، میراجی، جوش ملیح آبادی، عبدالرحمٰن چغتائی، حفیظ ہوشیارپوری، خدیجہ مستور، خواجہ دل محمد، ذوالفقار بخاری، رشید احمد صدیقی، زہرہ نگاہ، سعادت حسن منٹو، شوکت تھانوی، صلاح الدین احمد، ضیا جالندھری، محمد طفیل، ظفر علی خاں، مولوی عبدالحق، غلام عباس، فراق گورکھپوری، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، ل۔ احمد، مجنوں گورکھپوری، ن۔ م راشد، وقار عظیم، ہاجرہ مسرور، حکیم یوسف حسن، مرزا یاس یگانہ کے خاکے ہیں۔

: —— : : —— :

" متفرقات "

بار خاطر :-

1956ء میں محمد طفیل پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کی ۔ یہ شوکت تھانوی کے خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی " غبارِ خاطر " کی پیروڈی کے طور پر لکھے ہیں ۔ یہ خطوط رسالہ نقوش لاہور میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ۔ یہ کتاب 311 صفحات پر مشتمل ہے اور یہ خطوط اڑتالیس شخصیتوں کے نام لکھے گئے ہیں ۔

گولر کا پھول :-

شوکت تھانوی نے بچوں کے لئے یہ کتاب تحریر کی ہے ۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز ، پبلشرز ، ادبی مارکیٹ ، چوک انارکلی ، لاہور نے شائع کی ۔ یہ کتاب 127 صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں بچوں کے لئے اکیس کہانیاں ہیں ۔ ان کہانیوں کے عنوانات یہ ہیں :- (1) پہلا بول ، (2) سوتے جاگتے ، (3) فیشن ایبل پرستان ، (4) پرستان کا شہزادہ سہیل ، (5) پرستان کا جلوس ، (6) پریوں کے جھرمٹ میں ، (7) عجائبات ، (8) مادام نیلی ، (9) ملکہ کی دعوت ، (10) فوجی پریڈ ، (11) اعلی حضرت شاہ پری زاد ، (12) شیشے کی گاڑی ، (13) پرستان کی فلم ، (14) اڑن قالین ، (15) شرموز کی سیر ، (16) عجیب و غریب ضیافت ، (17) بزرگ قُولو ، (18) تُورا تُوری ، (19) دادا جان ، (20) شاہِ شینام ، (21) بلورستان میں ، جب آنکھ کھلی ۔

شیطان کی ڈائری :-

نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے اسے 1942ء میں شائع کیا ۔ یہ 128 صفحات پر مشتمل ہے جس میں شیطان کے کئی روپ دکھائے گئے ہیں ۔ اس کتاب میں سولہ قصّوں کو ڈائری کی مناسبت سے سولہ ورق کہا گیا ہے ۔ ہر ورق پر شیطان ایک نئی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے ۔ شوکت تھانوی کے مخصوص مزاحیہ انداز نے ان قصّوں میں دلکشی پیدا کردی ہے ۔

پہاڑ تلے :-

یہ روزنامہ جنگ راولپنڈی میں چھپنے والے شوکت تھانوی کے مزاحیہ کالم کا نام ہے ۔ محمد طفیل مالک ادارہ فروغ اردو اسے کتابی شکل میں چھاپنے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ دسمبر 1984ء تک یہ کتاب شائع ہو کر منظر عام پر نہیں آ سکی ۔

: ——— : : ——— :

تیسرا باب

شاعری

شوکت تھانوی نے غزل بھی کہی اور نظم بھی - انہوں نے سنجیدہ شاعری بھی کی اور مزاحیہ شاعری بھی - شوکت تھانوی میں شعری ذوق پیدا کرنے کا سہرا ارشد تھانوی کے سر ہے جو پہلے پہل شوکت تھانوی کی طرف سے نظمیں اور مضامین لکھ کر بچوں کے رسالوں " پھول " اور عزیز " میں چھپوایا کرتے تھے - شوکت تھانوی جب یہ نظمیں اور مضامین اپنے نام سے چھپے ہوئے دیکھتے تو بے انتہا خوش ہوتے - کچھ بڑے ہوئے تو شعر کہنے کی کوشش کرنے لگے - رسالوں میں چھپنے کی وجہ سے ان کی شہرت بحیثیت شاعر ہونے لگی تو ارشد تھانوی کی غزلیں مشاعروں میں پڑھنے لگے - مولانا ارشد تھانوی اس واقعہ کو اپنے ایک مضمون میں اس طرح بیان کرتے ہیں : " جب پہلے پہل انہوں نے اخبار " پھول " میں اپنا نام چھپا ہوا دیکھا اور مجھ سے مزید فرمائشیں کیں ، علاوہ " پھول " اخبار کے بچوں کے ایک ماہانہ پرچے " عزیز "، میں ان کی طرف سے ہلکی پھلکی نظمیں چھپوائیں - اس سے ان کی تشنگیٔ شوق میں اور اضافہ ہوا اور جذبۂ شہرت پسندی اندر ہی اندر نشو ونما پاتا اور اضافۂ عمر کے ساتھ مختلف طریقوں سے اس کا اظہار ہوتا رہا جیسا کہ اپنی لکھی ہوئی " کچھ یادوں کچھ باتوں " میں انہوں نے خود بھی لکھا - وہ میری غزلیں اپنا تخلص لگا کر شاعروں میں پڑھتے رہے - میں نے جب پہلے پہل ان کا تخلص شوکت سنا تو کہا کہ تم نے اپنی ممانی جان کا نام کیوں چرالیا ؟ (ان کی حقیقی ممانی جو ساتھ ہی رہتی تھیں ان کا نام شوکت جہاں ہے) تو میاں محمد عمر المتخلص بہ شوکت نے بتایا کہ ایک تو ارشد کے وزن پر ہے - بآسانی آپ کا

مقطع شوکت کا مقطع بن جاتا ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ علی برادران کی اعلیٰ شخصیتوں سے نسبت دینا چاہتا تھا ۔ مولانا محمد علی کے نام سے تو تخلص بنایا نہیں جا سکتا مولانا شوکت علی کے نام سے مدد لی ہے ۔ یہ عقیدت اس درجہ تھی کہ کافی عرصہ کے بعد میری اور اپنی تصویر امین سلونوی کے رسالہ میں ساتھ ساتھ اس لئے چھپوائی کہ اس کے نیچے علی برادران کے اتباع میں " تھانوی برادران " لکھ سکیں اور عرصہ تک لکھنو کے ایک حلقۂ احباب میں ہمیں تھانوی برادران ہی کہا جاتا رہا ۔ "[1]

شوکت تھانوی نے کبھی اس بات کو چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ ابتداء میں ارشد تھانوی کی غزلیں اپنے نام سے پڑھتے تھے " مابدولت " میں بھی انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے اور " کچھ یادیں کچھ باتیں " میں بھی ـــــ وہ لکھتے ہیں ۔

" بھائی جان کی شاعرانہ عظمت کا میں کچھ ایسا قائل تھا کہ خود اپنے کو بھی شاعر بنائے بغیر نہ رہ سکا ۔ شروع شروع میں تو شاعری کی بھی " پرائیویٹ پریکٹس " کرتا رہا ۔ جس میں چوری اور سینہ زوری دونوں کو دخل تھا کہ ان ہی بھائی جان کا کلام نقل کر کرکے اپنے دوستوں میں لے جاتا تھا اور ان کے تخلص کی جگہ اپنا تخلص فٹ کرکے اپنے دوستوں کو وہ کلام لہک لہک کر سناتا تھا ۔ اس سے قبل کہ میں کچھ اور عرض کروں ۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے تخلص والی بات نہ رہ جائے کہ میں نے شوکت تخلص کیوں رکھا ۔ بات یہ ہے کہ جس زمانہ میں ، میں شاعر بن رہا تھا علی برادران اور مہاتما گاندھی

---

[1] ارشد تھانوی ، نقوش لاہور ، شوکت نمبر (شوکت سلمہ جواب مرحوم و مغفور ہوگیا) ص: 440 ۔

کا بڑا شہرہ تھا ۔ اب یا تو میں اپنا تخلص گاندھی رکھ سکتا تھا ، ورنہ علی برادران میں سے کسی کا نام اپنے تخلص کے لئے منتخب کرسکتا تھا ۔ مولانا محمد علی کے نام کے دونوں اجزا مجھے تخلص کے لئے کچھ مناسب نہیں معلوم ہوئے البتہ مولانا شوکت علی کا شوکت میرے دل میں اتر گیا ۔ پھر اس تخلص کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ بھائی کا تخلص ارشد ہٹا کر اس شوکت کو نہایت آسانی سے فٹ کیا جاسکتا تھا ۔" [1]

شوکت تھانوی بہت عرصہ تک اپنے دوستوں کو چوری کی غزلیں سناتے رہے اور اپنی دھاک بٹھاتے رہے ۔ ان کے شاعر ہونے کی اطلاع اردو کے استاد مولوی حفاظت علی صاحب کو ہوئی تو وہ بھی انہیں قدر کی نظر سے دیکھنے لگے ۔ ایک دن انہوں نے اپنے احباب کو تازہ غزل سنائی جو ان کے استاد مولوی حفاظت علی تک بھی پہنچ گئی ۔ مولوی صاحب نے اس غزل کو دیکھنے کے بعد انہیں بہت داد دی اور کہا کہ شاعری خدا کی دین ہے اس کے لئے عمر یا قابلیت کی کوئی قید نہیں ۔ دوسرے دن شوکت تھانوی کے ایک ہمجماعت محمد ایوب حسن ایک رسالہ لے آئے جس میں وہ غزل چھپی تھی ۔ انہوں نے وہ رسالہ مولوی صاحب کے سامنے پیش کردیا ۔ مولوی صاحب نے اس کو دیکھا اور بہت ہنسے ۔ اب شوکت تھانوی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ تھے ۔ دوستوں نے بہت مذاق اڑایا ۔ مگر شوکت تھانوی نے ہمت نہ ہاری اور شعر کہنے کے لئے خود محنت شروع کردی ۔ " ما بدولت " میں انہوں نے بہت تفصیل کے ساتھ اپنی شاعری کی ابتدا کے بارے میں لکھا ہے :

---

[1] شوکت تھانوی ، کچھ یادیں کچھ باتیں ، مطبوعہ نقوش پریس ، لاہور 1964ء ، ص 6 ، 7 ۔

" چوری کھلنے کے اس واقعہ کے بعد ہم کو واقعی عبرت حاصل ہوئی اور اس سلسلہ میں ہم ایوب صاحب کے ہمیشہ کے لئے شکر گذار ہیں کہ اس نے شرارت کے پردے میں ہم سے بہت بڑی دوستی کی ۔ چنانچہ ہم نے پھر کبھی کسی شاعر کا شعر نقل نہیں کیا اور خود شعر کہنے کی کوشش کرتے رہے ۔ معلوم یہ ہوا کہ شعر کہنا کوئی آسان بات نہیں ہے ۔ گھنٹوں غور کر کے ایک مصرعہ کہا بھی تو پتہ چلا کہ اس میں یا تو کچھ گھٹ گیا ہے یا بڑھ گیا ہے اور گھنٹہ بھر اس کی کتر بیونت کی ، راتوں کے بیٹھے مصرعے کہہ رہے ہیں اور کاٹ رہے ہیں ۔ ------ اس زمانہ میں بھائی جان ارشد تھانوی صاحب تشریف لائے اور ان کو ہمارے اتالیق ماسٹر بخشش احمد صاحب نے ہماری شاعرانہ صلاحیت کی اطلاع دی تو ان کو کسی طرح یقین نہ آیا ۔ آپ نے امتحان لینے کے لئے ہم کو ایک مصرع دیا ۔ ؎

سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا

اور فرمایا کہ اس پر مصرعہ لگاؤ ، ہم نے تھوڑی دیر میں اس پر مصرعہ تو نہیں لگایا بلکہ اپنے مصرعہ پر اس کو لگا کر مطلع کر دیا ؎

سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
غمناک سیاہی رات کی تھی اب اس کا اندھیرا دور ہوا

بھائی جان نے جو یہ مطلع دیکھا ہے تو میں ان کی خوشی بیان نہیں کرسکتا میری کسی صلاحیت پر میرے عزیزوں میں سے کوئی کبھی اتنا خوش نہ ہوا تھا اور خود میں بھی خوش تھا کہ اس امتحان میں کامیاب ہوگیا ۔ "[1]

---

[1] شوکت تھانوی ، مابدولت ، مطبوعہ نقوش پریس لاہور ، ص: 65 ، 66 ۔

غزل کی چوری کھلنے سے شوکت تھانوی کی جو ساکھ خراب ہوئی تھی اب اس کی تلافی ہونے لگی اور ان میں شعر کہنے کی ایک نئی امنگ پیدا ہوئی - اور ایک دن غزل کہنے میں کامیاب ہوئے وہ خود لکھتے ہیں کہ :

> " ایک دن ناگاہ ایک غزل مجھ سے بھی سرزد ہوگئی اور کچھ نہ پوچھئیے میری خوشی کا عالم جب میں نے اپنی ذاتی پہلی غزل مکمل کرکے احباب سے داد حاصل کی ہے مگر چونکہ یہ چوری کی غزل نہ تھی لہذا بے ساختہ جی چاہنے لگا کہ یہ غزل میرے نام سے کہیں نہ کہیں چھپ ضرور جائے - میں نے اس غزل کی کئی نقلیں کیں اور اپنے گھر آنے والے تمام ادبی رسالوں کے پتہ پر ایک ایک نقل اس اپیل کے ساتھ روانہ کردی کہ ع
>
> بہرِ خدا ہمیں بھی کہیں چھاپ دیجئے - " [1]

چند دنوں کے بعد شوکت تھانوی کو ایک رسالہ ڈاک کے ذریعے موصول ہوا تو دیکھا کہ اس میں ان کی غزل چھپی ہوئی ہے اور عنوان کے نیچے ان کا نام " نتیجۂ فکر شیخ محمد عمر صاحب شوکت تھانوی " چھپا ہوا ہے - اس رسالہ کا نام " ترچھی نظر " تھا اور اس کے مدیر امین سلونوی تھے جو بعد میں شوکت تھانوی کے اہم دوستوں میں شمار ہوئے - شوکت تھانوی نے کئی مرتبہ اپنی غزل کو پڑھا لیکن اپنی نگاہوں پر اعتبار نہ آتا تھا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ حقیقت ہے یا فسانہ — بالآخر اسے حقیقت تسلیم کرنا پڑی اور اب ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان کے گھر کے دوسرے افراد بھی اس غزل کو دیکھیں - اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک میز پر اس رسالہ کا وہی غزل والا صفحہ کھول کر رکھ دیا تا کہ اس کی زیارت سے ہر اہلِ بصیرت مشرف

---

[1] شوکت تھانوی : کچھ یادیں کچھ باتیں ، ادارۂ فروغِ اردو ، لاہور ، ص : 7 -

ہو سکے ۔ سب سے پہلے اس رسالے پر جس کی نظر پڑی وہ ان کے والد صاحب قبلہ ہی تھے :

" پہلے تو یوں ہی سرسری نظر سے اس رسالہ کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے مگر پھر ٹھٹکے ۔ واپس لوٹے ، رسالہ کو اٹھایا اور چشمہ لگا کر پوری توجہ سے اس کو دیکھتے رہے غالباً انہوں نے بھی ایک مرتبہ پڑھنا کافی نہ سمجھا اس لئے کہ دیر تک پہلے تو اسی صفحہ کو دیکھتے رہے اس کے بعد رسالہ بند کر کے اس کا سرورق دیکھا پھر رسالہ کے باقی صفحات پر بھی جستہ جستہ نظر ڈالی اور آخر اس رسالہ کو لے کر اپنے کمرے میں چلے گئے جہاں سے والدہ محترمہ کو آواز دی :

" میں نے کہا کہاں ہیں آپ ذرا تشریف لائیے " اس قسم کی آواز وہ عموماً ان مواقع پر دیا کرتے تھے جب ان کو والدہ محترمہ سے کسی کی شکایت کرنا ہوتی تھی --------- ان کے کمرے میں پہنچیں تو والد صاحب نے ان کو دیکھتے ہی کہا " آپ کے صاحبزادے بلند اقبال فرماتے ہیں کہ ـــــ

ہمیشہ غیر کی عزت تیری محفل میں ہوتی ہے
تیرے کوچہ میں ہم جاکر ذلیل و خوار ہوتے ہیں

میں پوچھتا ہوں کہ یہ اس نامعقول کوچہ میں جاتے ہی کیوں ہیں " والدہ بیچاری نے نہایت معصومیت سے فرمایا " مجھے تو خبر نہیں کہاں جاتا ہے اور کیوں جاتا ہے ۔ "[1]

شوکت تھانوی کے والد صاحب نے جب رسالہ کا نام دیکھا تو لاحول پڑھتے ہی بن پڑی اور کہنے لگے کہ بھلا " ترچھی نظر " بھی کسی ادبی رسالہ کا نام ہو سکتا ہے ۔ اور برخوردار کو کلام چھپوانے کے لئے صرف " ترچھی نظر "

---

[1] شوکت تھانوی : کچھ یادیں کچھ باتیں ، ناشر ادارۂ فروغ اردو ، لاہور ، ص: 9 ، 10 ۔

ہی ملا ہے - شوکت تھانوی امین سلونوی سے ملے تو انہوں نے گذارش کی کہ مہربانی فرما کر اپنے رسالہ کا نام بدل دیجئے - امین سلونوی پہلے ہی اس کا نام تبدیل کرنے کے لئے تیار بیٹھے تھے کہنے لگے کہ آئندہ یہ رسالہ صرف "نظر" کے نام سے شائع کیا جائے گا - امین سلونوی خود بھی شاعر تھے اور انہیں مولانا عبدالباری آسی سے شرف تلمذ حاصل تھا - ایک دن امین سلونوی نے شوکت تھانوی کو اپنے استاد مولانا آسی کا ایک شعر سنایا : ؎

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا

یہ شعر شوکت تھانوی کو ایسا اچھا لگا کہ وہ تا دیر اس شعر کو گنگناتے رہے اور امین سلونوی سے استدعا کی کہ شعر گوئی میں وہ اس شخص سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتے ہیں چنانچہ ایک دن امین سلونوی انہیں مولانا آسی کے مکان پر لے گئے - شوکت تھانوی لکھتے ہیں :

> " مولانا بڑے تپاک سے ملے - امین صاحب کی درخواست پر تقریباً بادل ناخواستہ اپنی وہی غزل ارشاد فرمائی جس کا ایک شعر میں تین دن سے گنگناتا پھر رہا تھا اور اس کے بعد امین سلونوی صاحب ہی نے میری اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں مولانا سے شرف تلمذ حاصل کرنا چاہتا ہوں - مولانا نے اس درخواست کو منظور تو فرما لیا مگر میں اب تک اس شش و پنج میں تھا کہ اگر میری شاعری کی والد محترم کو پھر اطلاع ہوگئی تو کیا ہوگا مگر یہ کہنے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی کہ میں بصیغۂ راز شاعر بننا چاہتا ہوں اور اور جب تک والد صاحب اجازت نہ دے دیں انڈر گراؤنڈ رہنا چاہتا ہوں -" [1]

---

[1] شوکت تھانوی : کچھ یادیں کچھ باتیں ، ناشر ادارۂ فروغِ اردو ، لاہور
ص : 17 ، 18 -

شوکت تھانوی نے مولانا عبدالباری آسی سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے بعد باقاعدہ شاعری شروع کی ۔ والد صاحب کے خوف کی وجہ سے مشاعروں میں شرکت نہ کرتے تھے صرف مشقِ سخن پر ہی توجہ دیتے تھے ۔ وہ اپنے استاد کے پاس پر سکون لمحات میں جایا کرتے تھے تا کہ وہ اپنی غلطیوں اور خامیوں کو سمجھ سکیں اور اصلاحی نکتے ان کے ذہن نشین ہوسکیں۔ ایک روز مولانا آسی نے فرمایا کہ پنڈت جگت موہن لعل رواں نے اناؤ میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا ہے میری خواہش ہے کہ آپ بھی اس مشاعرے میں شریک ہوں ۔ یہ گویا شوکت تھانوی کا پہلا مشاعرہ تھا ، وہ لکھتے ہیں کہ :

" میں نے بڑی محنت سے غزل کہی ۔ مولانا آسی نے بھی اس غزل کو خصوصیت کے ساتھ پسند کیا ۔ چونکہ پہلی مرتبہ مشاعرہ پڑھنے کا اتفاق ہو رہا تھا لہذا اس کی دھن بھی غسلخانوں میں چھپ چھپ کر بنائی ۔ اس زمانہ میں آواز بھی آج کل کی سی بھیانک نہ تھی ۔ نتیجہ یہ کہ مشاعرے میں غزل خوب چمکی مگر جب غزل چمک چکی تو ایک بجلی بھی مجھ پر یہ گری کہ اسی مشاعرے کے ایک شاعر مرزا فخراللہ بیگ مشاعرے کے بعد میرے پاس آئے ، نہایت شفقت سے داد دی ۔ بڑی دیر تک گلے لگاتے رہے اور آخر میں یہ کہہ کر میرا دم نکال لیا کہ وہ والد محترم کے نہایت قریبی دوستوں میں سے ہیں لہذا مجھ کو مشاعرے میں سرسبز دیکھ کر ان کو بے حد مسرت ہوئی ہے ۔" [1]

شوکت تھانوی کو جس بات کا خطرہ تھا وہی اگلے روز مرزا فخراللہ بیگ ، شوکت تھانوی کے والد کے پاس پہنچ گئے اور اناؤ کے مشاعرہ کی ساری

---

[1] شوکت تھانوی : کچھ یادیں کچھ باتیں ، ناشر ادارۂ فروغ اردو ، لاہور ، ص: 24 ، 25 ۔

روداد انہیں سنادی اور شوکت تھانوی کی غزل کی بے حد تعریف کی اور یہ شعر ان کے والد کو سنایا ؎

موت برحق تھی مگر کاش نہ آتی شبِ غم
یہ تو کہنے کو نہ ہوتا کوئی ارماں نکلا

یہ شعر سن کر ان کے والد صاحب بھی خوش ہوئے ۔ اس طرح شوکت تھانوی کو اپنی شاعری کے چھپانے کی ضرورت نہ رہی اور اب انہوں نے لکھنو کے مشاعرے بھی پڑھنا شروع کردئیے ۔ شوکت تھانوی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :

> " اب گویا والد صاحب کو خدا نے صبر کی توفیق عطا کردی تھی کہ جوان بیٹا شاعر نکل گیا ہے تو مشیتِ ایزدی میں کیا چارہ ہے اور اب وہ اس سلسلے میں اپنی قسمت پر شاکر تھے ۔ گھر پر اگر کوئی شاعر دوست آجاتا تھا تو اس کو بھی گوارا کرلیتے تھے ۔ "[1]

یہاں اس ماحول کا جائزہ لینا بے محل نہیں ہوگا جس نے والد کی مخالفت کے باوجود انہیں شاعر بننے پر مجبور کیا ۔ شوکت تھانوی ابھی دس برس کے تھے کہ ان کے والد صاحب نے لکھنو میں سکونت اختیار کرلی تھی ۔ یعنی 1914 ء میں جب وہ بھوپال کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو تھانہ بھون جانے کے بجائے لکھنو چلے آئے تھے ۔ لکھنو میں علم و ادب کا غیر معمولی چرچا تھا ۔ شوکت تھانوی جب ذرا بڑے ہوئے تو انہوں نے اپنے آپ کو اس ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کی ۔ لکھنو کا ہر شخص زبان و بیان پر خاص طور سے توجہ دیتا تھا ۔ وہ سمجھتے تھے کہ شعری تجربات کے اظہار کے لئے بہتر سے بہتر الفاظ اور اسالیب بیان کام میں لائے جانے چاہئیں ۔ اس زمانے

---

[1] شوکت تھانوی : کچھ یادیں کچھ باتیں ، ناشر ادارۂ فروغِ اردو ، لاہور ، ص: 28 ۔

میں شاعر کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ سچے شعری تجربات سے قطع نظر کرکے بھی الفاظ و محاورات اور اسالیب بیان کے ایک وسیع خزانے پر دسترس رکھے اور انہیں قافیہ، ردیف اور وزن کے سانچے میں ڈھال کر ادب کا جز بنا دے۔

لکھنو میں زندگی کے ایک ایک گوشے میں ایسی رنگا رنگی اور ہما ہمی تھی کہ دوسری جگہ ساری زندگی میں ملنا محال تھی۔ اس لئے یہاں مروج و مستعمل الفاظ و محاورات کا ایک وافر ذخیرہ موجود تھا۔ مشرقی علوم کی تعلیم نے عربی و فارسی کے مشکل الفاظ و تراکیب کا سرمایہ بھی مہیا کردیا تھا۔ چونکہ معاشرت کا ایک سِرا تہذیب و شائستگی اور دوسرا ابتذال و بازاریت سے ملا ہوا تھا اس لئے زبان کے خزانے میں مہذب و شائستہ الفاظ و محاورات کے ساتھ ساتھ مبتذل اور بازاری الفاظ و محاورات بھی تھے۔ بیگماتِ لکھنو کی خاص بولی بھی اس کا ایک حصہ تھی۔ لکھنو میں مہذب و مستند، فصیح و ثقیل، مردانہ و زنانہ ہر طرح کے الفاظ و محاورات کو نظم کر دینا قدرت کلام میں داخل تھا —— قادر الکلامی کے اس وسیع مفہوم کو پر گوئی اور زود دمشقی کے بغیر عملی جامہ پہنانا ممکن نہ تھا۔ خوش حالی کی بناء پر معاصرانہ چشمک عام تھی۔ قدر دانوں کی شہ نے شعراء کے درمیان مسابقت کے جذبے کو بہت بڑھا دیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنا لوہا منوانے کے لئے نئے نئے قافیوں اور ردیفوں میں کثرت سے شعر کہنے پر مجبور ہوئے۔ اس صورت حال نے لمبی لمبی غزلیں کہنے کی عادت ڈالی تا کہ کس قافیے کے چھوٹ جانے کی وجہ سے شاعر کو عجز بیان کی تہمت نہ اٹھانا پڑے۔ ایک ایک زمین میں اشعار کی تعداد اتنی بڑھی کہ پنج غزلوں تک نوبت پہنچی۔ ایک ہی قافیے کی قید میں لمبی لمبی غزلیں

کہی جانے لگیں ۔ آسان زمینوں میں ان تقاضوں کا پورا کرنا کیا کم تھا کہ مشکل اور سنگلاخ زمینوں کا انتخاب کیا جانے لگا ۔ ایسے بے جوڑ قافیے اور ردیفیں اختیار کی جانے لگیں کہ ان کو جوڑنے میں دانتوں پسینہ آجائے لیکن چونکہ کھوٹے کھرے کا معیار یہی تھا اس لئے شعراء ان پتھروں کو بھی پانی کردکھاتے ۔ شعرائے لکھنو کے کلام کا ایک بڑا حصہ ان خصوصیات سے بھرا ہوا ہے اس لئے شوکت تھانوی نے بھی اپنی شاعری میں زبان و بیان پر خاص طور سے توجہ دی ہے ۔

لکھنؤ والے اپنے عہد کی خوشحالی اور عیش و نشاط کا بڑا احساس رکھتے تھے اور اس پر نازاں تھے ۔ وہاں حسن کا مطلب حسن نسوانی تھا ۔ حسن کی ایک موہوم سی جھلک نہ تھی ، جلووں کا ازدہام تھا اور نتیجہ حیرانی کے بجائے سیرابی ، معاشی اور جنسی آسودگی کی فضا زندگی اور عشق میں گہری اندرونی چوٹوں کے بجائے ہلکے بیرونی چرکوں کے لئے زیادہ سازگار تھی ۔ چنانچہ نفسِ مضمون کے اعتبار سے لکھنؤ اسکول کی شاعری میں داخلی عناصر کے مقابلے میں خارجی عناصر کو زیادہ ترقی حاصل ہوئی ۔

لکھنؤ میں عاشق کے لئے معشوق کی نادیدہ پرستش کی ضرورت نہ تھی اس کی سجاوٹ اور بے باکی سے لطف اندوز ہونے کا حوصلہ درکار تھا ۔ جلوہ نمائی اور جلوہ پرستی کے عمل اور ردِّ عمل میں دنیائے عشق پر معشوق کی شخصیت اپنے سارے بناؤ سنگھار کے ساتھ چھائی ہوئی تھی ۔ اس لئے یہاں کا شاعر معشوق کے حسن و جمال ، اس کے سامان آرائش اور عشوہ و ادا کا ذکر کیا کرتا تھا جسے معشوق کے خارجی لوازم کے بیان اور ادا بندی کا نام دیا جاتا ہے ۔

ایک اور خصوصیت جس نے لکھنو کی شاعری میں مذکورہ معاشرتی محرکات سے بار پایا معاملہ بندی تھی ۔ لکھنو میں عاشق کے لئے پردہ داری، شرم و حیاء اور دوسری اخلاقی سختیوں سے آزادی کی بڑی دلچسپ راہیں نکل آئی تھیں ۔ عاشق و معشوق کے درمیان حرف و حکایات اور وصل و ملاقات کے دروازے کھل گئے تھے اس لئے یہاں عاشق کو واردات کے مقابلے میں معاملات سے زیادہ سروکار تھا ۔ بقول ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی " جہاں معشوق خود ہی وصال طلب ہو وہاں کاوشِ ہجر اور لذتِ غم کیسی "[1] چنانچہ عاشق و معشوق کے ملنے جلنے کی صورت میں ربط و اختلاط اور راز و نیاز کی جو باتیں پیش آ سکتی ہیں اس دور کی لکھنوی شاعری کا ایک بڑا حصہ انہیں پر مشتمل تھا ۔

معشوق کے حسن و جمال، انداز و ادا اور معاملاتِ حسن و عشق کا بیان بجائے خود عشقیہ شاعری کے لئے معیوب نہیں سمجھا جا سکتا لیکن اس کے لئے متانت و سنجیدگی اور اسلوبِ بیان کا فطری ہونا شرط ہے ۔ لکھنوی شعراء جہاں کہیں اس کا لحاظ رکھتے تھے وہاں ان کا کلام حسن و لطافت کا حامل بن جاتا تھا ۔ خارجیت، ادا بندی، اور معاملہ بندی کے اچھے نمونے مواد کی تازگی، رنگینی اور شادابی سے خالی نہ تھے ۔ لیکن چونکہ عشقیہ مشاہدات و تجربات میں سطحیت، ہوسناکی اور کام جوئی کا عنصر غالب تھا اس لئے ان اجزاء سے عام طور پر بہت اچھے نتائج برآمد نہ ہو سکے ۔ متعلقات حسن اور معاملات عشق کے بیان کی سرحدیں اکثر بازاریت اور ابتذال سے جا ملیں ۔

---

[1] ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی: دلی کا دبستان شاعری، 1949ء
ص: 325

فکر و فن کے اعتبار سے یہ ایسی خصوصیات تھیں جن سے اس دور کی لکھنوی شاعری عام طور پر پہچانی جاتی تھی ۔ اشعار کا ایک بڑا حصہ ایسا ہوتا ہے جس میں بیک وقت ان میں سے اکثر خصوصیتیں یکجا ہوجاتی ہیں ۔ مجموعی حیثیت سے شاعری کا جو تصور ان خصوصیات سے ابھرتا ہے وہ لکھنوی شاعری کو دہلوی شاعری سے واضح طور پر الگ کردیتا ہے لیکن لکھنؤ کے مذاق سخن کے کچھ ایسے پہلو بھی تھے جو اگرچہ ضمنی حیثیت رکھتے تھے لیکن جن کو نظر انداز کردینے سے اس کے متعلق صحیح نتائج نہیں نکل سکتے ۔ لکھنؤ والوں نے سیاسی آزادی اور معاشی خوشحالی کے زعم میں دہلی کی تہذیبی برتری کے طلسم کو توڑ دیا تھا ۔ دنیائے شاعری میں ان کارگذاریوں کا بڑا دخل تھا ۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں ان کا نقطہ نظر کچھ بھی رہا ہو شعر و سخن میں وہ اپنی لڑائی اور انفرادیت کا شدت سے احساس رکھنے کے باوجود دہلی کی عظمت کے بھی قائل تھے یہاں کے شعراء اساتذۂ دہلی کی مشہور غزلوں پر غزلیں کہتے تھے ان کی تقلید کرتے تھے اور مقطعوں میں ان سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے تھے ۔

معاشرتی ماحول افراد پر گہرا اثر ڈالتا ہے ۔ ایک زمانے کے افراد کی زندگی میں کچھ ایسی مشترک باتیں پائی جاتی ہیں جو اجتماعی ماحول کی پیداوار ہوتی ہیں لیکن سخت سے سخت اور حاوی سے حاوی ماحول میں ایسے ذہنی اور جذباتی تجربات کی راہیں بالکل مسدود نہیں ہوجاتیں جن کی نوعیت نجی یا ذاتی ہوتی ہے ۔ لکھنو کی جمال ریز اور نغمہ بار فضا میں ایسی نجی چوٹوں کا لگن ناممکن تھا جو داخلی گداز کی مالک ہوتی ہیں ۔ اس کے علاوہ ہر معاشرتی ماحول اپنا ایک پس منظر بھی رکھتا ہے اور اپنی جدّت پسندی اور انفرادیت کے باوجود گذشتہ روایات سے بالکل بیگانہ نہیں رہ سکتا ۔ ادب کی

نشو ونما میں بھی کم و بیش یہی صورت سامنے آتی ہے - ہر دور اپنے الگ تقاضے اور میلان لے کر آتا ہے بعض ادوار ادبی تصورات میں انقلابی تبدیلیوں کے حامل ہوتے ہیں لیکن ماضی کی روایات سے دامن چھڑانا ممکن نہیں ہوتا اور اوّل و آخر کسی نہ کسی شکل میں وہ اپنی جگہ بنا کر رہتی ہیں - چنانچہ شوکت تھانوی کے دور کی لکھنوی شاعری میں ایسے اشعار بھی نظر آتے ہیں جو واردات قلبی اور جذبات نگاری سے تعلق رکھتے ہیں -

شوکت تھانوی جس ماحول میں زندگی بسر کر رہے تھے اس کا اثر یقیناً ان کی شاعری پر پڑا ہے -

غزلیات :-

ترانوے (93) غزلیات پر مشتمل شوکت تھانوی کا ایک مجموعہ "گھوستان" کے نام سے 1934ء یا اس کے بعد شائع ہوا - جو 208 صفحات پر مشتمل ہے - اسے شوکت بکڈپو ، لاٹوش روڈ ، لکھنو نے شائع کیا تھا - شوکت بک ڈپو کا مطلب یہ ہوا کہ شوکت تھانوی نے یہ مجموعۂ کلام کسی پبلشر کو دینے کی بجائے خود چھاپا تھا - اس کا مقدمہ نواب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی نے تحریر کیا ہے - مقدمے کے آخر میں 21، جولائی 1934ء کی تاریخ درج ہے - جس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مجموعہ 1934ء میں مرتب ہوا راقم الحروف نے اس دور کے رسائل اور اخبارات بھی دیکھے ہیں جس میں گھوستان کے چھپنے کی اطلاع دی گئی ہے اور بعض رسائل میں اشتہار دیا گیا ہے ان شواہد کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجموعۂ کلام 1934ء میں چھپ کر منظر عام پر آیا - اس وقت شوکت تھانوی کی عمر تیس سال تھی -

شوکت تھانوی دوسرا مجموعہ " گھر ستان کے بعد " کے نام سے ترتیب دینا چاہتے تھے جس کے ابھی صرف انہوں نے سولہ صفحات تحریر کئے تھے- ان سولہ صفحات میں 22 غزلیں تحریر کی گئی ہیں - بہت باریک باریک اور خوبصورت لکھا ہوا یہ مجموعہ شوکت تھانوی کے منجھلے صاحبزادے خورشید شوکت (لاہور) کی لائبریری میں محفوظ ہے - راقم الحروف نے یہ مجموعہ ان کے پاس دیکھا ہے -"گھر ستان" کے ساتھ ہی کچھ کاغذ لگا کر اس مجموعے کی جلد بندی کرائی گئی تھی - سفید کاغذوں کی جلد بندی کے بعد شوکت تھانوی نے لکھنا شروع کیا تھا - ریڈیو اور اخبارات کی مصروفیات کی وجہ سے وہ اس مجموعے کو ترتیب نہ دے سکے - ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے شاعری کے بجائے نثر پر زیادہ توجہ دینی شروع کردی - اور شاعری صرف مشاعروں تک محدود ہو کر رہ گئی - مشاعروں میں شرکت کے لئے وہ مصرعہ طرح پر غزل کہتے اور مشاعرہ پڑھنے کے بعد وہ غزل کسی اخبار میں چھپوا دیا کرتے تھے - راقم الحروف نے 1935ء سے 1963ء تک کے ان ادبی رسائل اور اہم اخبارات کی فائلیں دیکھ کر جن سے شوکت تھانوی کا تعلق رہا ہے اسّی (80)[1] سے زیادہ غزلیں جمع کی ہیں جن میں " گھرستان کے بعد " کی 22 غزلیں بھی شامل ہیں اس طرح شوکت تھانوی کی کل غزلیں جو راقم کے پاس محفوظ ہیں وہ پونے دو سو کے لگ بھگ ہیں - اس کا امکان بھی ہے کہ کچھ غزلیں مشاعرہ پڑھنے کے بعد کسی رسالہ یا اخبار میں چھپ نہ سکی ہوں یا چھپی ہوں اور میری دسترس میں نہ ہوں - پھر ریڈیو پر پڑھی جانے والی بہت کم غزلیں راقم کو دستیاب ہوسکی ہیں - بایں ہمہ شوکت تھانوی کی غیر مرتب غزلیات جو متعدد ماخذات سے میرے ہاتھ آئی ہیں ایک نئے مجموعہ کلام کو کفایت کرتی ہیں -

شوکت تھانوی ایک فطری شاعر تھے ۔ ابتدائی دور میں غزل ان کی محبوب ترین صنف تھی ۔ اور غزل تخیل کی زبانی جذبے کے بیان کا نام ہے ۔ جذبے کی رمزی اور ایمائی کیفیت کا مکمل اظہار اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ایسے علامتی الفاظ کو استعمال نہ کیا جائے جن میں وجدان کو متاثر کرنے کی پوری صلاحیت ہو ۔ اچھی غزل کی تخلیق کے لئے زبان پر قدرت اور الفاظ کی جوہری انفرادیت کی معرفت لازمی اور ناگزیر ہے اس کے بغیر نہ اچھا شعر نظم کیا جاسکتا ہے نہ ان میں رمزی اور ایمائی کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے ۔ شوکت تھانوی کا آرٹ ان کے جذبے کا رمز ہے جسے انہوں نے الفاظ کی علامتوں سے ظاہر کیا ہے ۔ شوکت تھانوی کو لکھنو کی زبان سے عشق تھا اس زبان کو مقبولِ خاص وعام بنانے اور حیات ابدی دینے کا یہی واحد ذریعہ تھا کہ اس کو شعری جامے میں ملبوس کردیا جائے چنانچہ شوکت تھانوی نے یہی کیا ۔ شوکت تھانوی اپنے اشعار میں لکھنوی روزمرہ کو بڑی سادگی سے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں :- ؎

تم اپنے وعدوں کو بھول کر بھی اگر ہمیں یاد رکھ سکوگے 1
یہ دل سلامت تو ہم اسے پھر فریب میں مبتلا کریں گے
+
خوشی کا تو خیر ذکر کیا ہے ہمارا غم بھی نہ غم رہےگا
ہمارے رونے پہ دیکھ لینا ہمارے آنسو ہنسا کریں گے
+
تم ہو عنوان محبت ، تم ہو عنوان حیات
اب مرے افسانہ کو افسانہ ہونا چاہئیے
+
وہ جس طرف گئے رخ تاباں لئے ہوئے
ہم دیکھتے رہے دل حیراں لئے ہوئے

کانشوں سے تصفیہ ہے یہ اب اہلِ ذوق کا
دامن دئے ہوئے ہیں گریباں لئے ہوئے

+

زیست کی دشواریوں نے ہم کو یہ سمجھا دیا
جو بسر ہوجائے اس کو زندگی کہہ لیجئے

شوکت تھانوی نے ہمیشہ سادہ ، سہل ، آسان الفاظ اور دلنشین ترکیبوں کا استعمال کیا ہے ۔ وہ اپنے ادب شناس ذوق کی وجہ سے الفاظ کی در و بست اور ترکیب کے توازن کے نکتہ سے بخوبی واقف تھے اور ان کا استعمال ایسی خوبصورتی سے کرتے تھے کہ ان کی شاعری میں مصوّری کی جھلک نظر آنے لگتی ہے اور ان کی بات دل میں اترتی چلی جاتی ہے :-

سچ ہے ان کو مجھ سے کیا اور میرے افسانے سے کیا
کر دیا دیوانہ تو اب کام دیوانے سے کیا

+

میرے غم نے ساری دنیا کو پریشاں کر دیا
آئینہ نے آئینہ خانہ کو حیراں کر دیا

+

یوں موت پہ میں جان کو قربان نہ کرتا
تو نے مجھے شاید کوئی پیغام دیا تھا

+

قیامت اسی دل سے اٹھے گی شوکت
قیامت کا جس دل میں ارمان ہوگا

+

جس طرح گذری ہے اب تک اب بھی گذرے گی یونہی
ہم نہیں بدلے تو دنیا کے بدل جانے سے کیا

وہ لاکھ طرح کی رنگینیاں سہی گل میں
مگر شباب تمہارا شباب ہو نہ سکا

سہلِ ممتنع سادگی و حسنِ بیان کی اس صنف کا نام ہے جس کو دیکھ کر ہر شخص یہ سمجھے کہ یہ بات میرے دل میں بھی تھی اور ایسا کہنا ہر شخص کے لئے آسان ہے لیکن جب کوشش کر کے ویسا لکھنا چاہے تو نہ لکھ سکے ۔ شوکت تھانوی کے کلام میں صداقت کی وجہ سے سلاست و فصاحت پیدا ہوگئی ہے کیونکہ جو ان کی زندگی تھی وہی ان کی شاعری ہے دونوں میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں خیالات کی نزاکتوں اور ادا کی دِقّتوں کے باوجود سلاست و روانی انتہائی کمال تک ملتی ہے ان کے بعض اشعار کو نثر کرنے کے بعد بھی ان کی ترکیب میں کوئی فرق نہیں آتا ۔ ان کی متعدد چھوٹی بحر کی غزلیں سہلِ ممتنع کی تعریف پر پوری اترتی ہیں مثلاً :-

لاکھ پردوں میں اس کو دیکھ لیا + عشق نے کیا نگاہ پائی ہے [1]
کعبہ اور عرش کس کو کہتے ہیں + ان کے در تک میری رسائی ہے
تم تصور میں ہوئے تھے ہمکلام + سوچتا ہوں میں نے کس سے بات کی
کیا ہوا دل کو الٰہی خیر ہو + کچھ کمی پاتا ہوں محسوسات کی
میں ہوں شوکت اور مری تنہائیاں + حد نہیں ہے ان کے احسانات کی

حسن و عشق ایک ہی ذہنی کیفیت کے دو بظاہر مختلف ظہور ہیں ۔ عشق وہیں ہوتا ہے جہاں حسن نظر آئے اور جہاں عشق ہو وہاں حسن ضرور نظر آتا ہے ۔ اس یگانگت کے باوجود ہم حسن و عشق کے

درمیان عام گفتگو میں فرق ضرور کرتے ہیں - حسن کو ہم ایک بیرونی حقیقت قرار دیتے ہیں یعنی ایک ایسی چیز جو ہمارے ذہن سے علیحدہ ایک مستقل وجود رکھتی ہے اور عشق اسی بیرونی حقیقت سے ہمارا وہ ذہنی تعلق ہے جو بالعموم خواہش کے رنگ میں پیدا ہوتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اگر حسن میں نہیں تو عشق میں یقیناً ہماری اپنی شخصیت منعکس ہوتی ہے جیسے ہم خود ہیں ویسا ہی ہمارا عشق ہے - شوکت تھانوی کا تصورِ حسن و عشق بھی شوکت تھانوی کی شخصیت سے علیحدہ نہیں ہے ان کا عشق کتابی یا روایتی نہیں ہے بلکہ یہ تجربات و مشاہدات ان کی ذاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے اظہار میں شوکت تھانوی نے ایک دلچسپ کیفیت پیدا کردی ہے :-

عشق کا عالم جدا ہے حسن کی دنیا جدا
مجھ کو آبادی سے کیا اور تم کو ویرانے سے کیا
+
لگا دی جان کی بازی غمِ محبت نے
جب ان کے حسن کا سودا بہت گراں دیکھا
+
ہزار بار سنے ہم نے عشق کے نالے
مگر کسی نے جو دیکھا تو بے زباں دیکھا
+
نہ روک دل کی تڑپ ضبط اضطراب نہ کر
ادائے رسم محبت سے اجتناب نہ کر
+
حقیقت ایک ہے لیکن نظر کا فرق ہے شوکت
وہ جس کو کچھ نہیں سمجھے اسے ہم دل سمجھتے ہیں

صنعتوں کا استعمال :-

بعض شاعروں نے صنعتوں کا استعمال اتنی بے اعتدالی سے کیا ہے کہ انہیں دیکھ کر طبیعت مکدر ہوتی ہے لیکن کسی شے کے غلط استعمال سے نفسِ شے میں کوئی خرابی نہیں آ سکتی اس میں شک نہیں کہ اگر سلیقہ کے ساتھ صنعتوں کا استعمال کیا جائے تو کلام کے حسن میں یقیناً اضافہ ہوجاتا ہے شوکت تھانوی نے اپنے کلام میں صنعتوں کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ وہ ان کے کلام کا حسن بڑھاتی ہیں ۔ شوکت تھانوی نے اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ صنعتوں کو اتنا ابھرنے نہیں دینا چاہئیے کہ وہ سامع کے ذہن کو معنی سے ہٹا کر اپنی طرف متوجہ کرلیں ۔ اس دعوے کی دلیل میں چند مثالیں:

صنعتِ مراعاۃ النظیر :-

سرگذشتِ عہدِ مجنوں نجد کے ذروں سے پوچھ
اب وہاں مجنوں نہیں ، لیلی نہیں محمل نہیں

کون سے دریا میں ہے یا رب سفینہ عشق کا
ہر زبانِ موج کہتی ہے یہاں ساحل نہیں

صنعتِ تضاد :-

فصلِ خزاں کو کیا کہوں خیر خزاں تو ہے خزاں
مجھ سے خزاں نصیب کو چین نہیں بہار میں

بُعد سا بُعد تھا مگر بُعد بھی قرب بن گیا
آپ سے متصل رہے آپ کے انتظار میں

نظم و نثر دونوں میں الفاظ کی سادگی اور دلنشین ترکیبوں کے استعمال سے ایک خاص قسم کی دلکشی پیدا ہوجاتی ہے - ترکیبوں کے برمحل استعمال سے شاعری جگمگا اٹھتی ہے - اردو کے تمام شاعروں نے فارسی اور عربی کی دلآویز ترکیبوں سے اپنا کلام آراستہ کیا ہے شوکت تھانوی بھی اس سے بچ نہ سکے انہوں نے حتی الامکان فارسی ترکیبوں کے استعمال سے احتراز کیا ہے لیکن بعض موقعوں پر انہوں نے فارسی ترکیبوں کو اس طرح کھپایا ہے کہ فارسی اور اردو کی مثالی آمیزش سے ایک طرح کا خوش منظر گنگا جمنی رنگ پیدا ہوگیا ہے :-

اگرچہ خانہ برانداز دل ہے مایوسی
رہینِ کاوشِ امید کو قرار تو ہے
+
جانے تو دو مری صدا پردہ سرائے ناز میں
برق سی کوند جائے گی جلوہ گہہِ مجاز میں
+
محوِ سکوتِ مرگ ہوں آنکھ سے خوں رواں نہیں
آج مری نگاہ میں منظرِ خونچکاں نہیں
+
راہروِ راہِ وفا اک بات سنتا جا مری
یہ خبر مشہور ہے اس راہ میں منزل نہیں
+
کافی ہے مجھ کو اک نظرِ التفاتِ دل
سرگرمِ آرزوئے تماشا نہیں ہوں میں

شوکت تھانوی کے کلام میں ایک خاص قسم کی شگفتگی اور روانی پائی جاتی ہے اس کے چند اسباب ہیں - اول یہ کہ انہوں نے جو شگفتہ اور چھوٹی چھوٹی بحریں اختیار کی ہیں ان میں بات کو صفائی ، سادگی اور

اختصار سے ادا کرنا لازمی اقتضا تھا۔ بعض ایسی بحریں بھی ہیں جن کی تخلیق میں فطرتاً ترنم اور موسیقیت کا عنصر بہت زیادہ ہے اس لئے جب ان میں شعر کہا جاتا ہے تو طبیعت کو ایک قسم کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ردیف کی تلاش میں بڑی کوشش سے کام لیا ہے۔ ردیف حسن و زیبائش کے علاوہ اردو شاعری میں خیالات کی وسعت ، بیان کی رنگینی اور تنوّع کا سب سے بڑا ذریعہ ہے تیسرے یہ کہ قوافی کے استعمال میں خصوصیت کے ساتھ اس خیال کو مد نظر رکھا ہے کہ حروفِ قافیہ میں کیفیت آمیز توازن قائم رہے اور ایسے قوافی سے پرہیز کیا ہے جن کے حروف میں بیگانگی یا آواز میں کراہت و ثقالت پائی جاتی ہے۔ شوکت تھانوی کے ہاں سے شگفتگی اور روانی کے ذیل میں چند مثالیں : ؎

محبت کا وہ دور بھی آ رہا ہے + کہ ہر حال میں مسکرانا پڑے گا
میں اپنے فسانہ پہ خود ہنس رہا ہوں + سنو اور اب مسکراؤ تو جسا نیں
وفا ناآشناؤں سے وفا کی + خطا کی اور بڑی ہم نے خطا کی
جہاں تک ہو سکا دل کی دوا کی + اب اس کے بعد جو مرضی خدا کی
ملی جنت ترے کوچہ کے بدلے + جزا میں بھی ہے نوعیت سزا کی
خود اپنا حسن دیکھ کے انصاف کیجئے + خود اپنی ہی نظر سے تو پردا نہ کیجئے

داخلیت اور خارجیت کا امتزاج :-

بعض ناقدین نے دہلوی رنگ کی تمام خصوصیات کو " داخلیت " اور لکھنوی رنگ کی خصوصیات کو " خارجیت " کہہ کر ظاہر کیا ہے داخلیت

سے مراد یہ ہے کہ شاعر قلبی کیفیات اور داخلی جذبات کی ترجمانی پر زور صرف کرتا ہے اس کے برخلاف خارجیت میں متعلقاتِ حسن اور خارجی لوازمات پر طبع آزمائی کی جاتی ہے ۔ اگر ان کیفیات کی مصوّری کی جائے جو حسن کی دید سے یا فراق کی کیفیت سے دل پر گذرے تو یہ داخلی رنگ میں داخل ہوگا اور اگر محبوب کے خد و خال ، اس کے جسم کے مختلف اعضاء ، ملبوسات زیورات اور سنگھار کا بیان ہو تو اسے خارجی رنگ قرار دیتے ہیں ۔ شوکت تھانوی کی شاعری داخلیت اور خارجیت کی درمیانی کڑی معلوم ہوتی ہے ۔ شوکت تھانوی نے " گہرستان " میں " غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد " کے عنوان کے تحت اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ نہ وہ لکھنوی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ دبستان دلی سے : وہ لکھتے ہیں ۔

" میں کس دعویٰ کے ساتھ یا چیلنج کے طور پر یہ مجموعہ پیش نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس اعتراف کے ساتھ کہ نہ میں لکھنوی ہوں اور نہ دہلوی نہ مجھ کو دعوائے سخن ہے نہ زباندانی کا زعم ۔ اس کے بعد بھی اگر آپ کو اس مجموعہ میں کوئی چیز اپنی طرف متوجہ کر سکے تو اس کو فیضان آسؔی سمجھئیے گا ، استاذی علامہ آسی نے آفتابِ علم بن کر مجھ ایسے خدا جانے کتنے ذرّوں کو ضیا بخشی ہے ۔" [1]

شوکت تھانوی کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے جن میں خارجی زندگی کے ساتھ داخلی زندگی کے اثرات نظر آتے ہیں :

1۔ یوں موت پہ میں جان کو قربان نہ کرتا
تو نے مجھے شاید کوئی پیغام دیا تھا

---

[1] شوکت تھانوی : گہرستان ، شوکت بکڈپو ، لکھنو ، ص : 16 ۔

2- عشق بھی اپنا نہ تھا اور حسن بھی اپنا نہ تھا
تیرے کوچہ میں زمین و آسماں بیگا نہ تھا

3- فروغِ حسن اگر ہے بنازِ یکتائی
تو آئینہ کو بھی آمادۂ جواب نہ کر

4- تاثیر ہی بیاں میں نہ ہو جب تو کیا کروں
کیا اپنا حال ان کو سناتا نہیں ہوں میں

5- ہاں اس ادا سے آج اٹھا دے حجاب کو
پھر عمر بھر نقاب نہ سمجھوں نقاب کو

6- دیکھا تجھے اور دیکھنے کی طرح سے دیکھا
یہ پہلی خطا تھی جو ہوئی میری نظر سے

7- کوئی دیکھے ان کی دزدیدہ نگاہی کے فریب
کوئی پوچھے جان لینا کون سا اعجاز ہے

8- روح بھی پھونکیں تنِ بیجاں میں ہم تو کچھ نہیں
تم کسی کو مار بھی ڈالو تو وہ اعجاز ہے

شوکت تھانوی نے اپنی شاعری کی ابتداء تو غزل سے کی لیکن انتہا نظم پر ہوئی ۔ عمر کی آخری دہائی میں وہ غزل کی بجائے نظم پر زیادہ توجہ دیتے تھے ۔ مشاعروں میں زیادہ تر طنزیہ اور مزاجیہ نظمیں پڑھ پڑھ کر وہ مشاعرہ لوٹ لیا کرتے تھے ۔ "گہرستان" میں جو شوکت تھانوی کی غزلوں کا مجموعہ ہے چند نظمیں بھی ملتی ہیں ۔ پہلی نظم "محمد عربی صلعم کے عنوان کے تحت "مسدس" کی ہیئت میں لکھی گئی ہے ۔ اس کے 33 بند ہیں ۔ دوسری نظم "نذر حبیب"

کے عنوان کے تحت ، تیسری نظم " سکوتِ شب " اور چوتھی نظم " شاعر کا مذہب " کے عنوان کے تحت شامل کی گئی ہیں - یہ چاروں نظمیں اس مجموعہ کے صفحہ 185 سے 207 تک پھیلی ہوئی ہیں - ان چار نظموں کے علاوہ جو باقاعدہ کسی مجموعے میں شامل کی گئی ہیں شوکت تھانوی نے نظموں کی اور کوئی کتاب ترتیب نہیں دی ، حالانکہ نظم سے ان کا شغف تا آخر رہا - لیکن ان نظموں کو کتابی صورت میں پیش کرنے کا وقت شاید ان کے پاس نہیں تھا - اس لئے ان کے انتقال کے بعد چند کتابیں ان کے دوستوں اور مداحوں نے مرتب کرکے قارئین کے سامنے پیش کی ہیں - ان میں سے ایک کتاب کا نام " غم غلط " ہے جسے بیگم رفعت جہاں عرشی اور آنسہ زہرہ عرشی نے مرتّب کیا - یہ مجموعہ دہلی پرنٹنگ پریس ، رامپور ، اپریل و مئی 1966ء میں شائع ہوا - اس میں تئیس نظمیں (23) چند رباعیات اور قطعات شامل ہیں - ایک اور کتاب " اردو کے چار مزاحیہ شاعر " مرتبہ احمد جمال پاشا ہے جسے " شاہکار کتاب " کے تحت سید قاسم محمود نے مکتبۂ شاہکار پوسٹ بکس نمبر 1754 - لاہور سے 15 ، جون 1976ء کو الجدہ پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا - اس کتاب میں چار شاعروں (1) ظریف لکھنوی ، (2) شوکت تھانوی ، (3) سید محمد جعفری ، (4) مجید لاہوری کا کلام شامل کیا گیا ہے - اس کتاب میں شوکت تھانوی کی صرف بارہ نظمیں شامل کی گئی ہیں جن میں سے کچھ " غم غلط " میں بھی شائع ہوچکی ہیں - چند اہم نظمیں نقوش کے شوکت نمبر اور " کتاب " لکھنو کے شوکت نمبر میں شامل کی گئی ہیں - یہ وہ نظمیں ہیں جو پہلے شائع ہوچکی تھیں - " نقوش " کے شوکت نمبر میں پانچ نظمیں شامل ہیں - (1) شاعر کی بیوی ، (2) مری ، (3) آشنا ، (4) کراچی کی بسیں ، (5) الوداع - ماہنامہ " کتاب " لکھنو جولائی 1963ھ کے شوکت نمبر میں چار نظمیں شامل کی گئی ہیں -

(1) روح رواں وطن ، (2) فیملی پلاننگ ، (3) مد وجزرِ صحافت ، (4) اگر میں وزیر ہوتا ۔

ریڈیو پاکستان کے مشاعروں میں شوکت تھانوی نے کچھ نظمیں پڑھی ہیں جن میں سے پانچ راقم کو مل سکی ہیں اسی طرح روزنامہ "جنگ" میں ان کی چھ نظمیں شائع ہوئی ہیں ۔ راقم کے پاس شوکت تھانوی کی پینسٹھ (65) نظمیں موجود ہیں ۔ ان پینسٹھ نظموں کے حوالے سے ان کی نظم نگاری کا کچھ جائزہ لیا جا سکتا ہے ۔

شوکت تھانوی کی نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی نظم نگاری کی خصوصیات ان کی غزل گوئی کی خصوصیات سے ملتی جلتی ہیں ۔ نظم میں بھی وہ زبان و بیان کا خاص خیال رکھتے ہیں ۔ تشبیہات ، استعارہ اور صنعتوں کے استعمال سے اپنے بیان کو خوبصورت بنانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ شگفتگی اور روانی جو غزل میں نظر آتی ہے وہی نظم میں بھی موجود ہے ۔ ان خصوصیات کے علاوہ شوکت تھانوی کی نظم نگاری کی چند اہم خصوصیات یہ ہیں :-

روحِ عصر کا آئینہ :-

شوکت تھانوی کی نظموں میں شروع سے آخر تک وہ عنصر چھایا ہوا ہے جسے " روحِ عصر " کہتے ہیں اور جدید اصولِ تنقید کی رُو سے جس کے بغیر ادب صحیح معنوں میں ادب نہیں ہوتا ۔ دبستانِ لکھنو کی شاعری میں یہ عنصر سِرے سے مفقود تھا ۔ کسی شاعر کو اپنے ماحول اور زمانے سے کوئی سروکار نہیں رہا ۔ شوکت تھانوی جب تک لکھنو رہے ، غزل کہتے رہے ، پاکستان بننے کے بعد انہوں نے نظم نگاری کی طرف توجہ کی ۔ اس دور کے

کلام کو روح عصر کا آئینہ قرار دیا جا سکتا ہے چونکہ حالات و واقعات کی جیسی زندگی سے معمور تصویریں شوکت تھانوی نے ہم کو دی ہیں وہ ان کے عہد کے کسی اور شاعر کے ہاں مشکل ہی سے نظر آئیں گی ۔ ان کی ایک نظم " دانۂ گندم " کے دو بند ملاحظہ کیجئے اس نظم میں انہوں نے چور بازاروں اور ذخیرہ اندوزوں کو کھری کھری سنانے کی کوشش کی ہے ۔

حضرت آدم پہ جو گذری ہے سب کو یاد ہے
دانۂ گندم کی زندہ آج تک بیداد ہے
آج پھر اولاد آدم پر وہی افتاد ہے
اس کا بانی بھی فرشتوں کا وہی استاد ہے
دور دورہ آج اس کا چور بازاروں میں ہے
ماہرینِ چور بازاری کے غم خواروں میں ہے

ان میں دیکھا اس کا جلوہ جو ذخیرہ باز ہیں
دفن تہہ خانوں میں جن کے بوریوں کے راز ہیں
بوریوں سے ملتے جلتے توند کے انداز ہیں
اور فریاد و بکا میں سب کے ہم آواز ہیں
توند پر ہے ہاتھ اور فاقوں سے حالت زار ہے
ان کو ایندھن اس جہنم کے لئے درکار ہے [1]

ایک اور نظم " شاعر کی بیوی " میں انہوں نے بہت خوبصورت انداز میں اپنے معاشرے کی سوچ پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ زمانہ مادیت پرست ہوتا جا رہا ہے اس لئے فنون لطیفہ کی قدر ختم ہوتی جا رہی ہے ۔ حد یہ ہے کہ

---

[1] شوکت تھانوی : غم غلط (مرتبہ بیگم رفعت جہاں عرشی ، آنسہ زہرہ عرشی) ص: 63 ، 64 ۔

شاعر اور اس کی بیوی کے نظریات میں بھی اختلاف ہے ۔

وہ یہ کہتی ہے کہ جائے بھاڑ میں یہ شاعری
ایڑی چوٹی پر کروں قربان یہ کاریگری
اتنے دن سے کوئی بھی پیسہ ملا سوچو ذری
یاد کرلو خود دسمبر ، جنوری ، پھر فروری

تم ہی سوچو کس طرح ہوگا ہمارا اب نباہ ؟
مجھ کو روٹی چاہئیے ، اور تم کو خالی واہ واہ [1]

شوکت تھانوی کو عمر کی آخری دہائی میں طنز و مزاح کا شاعر کہا جاتا رہا ۔ اس دور میں ان کی مقبولیت کا بڑا سبب طنزیہ و مزاحیہ کلام ہی ہے ۔ مزاح کے مقابلے میں طنز ایک سنجیدہ چیز ہے ۔ یہ عموماً نفرت و حقارت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے اور وہ ہے معاشرے کی لکیر سے ہٹ جانے والے پر ضربیں لگانا اور اسے لکیر پر واپس لے آنا ۔ طنز نگار ، حماقتوں ، برائیوں ، گناہوں ، بد دیانتیوں اور منافقوں کو نفرت اور حقارت کے تیروں سے چھلنی کر دینا چاہتا ہے اس لئے طنز نگار وہی ہوسکتا ہے جس کا ایک طے شدہ نقطۂ نظر ہو اور وہ اس نقطۂ نظر کے ساتھ وفاداری بشرطِ استواری کا رشتہ رکھتا ہو ۔ شوکت تھانوی کے ہاں طنزیہ اور مزاحیہ عنصر غزل کی بجائے نظم میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے ۔ ان کی کم و بیش ہر نظم میں اس انداز کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے ۔ ان کی نظم "کراچی کی بسیں" سے ایک مثال :

---

[1] شوکت تھانوی : غم غلط (مرتبہ بیگم رفعت جہاں عرشی ، آنسہ زہرہ عرشی) ، ص : 34 ۔

دلربا اے نازنینو ! اے کراچی کی بسو
تم پہ صدقہ ہو کے ہم مرجائیں لیکن تم جیو
کج روی بھولے فلک اب چال تم ایسی چلو
ہم تو خود ہی چل بسیں گے تم مگر چلتی رہو
تم پہ ہم عشاق کا چلتا نہیں جب کوئی بس
بیٹھ کر پڑھتے ہیں ہم اللہ بس باقی ہوس
کاش اپنے عشق کے ماروں کا کرتیں تم شمار
جو ہر اِک اڈے پہ لٹکے ہیں قطار اندر قطار
اپنے پہلو میں دبائے اک دلِ بے اختیار
اور نظروں سے گرائے زندگی کا اعتبار
اس قدر لمبی قطار اور زندگانی مختصر
گھر پہنچنے سے تو ہے آسان دنیا سے سفر

ہو کے چکنا چور اترے بس سے با حالِ خراب
جیسے بندر نوچ کر پھینکے منڈیری سے کتاب
اس زبوں حالی پہ بھی خوش ہیں کہ ہم ہیں کامیاب
مل گئی ہے گھر کی جنت جھیل کر یوم الحساب
رات بھر یہ بس رہے گی ذہن پر اپنے سوار
صبح دم ہم پھر وہی ہوں گے وہی اپنی قطار [1]

ایک اور نظم " الوداع " میں طنز کے چند نشتر ملاحظہ کیجئے :

چور بازاری گرانی الوداع
دودھ میں اے نل کے پانی الوداع

---

[1] شوکت تھانوی : کراچی کی بسیں ، نقوش شوکت نمبر ، ص: 332 ، 333 -

گھی کے اندر موبل آئل الفراق
تیری معدوں میں روانی الوداع
اب کہاں مکھن پہ مرہم کا گمان
اے گمانِ بد گمانی الوداع
اے پس اینٹھو نہیں موچوں میں تم
تم نے بھی رحلت کی ٹھانی الوداع
سچ تو یہ ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس
الوداع اے من کی مانی الوداع [1]

پیروڈی :-

شوکت تھانوی کے یہاں طنز و مزاح پیدا کرنے کا ایک اہم حربہ تحریف یا پیروڈی ہے ۔ پیروڈی کسی مشہور فن پارے میں جزوی تبدیلی کرکے اسے نیا مفہوم عطا کرنے کا نام ہے ۔ ذیل میں چند اشعار شوکت تھانوی کے تحریف شدہ اشعار کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں تا کہ تحریف کی نوعیت کا اندازہ ہوسکے ۔

غالب :- اگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

شوکت تھانوی:- اگ رہا ہے تیرے رخسار پہ سبزہ غالب
تو ہے سجدے میں ترے رخ پہ بہار آئی ہے

---

[1] شوکت تھانوی : " الوداع " نقوش شوکت نمبر ، ص : 334 ۔

اقبال :-

قہاری و غفاری و قدوس و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

شوکت تھانوی :-

پتلون یہ اک کوٹ ہو کالر یہ ہو ٹائی
یہ چار عناصر ہوں تو انسان ہے انگریز

اسماعیل میرٹھی :-

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا
کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا

شوکت تھانوی :-

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا
جو کھوٹا تھا کل تک کھرا ہو گیا

ذوق :-

اے ذوق تکلّف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہیں جو تکلّف نہیں کرتے

شوکت تھانوی :-

اے ذوق شکر خوری ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہیں جو شکر ہی نہیں کھاتے

داغ دہلوی :-

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر ، لہو پکارے گا آستیں کا

شوکت تھانوی :-

اگر یہی اپنی اصلیت ہے تو اس کو کب تک چھپا سکیں گے
جو چپ رہے گی زبان قینچی تو دھار چمکے گی استرے کی

مرزا شوق لکھنوی :-

آخری پان اک لگا تے جائیں
یاد اپنی انہیں دلاتے جائیں

شوکت تھانوی :-

ساتھ تصویر اک کھنچاتے جائیں
یاد اپنی تمہیں دلاتے جائیں

شوکت تھانوی عام طور پر مشاعروں میں پڑھنے کے لئے نظمیں کہا کرتے تھے اس لئے ان کی نظموں میں عوامی رنگ کی جھلک نمایاں ہے - قیام پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان سے نشر ہونے والے ڈرامے " قاضی جی " نے ان کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا اسی لئے جب وہ مشاعرے میں پڑھتے تھے تو ان سے لوگ یہی توقعات وابستہ کرتے تھے کہ وہ عوامی انداز میں ہلکی پھلکی نظمیں سنا کر لوگوں کو محظوظ کریں - شوکت تھانوی نے اپنی نظموں میں عوام کے جذبات کی ترجمانی کی اور عوام نے انہیں بہت دیر تک یاد رکھا - اپنی ایک نظم " فیملی پلاننگ " میں انہوں نے عوام کو بتایا کہ یہ کیوں ضروری ہے :- [1]

ہم نے یہ مانا کہ پیدا ہوگیا کھائے گا کیا ؟

گھر میں دانے ہی نہ پائے گا تو بھنوائے گا کیا ؟
اس نکھٹو باپ سے مانگے گا کیا ؟ پائے گا کیا ؟

دیکھ کہنا مان لے جانِ پدر ، پیدا نہ ہو
اے مرے بچے ! مرے لختِ جگر پیدا نہ ہو [1]

دبستانِ لکھنو کے شاعر مناظر فطرت کی تصویر کشی میں مہارت رکھتے ہیں - شوکت تھانوی نے بھی یہ خصوصیت وہیں سے حاصل کی ہے - وہ مناظرِ فطرت

---

[1] شوکت تھانوی : غم غلط ، مرتبہ بیگم رفعت جہاں عرشی ، آنسہ زہرہ عرشی مطبوعہ دہلی پرنٹنگ پریس رامپور ، 1966ء ، ص : 15

کے ساتھ ساتھ اپنے معاشرہ کی تصویر بھی اپنی نظموں میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں ، ڈاکٹر وحید قریشی اس بات پر زور دیا کرتے ہیں کہ مفید ترین آرٹ وہ ہے جو خدا کی بزرگی و شان ہم پر آشکارا کرے اگر شوکت تھانوی کی منظر نگاری کو دیکھا جائے تو اس میں کائنات کی ایسی دلکش جھلک ملتی ہے جو خدا کی بزرگی اور عظمت کی طرف برابر متوجہ کرتی رہتی ہے ۔ شوکت تھانوی کی ایک نظم " مری " کے دو بند دیکھیے :

اے مری اے گرمیوں میں اہل دولت کے وطن
اے چمن اندر چمن ، اور اے چمن اوپر چمن
اف تری رعنائیاں ، اللہ رے یہ بانکپن
جنتِ کشمیر کی بے شک ہے تو چھوٹی بہن
میں تو کہتا ہوں زمانے میں ترا ثانی بھی ہے
تجھ میں خوباں بھی بہت ہیں اور خوبانی بھی ہے

زندگی ہی زندگی ہے نام ہے لیکن مری
خود ہی کوہِ قاف ہے تو اور خود اس کی پری
مال پر اللہ اکبر حسن کی کاریگری
عشق پر طاری ہے جس کو دیکھکر اک تھرتھری
یہ بناوٹ یہ سجاوٹ یہ نکھار اور یہ پھبن
اے مری اے گرمیوں میں اہل دولت کے وطن [1]

شوکت تھانوی کی شہرت کا زیادہ تر دار و مدار ان کی غزل گوئی اور نظم نگاری پر مبنی ہے لیکن وہ محض نظم اور غزل کے شاعر ہی نہیں تھے ۔

---

[1] شوکت تھانوی : " مری " نقوش شوکت نمبر ، ص : 329 ۔

نظموں اور غزلوں کے علاوہ ان کے کلام میں دیگر اصناف سخن کا بھی وافر ذخیرہ ہے ۔ ان کی تخلیقات میں مرثیہ ، نعت ، رباعی ، قطعہ اور سہرا شامل ہیں ۔

شوکت تھانوی نے جو مرثیہ تحریر کیا وہ دبستان انیس راولپنڈی کی تحریک پر لکھا گیا اور سب سے پہلے دبستان انیس میں 1960 ء میں پڑھا گیا ۔ دبستانِ انیس کے تعارف میں سیّد سبط حسن رضوی لکھتے ہیں ۔

> " اس موقع پر ہم کو دوسرے مرحومین بھی یاد آرہے ہیں جنہوں نے دبستانِ انیس کی محفلوں کو رونق بخشی تھی جیسے جناب عبدالعزیز فطرت ، زیبار دولوی ، ندیم بدایونی ، عبدالحفیظ تاثیر ، عابد علی عابد ، شوکت تھانوی ، ڈاکٹر انعام الحق (ڈھاکہ) مختار صدیقی ، باقی صدیقی ، حفیظ ہوشیار پوری ، اور ممتاز حسن احسن ۔ " [1]

یہ مرثیہ 52 بندوں پر مشتمل ہے ۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا حال اس میں بیان کیا گیا ہے ۔ نقوش کے شوکت نمبر اور کتاب لکھنو کے شوکت نمبر میں صرف 17 بند دئیے گئے ہیں ۔ دونوں رسالوں کے بندوں میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ راقم نے یہ پورا مرثیہ زہرا شوکت کی لائبریری (لاہور) میں دیکھا ہے ۔ اس کے کچھ بند روز نامہ " جنگ " راولپنڈی میں چھپے ہیں اور کچھ بند دبستان انیس راولپنڈی کے یادگاری مجلہ 1974 ء میں شائع ہوئے ہیں ۔ مرثیہ نگاری بہت مشکل فن ہے ۔ غالب اور میر تقی میر جیسے استاد جب مرثیہ کہنے بیٹھے تو چند بندوں کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکے اور اس بات کا

---

[1] سیّد سبط حسن رضوی : دبستان انیس ، راولپنڈی کا یادگار مجلہ " انیس " بسلسلہ صد سالہ برسی ، 10 ، دسمبر 1974 ء ، تعارف ص : ح

اعتراف کر لیا کہ مرثیہ کہنا ایک مشکل کام ہے ۔ شوکت تھانوی کسی کام کو مشکل نہیں سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے دبستانِ انیس راولپنڈی کے تحت منعقد ہونے والی مرثیوں کی سالانہ مجالس میں مرثیہ پڑھنے کا وعدہ کیا اور پھر اس وعدہ کو نبھایا اس مرثیہ میں فلسفہ غم کا تجزیہ انہوں نے بڑی خوبی کے ساتھ کیا ہے :

دراصل غم ہے ٹھوس حقیقت، خوشی سراب
تعبیر غم ہے اور خوشی صرف ایک خواب
قلزم صفت ہے غم تو مسرت فقط حباب
دیباچہ انبساط ہے غم مستقل کتاب
تاریخ ہم نے پائی ہے اپنی ملال میں
ڈھونڈا خوشی کو جب تو ملی وہ خیال میں

غم پائیدار اور خوشی مستعار ہے
غم معتبر خوشی کا کسے اعتبار ہے
اس زندگی کا غم ہی پہ دار و مدار ہے
محور بہ غم کے گردشِ لیل و نہار ہے
آرام کا وجود ہے آزار کے لئے
پھولوں میں پل رہا ہے چمن خار کے لئے

بزمِ ازل نے غم کے سوا ہم کو کیا دیا
اشکوں میں خاک گوندھ کے انساں بنا دیا
تیری سرشت غم ہے یہ ہم کو بتا دیا
پھر حکم یہ قضاؤ قدر نے سنا دیا
انسان غم سے ربط بڑھاتا ہوا چلے
روتا ہوا یہ آئے رلاتا ہوا چلے

اپنی تو ابتداء بھی ہے غم انتہا بھی غم
اپنا مرض بھی غم ہے اور اس کی دوا بھی غم
کچھ اور چاہتا ہے دلِ مبتلا بھی غم
جی چاہتا ہے مانگ لیں غم کے سوا بھی غم

ہم اور خدانخواستہ ہم کو خوشی ؟ نہیں
اک طنز ہے خوشی پہ لبوں پر ہنسی نہیں [1]

فلسفہ غم مرثیہ کے "چہرہ" میں بیان کیا گیا ہے - گریز میں شوکت تھانوی نے بہت مہارت کا ثبوت دیا ہے اور ایک ہی بند میں گریز کر کے اصل مقصد کی طرف آتے ہیں :

آ اے قلم کہ تجھ کو سعادت عطا کریں
جنبش میں تجھ کو لائیں ترا حق ادا کریں
جس غم میں مبتلا ہیں تجھے مبتلا کریں
تیری زبان سے ذکرِ شہِ کربلا کریں
ذکرِ حسین اصل میں ذکرِ رسول ہے
یہ وہ مماثلت ہے جو سب کو قبول ہے [2]

شوکت تھانوی نے اس مرثیہ میں واقعہ نگاری کا کمال بھی دکھایا ہے انہوں نے جہاں بھی واقعہ نگاری کی ہے نمایاں جزئیات کا پورا خیال رکھا ہے۔

---

[1] شوکت تھانوی : مرثیہ در حال حضرت امام حسین علیہ السلام مطبوعہ دبستانِ انیس راولپنڈی کا یادگار مجلہ "انیس" بسلسلہ صد سالہ برسی ۱۰ ، دسمبر 1974ء ، ص: 423 ، 424 -

[2] ایضاً ص: 424 -

اور واقعات کی مختلف کڑیوں کو اس طرح ملایا ہے کہ پورا سلسلہ نہایت مربوط انداز میں نظر کے سامنے پھر جاتا ہے ۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا " اردو کی قدیم اصنافِ شعر " میں واقعہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں :

> " واقعہ نگاری کا کمال یہ نہیں کہ ہر قسم کی تفصیلات اور جزئیات کو بلا کم و کاست بیان کردیا جائے بلکہ یہ ہے کہ ایسی تفصیلات کا انتخاب کیا جائے جو تمام واقعہ کو سامنے لے آئیں کیونکہ کوئی واقعہ جب سامنے آتا ہے تو نگاہیں صرف نمایاں جزئیات پر پڑتی ہیں ۔" [1]

شوکت تھانوی نے اس مرثیہ میں جب واقعہ نگاری سے کام لیا ہے تو انہوں نے ایسی تفصیلات کا انتخاب کیا ہے جس سے اس واقعہ کے اسباب کا پتہ چلتا ہے : ؎

وہ سوچتے تھے آج جو ہوتے یہاں رسول
کیا ان مطالبات کو کرلیتے وہ قبول
واقف ہے خود یزید ہمارا ہے کیا اصول
پھر بحث اس نے چھیڑی ہے ہم سے یہ کیا فضول
کیا واقعی نہیں ہیں ٹھکانے اب اس کے ہوش
سمجھا ہے اس نے ہم کو بھی شاید خدا فروش

میں بیچ دوں رسول کی غیرت ، نہیں نہیں
قرآن کی اور ختم ہو عظمت ، نہیں نہیں
ہو داغ دار کعبہ کی حرمت ، نہیں نہیں
میں اور کروں یزید سے بیعت ، نہیں نہیں

---

[1] ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا : اردو کی قدیم اصنافِ شعر ، ص: 246 ، مطبوعہ استقلال پریس ، لاہور 1967ء

سن لے بگوش ہوش کہ انکار ہے مجھے
اور ایک بار بھی نہیں سو بار ہے مجھے

اب کیا تھا اک گھمشاس اٹھی فوجِ شام کی
کوندی افق پہ برق سی اک انتقام کی
ہر چند تھی وہ فوج بڑے احتشام کی
خاطر میں اس کو لائی نہ عظمت امام کی
کثرت سے کیا ڈرے کہ جو وحدت پرست ہو
یہ عزم وہ نہ تھا کہ جو اس طرح پست ہو[1]

شوکت تھانوی نے اس مرثیہ میں زبان و بیان کا خاص طور سے خیال رکھا ہے ۔ یہ خصوصیت ان کی غزل اور نظم میں بھی اپنے پورے عروج پر نظر آتی ہے اور یہاں مرثیہ میں بھی یہ خصوصیت موجود ہے اس کی وجہ لکھنوی ماحول میں تربیت ہے ۔ منظر نگاری ، واقعہ نگاری اور کردار نگاری بھی اس مرثیہ کی اہم خصوصیات ہیں ۔ مختصر یہ کہ ان کے مرثیہ میں دلنشین الفاظ کی اتنی بہتات ہے کہ ہر شعر دل میں اترتا چلا جاتا ہے ۔

شوکت تھانوی کے مجموعۂ کلام " گہرستان " میں دو نظمیں نعتیہ ہیں ۔ پہلی نظم " محمد عربی صلعم " ہے جو مسدّس کی ہیئت میں لکھی گئی ہے اور یہ نظم 33 بندوں پر مشتمل ہے ۔ دوسری نظم " نذرِ حبیب " کے عنوان کے تحت لکھی گئی ہے ۔ یہ غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے اور 21 اشعار پر مبنی ہے ۔ پہلی نعت " محمد عربی صلعم " میں شوکت تھانوی نے اسلام سے

---

[1] شوکت تھانوی : شہادت عظمیٰ ، مطبوعہ ماہنامہ کتاب لکھنو شوکت تھانوی نمبر ، جولائی 1963ء ، ص: 96 ، 97 ۔

قبل کے حالات پر روشنی ڈالی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ہر طرف بت پرستی اور توہم پرستی کا دور دورہ تھا اور انسانیت کا رتبہ دن بہ دن پست سے پست تر ہوتا جا رہا تھا ۔ ایسے حالات میں حضور صلعم کا ظہور ہوا ۔ وہ کہتے ہیں کے

اتنے میں اک بندۂ اعلیٰ
عرشِ بریں سے بھی کچھ بالا
حق کی بات بتانے والا
نورِ حق کا لئے اجالا

چوٹی پر فاران کی آیا
شمعِ ہدایت ساتھ میں لایا

سارے جہاں کو کیا منّور
پھیلا اُجالا اس کا گھر گھر
کام جو تھے طاقت سے باہر
ان کو سنوارا آ کر یکسر

بولا خدا ہے ایک تمہارا
اس کا ہے یہ عالم سارا

اس کا ہمسر کوئی نہیں ہے
اس کے برابر کوئی نہیں ہے
اس سے بہتر کوئی نہیں ہے
اس سے باہر کوئی نہیں ہے
ایک رہا ہے ایک رہے گا
جو چاہے گا وہی کرے گا [1]

---

[1] شوکت تھانوی : گہرستان ، (محمد عربی صلعم) ص: 195 ۔

اس نعت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کو اس طرح نظم کرتے ہیں ؎

چھوڑو غرور اور سر کو جھکاؤ
شانِ ایزد سب کو دکھاؤ
ایک بنو اور ایک بناؤ
تفرقۂ باہم کو مٹاؤ

رمز ہے یہ اس رمز کو پاؤ
آؤ آؤ آؤ آؤ

آپس میں مل جانا اچھا
مل کر راہ پہ آنا اچھا
مل کر حق کو پانا اچھا
ملنا اور ملانا اچھا

جو اس دین کے شیدائی ہیں
آپس میں وہ سب بھائی ہیں

گمراہی سے سب کو نکالو
ڈوبتے ہیں جو ان کو بچا لو
حالت کو ہر اک کی سنبھالو
سب کو اپنے گلے لگا لو

بندۂ حق ہیں سب انساں ہیں
دوستی کے یہ سب شایاں ہیں [1]

---

[1] شوکت تھانوی: گھرستان، شوکت بک ڈپو، لکھنو، ص: 197، 198۔

شوکت تھانوی کی صرف آٹھ مطبوعہ نعتیں دستیاب ہو سکی ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شوکت تھانوی نے خواجہ الطاف حسین حالی کی جدید شاعری کی تحریک کا اثر قبول کیا ہے اور انہوں نے نعت کو حصول سعادت اور تسکین خاطر کا ذریعہ سمجھا ہے ۔

شوکت تھانوی نے رباعیات اور قطعات اپنے اخباروں کے لئے تحریر کئے ہیں ۔ روزنامہ " طوفان " میں جس کے شوکت تھانوی خود ہی مالک تھے اور خود ہی مدیر ، انہوں نے جو رباعیات اور قطعات لکھے ہیں اس پر درج ہے " " طوفان کے خاص شاعر کے قلم سے " اور وہ خاص شاعر خود شوکت تھانوی ہی تھے ۔ ان کی رباعیات اور قطعات کا ذخیرہ زیادہ تر " طوفان " میں ہی موجود ہے ۔ شوکت تھانوی کی رباعیات و قطعات اپنے ماحول کے آئینہ دار ہیں ۔ اس زمانہ کے افراد اور خاص طور سے مسلمان جن خرابیوں میں مبتلا تھے ان کی عکاسی شوکت تھانوی نے اپنی رباعیات اور اپنے قطعات میں کی ہے ۔ ان کی رباعیات کی تعداد 16 اور قطعات کی تعداد صرف 12 ہے ۔ 11 ، مئی 1938ء کے " طوفان " میں طوفان کی آمد پر جو رباعی کہی وہ یہ ہے ۔

طوفان آتے ہیں گو مٹانے کے لئے
بنیادِ زمانہ کو ہلانے کے لئے
لیکن یہ ہے اپنی نوعیت کا طوفاں
آیا ہے یہ سوتوں کو جگانے کے لئے [1]

اس رباعی سے ان کے اخبار " طوفان " کی آمد کا مطلب واضح ہوتا ہے کہ مسلمان قوم جو اس وقت سو چکی تھی اسے جگانے کے لئے یہ اخبار جاری

---

[1] شوکت تھانوی : روزنامہ " طوفان " لکھنؤ ، 11 ، مئی 1938ء

کیا گیا ہے ۔

شوکت تھانوی کی صحافت اور شاعری سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ مسلم لیگ کے زبردست حامی تھے اور قائداعظم کی قیادت کو درست سمجھتے تھے ۔ جناح نہرو خط و کتابت کے موضوع پر انہوں نے اپنے اخبار کے لئے ایک رُباعی کہی جو 17 ، جون 1938ء کے " طوفان " میں شائع ہوئی :

صلح کی کوشش ہو کیونکر کامیاب
مصلحت جب ہے حجاب اندر حجاب
لیگ نے جو کانگریس کو خط لکھے
آئیں بائیں شائیں ہے ان کا جواب [1]

شوکت تھانوی کی رُباعیات میں مسلمانوں کو اتحاد واتفاق کا درس دیا گیا ہے اور اس طرح ان کی رُباعیات خواجہ الطاف حسین حالی کی رُباعیات کے قریب تر ہوجاتی ہیں ۔ ان کی رُباعیات و قطعات میں اِصلاحی پہلو کے ساتھ ساتھ اندازِ بیاں کی شگفتگی اور تازگی بھی ہے ۔ شوکت تھانوی کے زمانے میں مُسلم لیگ اور کانگریس کی سیاست اپنے عروج پر تھی اس لئے حساس اور باشعور انسان کو ان دونوں میں سے کسی ایک کی حمایت کرنا تھی ۔ باشعور مسلمان مسلم لیگ میں شامل تھے ۔ شوکت تھانوی کی تمام رُباعیات اور قطعات مسلم لیگ کی حمایت میں اور کانگریس کی نفی مذمّت میں تحریر کی گئی ہیں جس سے شوکت تھانوی کا نظریہ سیاست آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے ۔

---

[1] شوکت تھانوی : روزنامہ " طوفان " لکھنؤ
17 ، جون 1938ء ۔

شوکت تھانوی نے کچھ سہرے بھی لکھے۔ ان کے مطبوعہ سہرے تعداد میں کل چھ ہیں۔ جن میں سے دو سہرے سنجیدہ اور چار مزاحیہ ہیں۔ سنجیدہ سہروں میں ایک ان کے بیٹے خورشید عمر کا سہرا ہے اور دوسرا کرکٹ کے مشہور کھلاڑی جناب حنیف محمد کا۔ باقی چار سہرے ان کے ناولوں میں ، ان کے کرداروں کی زبانی ضرورتاً شامل کئے گئے ہیں۔

خورشید عمر کا سہرا صرف سات اشعار پر مبنی ہے۔ شوکت تھانوی نے بوجوہ اپنے بیٹے کی شادی میں شرکت کرنے سے انکار کردیا تھا لیکن ایک سہرا لکھ بھیجا جو اس شادی میں پڑھا گیا۔

گوندھ کر لاؤ میرے تارِ نظر کا سہرا
میرے بیٹے میرے خورشید عمر کا سہرا
سیم و زر کا ہے نہ ہے لعل و گہر کا سہرا
ہے سعیدہ کی دعاؤں کے اثر کا سہرا

اور مقطع تھا کہ

حاصل زیست ہے یہ دن کہ ہے دیکھا شوکت
شبِ امید کی تابندہ سحر کا سہرا [1]

خورشید عمر اپنے ایک مضمون میں اس سہرے کے بارے میں لکھتے ہیں :

" شادی کے روز یہ سہرا میرے چھوٹے بھائی بابا نے پڑھا اور جس نے بھی سنا اسے اس قدر پسند آیا کہ اس نے بار بار پڑھنے کی فرمائش کی۔ میرے خسر جناب ایم۔ اے۔ رشید صاحب نے سہرے کو سن کر بے ساختہ کہا " یہ سہرا کوئی بڑے سے بڑا شاعر نہیں کہہ سکتا صرف باپ ہی کہہ

---

[1] شوکت تھانوی : سہرا (خورشید عمر) نقوش شوکت نمبر
ص: 466 ۔

سکتا ہے۔" پتہ نہیں اس سہرے میں کیا بات تھی۔ شاید جذبات کی اس قدر فراوانی تھی کہ جس نے بھی سنا آنکھ میں آنسو بھر لایا۔[1]

کرکٹ کے مشہور کھلاڑی حنیف محمد کی شادی کے موقع پر شوکت تھانوی نے جو سہرا لکھا اس میں انہوں نے مزاح کے پھول کھلائے ہیں:

رن بنانے کے لئے دوڑ نہ جائیں یہ کہیں
باندھئے سر پر اس شخص کے کس کر سہرا
سنچری بیٹ تو بے شک ہے ہمارا دولہا
اب نئے کھیل کے دیکھے گا یہ جوہر سہرا
چھکے چھوٹے نہ کہیں چھکے لگائے تو بہت
سونپ دے تم کو نہ اولاد کا لشکر سہرا
یہ کرکٹ کی نہیں شادی کی پچ ہے حضرت
اب ذرا باندھئے اس پر بھی تو جم کر سہرا

مقطع ہے۔

داد دی میں نے بھی دولہا کو جو دیکھا شوکت
ویل ڈن باندھ لیا تو نے بھی سر پر سہرا[2]

یہ سہرا نو اشعار پر مبنی ہے اور ہر شعر شوکت تھانوی کی شوخی و شگفتگی کا شاہکار ہے۔

---

[1] خورشید شوکت: پیارے ابا: نقوش شوکت نمبر۔ ص: 466۔

[2] شوکت تھانوی: حنیف محمد کا سہرا: اردو کے چار مزاحیہ شاعر مرتبہ احمد جمال پاشا۔ شاہکار کتاب 37۔ مکتبہ شاہکار، لاہور 1976ء، ص: 15۔

چار سہرے شوکت تھانوی کے ناولوں اور ڈراموں سے لئے گئے ہیں۔ ان میں سے پہلا سہرا ان کے ناول " سپنے " سے لیا گیا ہے جس میں میر صاحب بات بات پر شعر سناتے ہیں۔ اکرام کی شادی پر وہ نیا سہرا تو نہیں لکھ سکے البتہ کسی پرانے سہرے کے چند اشعار انہیں یاد آگئے تو انہوں نے وہی سنانا شروع کردئیے۔ یہ سہرا محمود کے لئے لکھا گیا تھا اور دلہن کا نام سرور جہاں تھا :

نظر آتا ہے کچھ اوقات سے باہر سہرا
یوں گز دولہا کا دیکھے کوئی گز بھر سہرا
گھر میں اک باندھے ہوئے بیٹھی ہیں سرور سہرا
دوسرا باندھے ہوئے آئے ہیں شوہر سہرا
بال بھی ہیں کہ چلے آئے حجامت کے لئے
باندھیے سر پہ ذرا سوچ سمجھ کر سہرا
ابھی بارات کا رخ رُو کی طرف پھیرا جائے
دیکھ لے کوئی اگر رخ سے ہٹا کر سہرا [1]

دوسرا سہرا شوکت تھانوی کے ایک ڈرامے " موقع " میں سے ہے یہ ڈراما ان کی کتاب " کھی کھی " میں شامل کیا گیا ہے۔ نجم الحسن، شیخ صاحب کی بیوی کے بھائی ہیں، جن کی شادی میں شرکت کرنے کےلئے شیخ صاحب اور ان کے بچے روانہ ہوتے ہیں۔ وہاں پہنچتے ہیں تو نجم الحسن کا ایک دوست نکاح سے پہلے ہی سہرا پڑھ رہا تھا۔ شیخ صاحب اسے منع کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ سہرا پڑھتا چلا جاتا ہے :

---

[1] شوکت تھانوی : سپنے ، مطبوعہ استقلال پریس ، لاہور بار سوم ، اپریل 1952
ص: 200 ، 201 ۔

شرما رہے ہیں دولہا گھونگٹ میں جیسے دلہن
نجم الحسن کے سر ہے ان کی دُلہن کا سہرا
ہیں عقل پر یہ پتھر یا سر پہ پھول ہیں یہ
بھولے سے باندھ آئے تم کو ہکسن کا سہرا
تو حسن کا ہے گاہک صورت تو دیکھ اپنی
اس چاند کے لئے ہے تجھ سے گہن کا سہرا
ہے جانگلوش دولہا ، جنگل کا رہنے والا
گلشن کا کیا کروگے منگواؤ بن کا سہرا
مسٹر کیسے بنائیں اور کیوں سنائیں آخر
کس چال ڈھال کا ہے اور کس چلن کا سہرا [1]

اسی طرح ان کے دو سہرے ان کے ایک ناول " دل پھینک " میں موجود ہیں - ان دونوں سہروں کا ایک ایک شعر :

اس طرح باندھ کے آیا ہے شوہر سہرا
باندھے آتا ہے میں سمجھی کوئی بندر سہرا [2]
+
باندھے ہوئے جو آئے پچھّن نواب سہرا
قسمت کو رو رہا ہے خانہ خراب سہرا [3]

---

[1] شوکت تھانوی : کبھی کبھی ، ادارۂ فروغ اردو ، لاہور ص: 173، 174، 175

[2] شوکت تھانوی : دل پھینک نسیم بک ڈپو لکھنؤ ص 105 -

[3] شوکت تھانوی : ایضاً " " ص: 165 -

شوکت تھانوی کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد اور ان کے کلام کی داخلی اور خارجی خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اردو شاعری میں وہ ایک خاص مقام رکھتے ہیں ۔ ان کے فن کا ممتاز پہلو یہ ہے کہ اس میں اجتہادی شان پائی جاتی ہے ۔ شوکت تھانوی نے بہت سے شاعروں کی زمینوں میں شعر کہے اور بعض اوقات تو ان کی تقلید پسندی بہت واضح انداز میں سامنے آتی ہے ۔ اس تقلید پسندی کے باوجود وہ اردو شاعری کی وسعت اور ہمہ گیری کے لئے زبان و بیان کے نئے نئے تجربوں کو بہت ضروری خیال کرتے تھے لیکن چونکہ ان کے ادبی اشغال متنوّع تھے اس لئے انہیں اتنی فرصت نہ مل سکی کہ وہ اپنی ان مصروفیتوں کو چھوڑ کر صرف شعر و سخن کے لئے اپنے آپ کو مخصوص کردیتے ۔ شوکت تھانوی نے روزی کمانے کے لئے صحافت کا انتخاب کیا تھا ۔ اس لئے صحافت میں داخل ہوتے ہی وہ نثر پر زیادہ توجہ دینے لگے ۔ صحافت کے بعد ریڈیو سے تعلق رہا ۔ وہاں بھی انہوں نے نثر ہی لکھی ۔ اس طرح ان کی توجہ نثر پر زیادہ رہی اور شاعری کی طرف کم ہوتی چلی گئی ۔ یہی وجہ ہے کہ 1934ء کے لگ بھگ ان کا ایک مجموعۂ کلام " گہرستان " کے نام سے شائع ہوا تھا ۔ اس کے بعد کوئی مجموعۂ کلام 1963ء تک یعنی ان کی زندگی میں منظر عام پر نہ آ سکا ۔ جبکہ انہوں نے ناولوں ، افسانوں اور مضامین کے مجموعوں کے ڈھیر لگا دئیے ۔

شوکت تھانوی کی صحافتی ذمہ داریوں اور ریڈیو کی مصروفیات کے باعث شعری سرمایہ بہت کم رہ گیا اور یہ بات بھی اپنی جگہ پر درست ہے کہ انہوں نے اپنے فن کو نکھارنے اور سنوارنے کی کبھی شعوری کوشش نہیں کی جو کچھ لکھا قلم برداشتہ لکھا ۔ ان کی زیادہ تر غزلیں مصرعہ طرح پر کہی گئی ہیں ۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بیشتر غزلیں مشاعروں میں پڑھنے کی

وجہ سے کہی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے نظمیں کہنا شروع کیں جن میں طنزیہ اور مزاحیہ انداز اختیار کیا۔ ان نظموں کی وجہ سے شوکت تھانوی کو عوام و خواص میں حیرت انگیز شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے اس حسنِ قبول کو دیکھ کر دوسرے شعراء نے بھی اسی رنگ میں نظمیں کہنا شروع کردی تھیں۔ شوکت تھانوی جس مشاعرے میں پہنچ جاتے تھے وہاں کسی اور شاعر کا رنگ جمنا مشکل ہوجاتا۔

شوکت تھانوی کی مقبولیت اور شہرت کا راز یہ تھا کہ انہوں نے اپنی افتادِ طبع اور مزاج کو ہی نہیں پہچانا تھا بلکہ اس زمانے کے رحجان اور لوگوں کے مذاق کو بھی سمجھ لیا تھا۔ نثر میں ان کی شہرت چونکہ ایک مزاح نگار کی حیثیت سے ہوچکی تھی اس لئے انہوں نے شاعری میں بھی طنز و مزاح کو اختیار کرکے مقبولیت حاصل کی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے عوام دکھوں اور مصیبتوں کا شکار ہیں اس لئے ان کے سامنے اس قسم کا ادب پیش کیا جائے کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے رنج و غم کو بھول جائیں۔ چنانچہ انہوں نے نثر اور شاعری دونوں میں طنز و مزاح سے کام لے کر مقبولیت حاصل کی۔

شوکت تھانوی کی شاعری کے مطالعہ کے بعد اردو شاعری میں ان کے مقام کو متعین کرنے میں کوئی دشواری نہیں رہتی۔ ان کی شاعری کے مختلف پہلو اور ان کے فن کے گونا گوں محاسن انہیں جدید اردو شاعری میں ایک نمایاں مقام عطا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری ان کی زندگی کی تفسیر ہے۔ جس میں اصلیت اور صداقت ہے انہوں نے اپنے عہد کے قابلِ ذکر رحجانات کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ شوکت تھانوی کے یہاں سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی موضوعات پر بہت سی نظمیں، رُباعیات اور قطعات ہیں جو

ان کی ذاتی زندگی کے علاوہ ان کے عہد کی ترجمان ہیں۔ انہوں نے طنز و مزاح میں قدم رکھ کر سماج میں پھیلے ہوئے زہر کی نشاندہی کی اور اپنی شاعری میں سماجی اصلاح کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مزاج میں طنز کا عنصر غالب ہے۔ اس طرح شوکت تھانوی کی شاعری میں موضوعات کی رنگا رنگی بھی ہے اور عصری تقاضوں کو پورا کرنے کا حوصلہ بھی۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شوکت تھانوی کی شاعری کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

چوتھا باب

(i) مضمون نگاری

(ii) افسانہ نگاری

انیسویں صدی میں لکھے جانے والے مضامین کو موضوعات کے اعتبار سے بڑی حد تک چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔ اوّل رسم و رواج اور اصلاح معاشرہ دوم مذہبی ، سوم تاریخی اور چہارم اخلاقی ۔ بیسویں صدی کے مضمون نگاروں کے یہاں موضوعات میں بڑی تبدیلی نظر آتی ہے وہ معاشرے پر تنقید اور عام زندگی کے دلچسپ پہلوؤں کو اپنے مضامین کا موضوع بناتے ہیں ۔ اسلوب کے اعتبار سے جو تبدیلی نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ فلسفیانہ نثر کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح نے اردو نثر میں ایک اہم مقام حاصل کیا ۔ اردو میں بہت سے ایسے ادیب نمایاں ہوئے جن کے مضامین کا اسلوب طنز اور مزاح کے لطیف امتزاج نے بنایا تھا ۔ ایسے ادیبوں میں پطرس بخاری ، فرحت اللہ بیگ ، رشید احمد صدیقی ، سید امتیاز علی تاج ، عظیم بیگ چغتائی ، سجاد حسین ، شوکت تھانوی ، عبدالعزیز فلک پیما ، کنہیّا لال کپور ، چراغ حسن حسرت ، مجید لاہوری ، اور فکر تونسوی وغیرہ نام کے خاص طور سے قابل ذکر ہیں ۔ ان مزاح نگاروں کی نثر زندگی کے ایک ایسے دور میں شروع ہوئی جب دروں بینی کو اپنا وتیرہ بنانے کے بجائے ادیب کو زندگی کے ہنگاموں کا ساتھ دینا ہوتا تھا لیکن ان مزاح نگاروں نے زندگی کا ساتھ دے کر بھی لوگوں کے لئے حظ کا سامان مہیّا کیا ہے ۔ حظ کا یہ سامان مہیّا کرنے والوں میں شوکت تھانوی نے اپنے لئے ایک خاص جگہ بنائی ہے اور مضمون ، افسانے ، ڈرامے ، ناول اور صحافت کو اپنے فلسفۂ حیات کے پیش کرنے اور لوگوں کو ہنسانے کا ذریعہ بنایا ہے بعض لوگوں نے شوکت تھانوی کو خالص مزاح نگار کہا ہے لیکن میرے نزدیک وہ چونکہ الفاظ کی بازیگری ، رعایتِ لفظی ، فقرہ بازی اور حاضر جوابی سے مزاح پیدا کرتے ہیں اس لئے انہیں ایک بذلہ سنج کہا جا سکتا ہے ۔ بذلہ سنجی اور خالص مزاح نگاری کا فرق ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں اس طرح بیان ہوا ہے ۔: " لفظی بازی گری سے پیدا

ہونے والے مزاح کے سلسلے میں اس بات کو مدِّ نظر رکھنا ضروری ہے کہ اس میں بالعموم الفاظ کے بگاڑ، رعایتِ لفظی، تضمین، تصرّف، محاورہ اور دوسری لفظی شعبدہ بازیوں سے کام لے کر " مزاحیہ نکتے " پیدا کئے جاتے ہیں اور یہ طریقِ کار بہ حیثیت مجموعی بذلہ سنجی (WIT) کہلاتا ہے۔ وِٹ کو برمحل حاضر جوابی، فقرہ بازی یا " لفظوں کا کھیل " سمجھنا چاہئیے۔ لفظوں کا ایجاز و اختصار، بذلہ سنجی کی سب سے ضروری شرط ہے اور اس کے لئے یہ تضمین، تصرّف اور محاورہ کے حربے استعمال کرتی ہے مگر مزاح اور بذلہ سنجی میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ مزاح ایک برقی رو کی طرح سارے کے سارے مزاحیہ پارے میں جاری ہوتا ہے اور ہم کسی ایک مقام پر انگلی رکھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہاں مزاح موجود ہے۔ اس کے برعکس بذلہ سنجی کا دائرہ محدود ہوتا ہے اور اس کو علیحدہ کرکے بھی دکھایا جاسکتا ہے۔ "[1]

شوکت تھانوی نے پہلا مزاحیہ مضمون " میٹھے چاول " کے نام سے لکھا اس کا اعتراف انہوں نے " مابدولت " میں اس طرح کیا ہے: " ایک مرتبہ معلوم نہیں کیا سوجھی کہ ایک مزاحیہ مضمون " میٹھے چاول " کے نام سے لکھ دیا۔ یہاں عرض کردینا غیر ضروری نہ ہوگا کہ اس مضمون سے پہلے ہم نے کوئی مزاحیہ مضمون دیکھا یا سنا بھی نہ تھا۔ "[2]

اسی بات کو " کچھ یادیں کچھ باتیں " میں اس طرح بیان کیا ہے:

" امین سلونوی صاحب کے بے حد اصرار پر ایک مضمون " میٹھے چاول " کے نام سے لکھا۔ یہ میری پہلی نثری کاوش تھی اور یہ میرا پہلا مضمون ہی مزاحیہ تھا۔ "[3]

---

[1] ڈاکٹر وزیر آغا: " اردو ادب میں طنز و مزاح " صفحہ = 99، تیسرا ایڈیشن 1977ء، مکتبۂ عالیہ، لاہور۔

[2] شوکت تھانوی: " مابدولت " صفحہ = 85، بار چہارم، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

[3] شوکت تھانوی: " کچھ یادیں کچھ باتیں " صفحہ = 14، بار اول 1964ء، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

شوکت تھانوی کا یہ پہلا مضمون ان کے پہلے مجموعۂ مضامین " موجِ تبسم "
جو انیس سو بتیس عیسوی میں شائع ہوا ۔
میں شامل ہے ۔ / " موجِ تبسم " کے بارے میں شوکت تھانوی لکھتے ہیں : " نسیم صاحب نے ہمارے مضامین کا پہلا مجموعہ " موجِ تبسم " کے نام سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ۔ یہ گویا ہماری پہلی کتاب تھی اور مصنّف بننے کے شوق میں ہم بھوک پیاس بھولے ہوئے تھے کتابت کے دوران میں کاتب کا گویا ناک میں دم کر رکھا تھا ۔ طباعت کے وقت پریس میں نظر آتے تھے ۔ کاپیاں دیکھتے تھے پروف پڑھتے تھے اور جی چاہتا تھا کہ کسی طرح آج ہی کتاب ہاتھ میں آجائے ۔ خدا خدا کر کے کتاب تیار ہوئی ۔"[1]

مضامین کا پہلا مجموعہ " موجِ تبسم " شوکت تھانوی کی پہلی کتاب تھی جسے نسیم انہونوی نے نسیم بک ڈپو سے شائع کی ۔ اس کی اشاعت کے بارے میں نسیم انہونوی ایک مضمون میں لکھتے ہیں : " میں نے شوکت صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے مضامین کتابی شکل میں مرتّب کریں اور نسیم بک ڈپو سے اس کی اشاعت کی جائے ۔ شوکت صاحب نے میری اس رائے سے اتفاق کیا اور موجِ تبسم کے نام سے اپنے ابتدائی منتخب مضامین کو مرتّب کر کے دیا ۔ اس کی اشاعت $\frac{20 \times 26}{16}$ سائز پر ہوئی ۔ پورے کپڑے کی جلد بنی اور سنہری الفاظ میں کتاب کا نام چھاپا گیا جس طرح شوکت تھانوی کا نام میرے تعاون سے پہلی بار کسی اخبار پر ایڈیٹر کی حیثیت سے لکھا گیا اسی طرح یہ فخر بھی مجھ ہی کو ملا کہ میں ان کی پہلی کتاب کا پبلشر بنا ۔"[2]

شوکت تھانوی کی تحریروں کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ تین چیزیں ان کی ادبی تخلیقات کا محرک بنیں ۔ اول یہ کہ ان کے ذہن نے اپنے ماحول کی بعض باتوں کا گہرا اثر قبول کیا اور ان کی طبیعت نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنے اس تاثر کو دوسروں تک پہنچائیں ۔ اس گہرے تاثر اور احساس کے تحت انہوں

---

[1] شوکت تھانوی : " مایدولت " صفحہ = 134 ، بار چہارم ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور ۔

[2] ماخوذ از نقوش لاہور ، شوکت نمبر صفحہ = 393 ، 394 ۔

نے جو کچھ لکھا وہ فنّی حیثیت سے قابل تعریف ہے - دوسری چیز جو ان کی تحریروں کا محرک بنی وہ فرمائش یا فہمائش ہے یعنی دوسرے لوگوں نے ان کو مجبور کیا کہ وہ کچھ ان کے لئے لکھیں - ان تحریروں میں وہ بات نہیں جو کہ اوّل الذکر قسم کی تحریروں میں پائی جاتی ہے - تیسری چیز مالی منفعت ہے جو ان کی اکثر تحریروں کا محرک بنی - اس تحریک کے تحت جو مضامین لکھے گئے ان میں بھی آمد کی بجائے آورد زیادہ ہے -

شوکت تھانوی کے مضامین کو جس طرح معیارِ فن کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اسی طرح موضوع کے اعتبار سے بھی ان کی تین قسمیں ہیں - پہلی قسم کے مضامین میں شوکت تھانوی نے معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا ہے - دوسری قسم کے وہ مضامین ہیں جن میں ادبی موضوعات سے بحث کی گئی ہے اور تیسری قسم کے وہ مضامین ہیں جن کا تعلق معاشرتی اور ادبی زندگی کے کسی خاص مسئلے سے نہیں - ان مضامین کو انشائیے کہا جاسکتا ہے -

شوکت تھانوی نے جن مضامین میں معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا ہے ان میں زیادہ ایسے ہیں جو گھریلو زندگی سے تعلق رکھتے ہیں - ازدواجی زندگی کے متعلق شوکت تھانوی کے واضح نظریات ہیں ان کے بہت سے مضامین میں ان نظریات کا جابجا اظہار ہوا ہے - ان کا خیال ہے کہ میاں بیوی کو صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے ایک دوسرے کے لئے گنجائش اور ایک دوسرے کی بات کے لئے برداشت کا مادہ پیدا کرنا ضروری ہے اس طرح زندگی آرام و سکون سے بسر ہو سکتی ہے -

ازدواجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جن مضامین میں موضوع بحث بنایا گیا ہے ان میں بیوی کے رشتہ دار ، ہم زلف ، سالیاں ، اشتہاری شادی سرود

خانۂ ہمسایہ ، بیری اور ڈھیلے ، دولہا بھائی ، مرحومہ ، تکیہ کا غلاف اور نو روپے تیرہ آنے خاص طور سے قابل ذکر ہیں ۔ شوکت تھانوی کے ان مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کی نفسیات کے ماہر تھے انہوں نے بعض مضامین میں عورتوں کی اس عادت کو اپنا موضوع بنایا ہے کہ وہ بات بات پر اپنے شوہر سے ناراض ہو کر میکے چلے جانے کی دھمکی دیتی ہیں جس کا نتیجہ بعض اوقات بے حد خطرناک ہوتا ہے ۔ ایک اور چیز جو ازدواجی زندگی میں عام طور سے دیکھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ عورتیں بعض اوقات مرد کی ہر بات پر اتنا روک ٹوک کرتی ہیں ۔ کہ مرد اس صورتِ حال سے بدظن ہو کر اپنی بیوی کو ترقی کے راستے میں رکاوٹ سمجھنے لگتا ہے اسی طرح بعض مردوں میں بھی کچھ خامیاں ہوتی ہیں مثلاً وہ اپنی بیگم کے سامنے دوسری عورتوں کا خواہ مخواہ ذکر کرتے ہیں اور ان کی تیار کی ہوئی چیزوں کی تعریف کر کے عورت میں حسد کا جذبہ پیدا کرتے ہیں اور عورت بھی اپنی فطری کمزوری کی وجہ سے بجائے کسی دوسری عورت کی اچھی عادت کو اپنانے کے خواہ مخواہ اس سے حسد اور مرد سے لڑنا شروع کردیتی ہے ۔[1]

گھریلو ماحول کی عکاسی کرنے کے علاوہ شوکت تھانوی نے بعض مضامین عورتوں اور مردوں کی اصلاح کے لئے بھی لکھے ہیں ۔ ایک مضمون " طوطی خانہ میں نقارہ " میں عورتوں کی اس کمزوری کی طرف اشارہ ہے کہ جب وہ کسی ایک جگہ اکٹھی ہوجاتی ہیں تو وہاں سوائے شور و شر کے کچھ نہیں ہوتا ۔ شوکت تھانوی لکھتے ہیں : " طوطی خانہ میں نقارہ کی آواز کے دب جانے کا اگر آپ کو منظر دیکھنا ہے تو کسی شادی یا غمی کی زنانی محفل کے منتظم بن کر دیکھ لیجئیے ۔ کہ کیا ہوتا ہے ۔ آپ ڈیوڑھی میں ٹاٹ کے پردے کے پاس کھڑے ہو کر گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنی مردانہ آواز میں چیخیں گے " رحیمن بڑی دیگ دے جا " لیکن اس کے جواب میں اندر سے جو آوازیں آئیں گی وہ غیں غیں غیں ۔ غوں غوں غوں ۔ فاؤں شاؤں ، موماؤں

کے علاوہ اور کچھ نہ ہوں گی - آپ پھر اس انداز سے نعرہ بلند کریں گے کہ گویا اب کی مرتبہ آسمان زمین پر آ رہے گا لیکن اندر سے جو جواب آئے گا - اس سے آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس گھر میں کوئی محفل نہیں ہے بلکہ جنگ عظیم برپا ہے -"[1]

ایک مضمون " ڈولی " میں شوکت تھانوی نے ان عورتوں پر طنز کی ہے جو اس ترقی یافتہ دور میں بھی پرانی روش پر چل رہی ہیں - اسی مضمون میں روشن پہلو دیکھتے ہوئے اس کی افادیت اس طرح بیان کی ہے کہ ساس، بہو کی لڑائی میں عام طور پر بہو اپنے گھر جانے کے لئے " ڈولی " منگوانا چاہتی ہے جسے ساس برداشت نہیں کرتی اور بالآخر دونوں میں صلح ہوجاتی ہے - شوکت تھانوی لکھتے ہیں : " جاؤ نصیبن ڈولی لاؤ - واہ اچھا دبایا ہے - جانتی ہو کہ نہیں - میں اب ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتی - دیکھوں تو سہی مجھے کون روکتا ہے - میں اب ایک منٹ اس گھر میں نہیں رہ سکتی - کہہ رہی ہوں ڈولی لا کر دو - کیوں نہ ڈولی منگاؤں - لو صاحب جیسے میں جوتیاں ہی کھانے کے لئے لائی گئی ہوں - ہنہ - ڈولی لاتی ہو کہ نہیں ؟ - اب اس ڈولی کا نام سن کر ساس صاحبہ کے بھی ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں اور تمام گھر بھر سہم کر رہ جاتا ہے کہ اگر ڈولی آگئی تو غضب ہی ہوجائے گا گویا ڈولی نہ ہوئی مشین گن ہوگئی - اور یہی وقت ہوتا ہے کہ بہو ڈولی کا نام لے لے کر اپنی سسرال والوں سے جس قدر چاہے ناک رگڑ والے۔"[2]

شوکت تھانوی کے بیشتر مضامین کا موضوع فیشن اور اس کے برے نتائج ہیں - اپنے ایک مضمون میں فیشن پرستی کو بھیڑ چال قرار دیتے ہوئے لکھتے

---

[1] شوکت تھانوی : " ماخوذ از مسکراہٹیں " صفحہ = 79 ، لارک پبلشرز کراچی -

[2] ایضاً ، صفحہ = 91 ، 92 -

کہ : " ہمارے پیشِ نظر وہ مناظر ہیں کہ ہمارے اس دعوے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کسی بڑے آدمی نے مونچھیں صاف کرادیں بس تمام ملک مونچھوں سے فارغ البال ہوگیا کسی نے "کرم خوردہ" یعنی دم کٹی ہوئی مونچھیں رکھیں بس ہر ایک نے اپنی اچھی خاصی مونچھوں کو نذرِ مقراض کردیا ۔ مختصر یہ کہ اس فیشن کو بھیڑ چال کہئیے ، کورانہ تقلید کہئیے ، بوزنہ نقالی کہئیے غرض کہ جو کچھ کہئیے صحیح ہے اور یہ وبا ہندوستان میں تو اس طرح پھیلی ہے کہ دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے ۔" [1]

شوکت تھانوی نے " نو روپیہ تیرہ آنے " میں عورتوں کی فیشن پرستی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بعض عورتیں مردوں کی خوشنودی کے لئے فیشن اختیار کرتی ہیں ۔ اس مضمون میں بیگم صاحبہ نو روپے تیرہ آنے کی سرخی پوڈر اور کریم وغیرہ خرید کر لائیں اور ایک روز بن سنور کر بیٹھیں تو شوہر نے کہا کہ اسے یہ بہروپ پسند نہیں ہے ۔ میاں بیوی میں تھوڑی سی تکرار ہوئی اور اس کے بعد بیوی نے شوہر کی خوشنودی کو مقدّم سمجھتے ہوئے کہا : " مجھے ضرورت کیا پڑی ہے کہ میں ان چیزوں کو خریدوں جب آپ ہی کو پسند نہیں ہیں تو میرے کس کام کی ۔"

ہم نے خوش ہو کر کہا " ہاں مجھے پسند تو کیا یعنی انتہائی نفرت سی ہوگئی ہے اور اگر دو چار مرتبہ آپ اسی طرح یہ پاؤڈر وغیرہ لگا کر میرے سامنے آجائیں تو میں شاید آپ ہی سے گھبرانے لگوں ۔"

بیگم نے کہا " بھلا بتائیے تو مجھے کیا کتّے نے کاٹا ہے کہ میں ایسی چیزیں خریدوں ۔" [2]

---

[1] شوکت تھانوی: " فیشن " ماخوذ از موج تبسم ، صفحہ = 237 ، بار دوم صدیق بک ڈپو لکھنو ۔

[2] شوکت تھانوی: " نو روپیہ تیرہ آنے " ماخوذ از مسکراہٹیں ، صفحہ 136 ، لارک پبلشرز ، کراچی ۔

شوکت تھانوی نے خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق بھی کئی مضامین مزاحیہ انداز میں تحریر کئے ہیں - وہ بڑھتی ہوئی آبادی کو معاشرتی نقطۂ نظر سے ایک مضر چیز سمجھتے ہیں - وہ اپنے مضامین " یک نہ شد دو شد " ، " صاحب دل اولاد سے " ، " پیدائش روکو مہم " وغیرہ میں اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس معاشرتی برائی کے خاتمہ کے لئے چند تجاویز بھی پیش کرتے ہیں -

شوکت تھانوی کے عہد میں سینما بینی کا نیا نیا شوق ایک خبط کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا اس لئے شوکت تھانوی نے کئی مضامین میں اس روش کو موضوع بنا کر لوگوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے " فلم اسٹار دلہن " ، " فلم اسٹار " اور فلمیریا " میں سینما بینی کے مہلک اثرات اور نتائج کی نقاب کشائی کی ہے - "فلم اسٹار دلہن " میں ایک صاحب فلم دیکھ کر فلم اسٹار سے شادی کرنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں اپنے تمام عزیز و اقارب کی ناراضگی کے باوجود جب وہ شادی کرلیتے ہیں تو ان پر اصلیت کھلتی ہیں اور وہ فرماتے ہیں : " ہے تو وہی مگر اب اپنے اصلی رنگ میں ہے اور فلم میں میک اپ کر کے آئی تھی - ہائے ری تقدیر -"

> ہم نے کہا - " میک اپ " ؟ رضوان نے کہا " میک اپ " اندر سے آواز آئی - " میاں دلہن بی بلاتی ہیں -" اور رضوان - " جہنم میں ڈالو دلہن بی کو - " کہتا ہوا آرام کرسی پر گر پڑا -" [1]

شوکت تھانوی کچھ عرصے کے لئے پنچولی آرٹ سے وابستہ رہے - اس لئے " فلمیریا " کے اثرات کا مشاہدہ بہ نفسِ نفیس کیا وہ لکھتے ہیں : " مجھکو اس مرض کے بے شمار بیماروں کو دیکھنے کا موقع ملا ہے جو بجائے اسپتال جانے کے

---

[1] شوکت تھانوی: " فلم اسٹار دلہن " ماخوذ از مسکراہٹیں ، صفحہ = 205 ، لارک پبلشرز ، کراچی -

فلم کمپنیوں میں ہر روز بہت بڑی تعداد میں آیا کرتے ہیں اور اعتقاد یہ رکھتے ہیں کہ یہی ان کا دارالشفا ہے ایک سے ایک شریف زاد ہے جن میں سے اکثر کے والد محترم کسی مسجد میں مؤذّن، کسی مکتب کے ملّا اور اچھے خاصے مومن ہوتے ہیں اور بلند اقبال ان کا نام روشن کرنے کے لئے فلم ایکٹر بننا چاہتے ہیں۔" [1]

شوکت تھانوی اندھا دھند تقلید کو پسند نہیں کرتے انہوں نے اس موضوع کو بار بار اپنے مضامین میں بیان کیا ہے۔ "مسٹر"، "لیڈر"، "ملک التجّار" اور "جس محلہ میں ہے ہمارا گھر" جیسے مضامین میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ "جس محلہ میں ہے ہمارا گھر" میں انہوں نے علاّمہ اقبال سے وابستگی اور تقلید کو اس طرح ظاہر کیا ہے۔: "یہ سب کے سب کسی نہ کسی حیثیت سے اقبال سے وابستہ ہیں اور ہر ایک کو دعویٰ یہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال کے سب سے زیادہ مواسم اسی سے تھے۔ چنانچہ حکیم صاحب کے دوا خانہ کا نام ہے "جواب شکوہ دواخانہ طب یونانی۔" ہیئر ڈریسنگ سیلون پر سائن بورڈ لگا ہے "اقبال ڈریسنگ سیلون" پہلوان صاحب کے اکھاڑہ کا نام ہے "اکھاڑہ حکیم الامت" اور فالودے والے کی دوکان کے دروازے پر سفیدے سے لکھا ہوا ہے "اقبال فالودے دی ہٹی" سوڈا، لیمونڈ۔ آلو۔ چھولے"۔ [2]

شوکت تھانوی نے اپنے بعض مضامین میں لوگوں کی ان کمزوریوں کا ذکر کیا ہے جس کا اثر دوسرے لوگوں کی زندگی پر بھی پڑتا ہے۔ ایسے لوگ خود تو ایک

---

[1] شوکت تھانوی: "فلمیریا ماخوذ از وغیرہ وغیرہ صفحہ = 114، بارِ دوم 1953ء، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

[2] شوکت تھانوی: "جس محلہ میں ہے ہمارا گھر" ماخوذ از شوکتیات، صفحہ = 162، طبع سوم، اردو بک اسٹال، لاہور۔

برائی میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن اپنے ساتھ دوسروں کو بھی پریشانی میں مبتلا کرتے ہیں ۔ " لیاقت نہرو معاہدہ " ، " زیادہ باتونی ہونا " ، " ایک مکان کی ضرورت ہے ، " شاہین بچے " ، " آزادی کا شوق ، " گرگٹ " ، " واحد حاضر جمع غائب " اور " بٹیر باز " وغیرہ انسان کی مختلف کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔ " بٹیر باز " میں شوکت تھانوی لکھتے ہیں : " میر صاحب کی بیوی کی بیماری کی خبر سن کر میں ان کے یہاں حاضر ہوا تو میر صاحب چند کابکوں میں گھرے ہوئے بیٹھے تھے اور ایک سے ایک نامی بٹیر آپ کے دربار میں موجود تھا ۔ ------ سنا ہے کہ بٹیر بازی کی رونق ان ہی کے دم سے ہے ۔ اب یہ حد ہے کہ گھر میں بیوی بیمار پڑی ہے ۔ ڈاکٹر حکیم بھی آرہے ہیں مگر میر صاحب کے ہاتھ اس وقت بھی خالی نہ تھے ۔ دونوں ہاتھوں میں ایک ایک بٹیر دبا تھا ۔ "[1]

شوکت تھانوی نے " ایک مکان کی ضرورت ہے " میں ہمسایوں کے عادات و اطوار کو موضوع بحث بنایا ہے ۔ وہ ہمسائے سے اتنا تنگ آ چکے ہیں کہ یہ مکان چھوڑ کر کسی اور جگہ مکان لینے کا ارادہ کرلیتے ہیں وہ لکھتے ہیں: " مجھے ایک مکان کی ضرورت ہے ۔ کرایہ کی قید نہیں ۔ گنجائش بھی کم سے کم منظور ۔ اگر تھوڑا بہت بوسیدہ ہو تو بھی مضائقہ نہیں ۔ بجلی نہ ہو تو نہ سہی ، نل اگر گھر میں نہ ہو تو میں پانی باہر سے بھرلوں گا ۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں کہ مالک مکان کو کبھی مجھ سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوگی ۔ خواہ مالک مکان مجھ کو کتنا ہی شاکی رکھیں ۔ میں ان کو ماہ بہ ماہ پابندی سے کرایہ دینے کے علاوہ اپنا محسن بھی سمجھوں گا --- میں تو اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ اگر بازار جایا کروں گا تو ان سے پوچھ کر جایا کروں گا کہ کچھ سودا سلف تو نہیں منگانا ہے

---

[1] شوکت تھانوی : " بٹیر باز " ماخوذ از مسکراہٹیں ، صفحہ 218 ، اکتوبر 1961ء لارک پبلشرز ، کراچی ۔

بشرط صرف ایک ہے کہ اس مکان کا ع

کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو "[1]

شوکت تھانوی کے بعض مضامین لوگوں کی ان کمزوریوں کی نقاب کشائی کرتے ہیں جنہیں بد اخلاقی کہنا زیادہ صحیح ہے ۔ مثلاً " کالا برقعہ " میں ان نوجوانوں کو برا کہا گیا ہے جو برقع پوش عورتوں کو چھیڑ کر اپنی بد اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ " عالی جاہ " میں انہوں نے معاشرت کے اس پہلو پر نکتہ چینی کی ہے کہ جس کی وجہ سے لوگ ذلیل و خوار ہوتے ہیں اور وہ پہلو ظاہری شان و شوکت کا ہے ۔ ظاہری شان و شوکت سے نہ صرف بھانڈا پھوٹتا ہے بلکہ انسان اپنا رہا سہا وقار بھی کھو دیتا ہے ۔ شوکت تھانوی لکھتے ہیں : " ہمارے ساتھی نے خان سے کہا " خان صاحب اتنی سی رقم کے لئے آپ اتنے بڑے آدمی پر اعتبار کیوں نہیں کرتے "

خان نے بگڑ کر کہا ۔ " اوہ ہم جانتے ہیں کتنا بڑا آدمی ہے ۔ پچیس پچیس روپے کر کے چار دفعہ ہم سے قرض لیا ۔ ہماری خوشامد کی ، ہاتھ جوڑے کہ آج راشن نہیں ہے ۔ آج یہ نہیں ہے کل وہ نہیں ہے ۔"

عالی جاہ نے جلدی سے کہا ۔ " خیر ان باتوں سے کیا غرض ، تمہارا روپیہ معہ سود کے کل ہی تم کو دے دوں گا ۔ میں خود اس قسم کا روپیہ رکھنا نہیں چاہتا اور نہ میں ایسے تقاضوں کا عادی ہوں ۔"

خان نے کہا ۔ " کل کا بہانہ آج نہیں چلے گا آج بہت دنوں کے بعد باہر بیٹھے ملے ہو ۔ میں تو اسی وقت سر توڑ کر روپیہ لے لوں گا ۔"

عالی جاہ نے ہمارے ساتھی سے کہا ذرا ان سے یہ بتا دیجئے کہ یہ کس سے گفتگو

---

[1] شوکت تھانوی: ماخوذ از شوکتیات ، صفحہ = 69 ، 70 ، طبع سوم ، اردو بک اسٹال ، لاہور ۔

کر رہے ہیں ۔

خان صاحب نے اپنی لاٹھی زمین پر مارتے ہوئے کہا ۔ " ہم جانتے ہیں ہم کس سے بات کر رہے ہیں اور آج ہم یہ بات پوری کر کے اٹھیں گے ۔ ہمارا روپیہ نکالو تم اسی وقت ۔" [1]

" ایک ملازم کی ضرورت ہے " میں شوکت تھانوی نے ملازموں کے نخرے بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایماندار ملازم ملنا بہت دشوار ہوگیا ہے ۔ تھوڑا سا اعتبار کرو تو چند ہی دن میں وہ ہاتھ دکھا کر فرار ہوجاتا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں : " غالباً چوتھا یا پانچواں دن تھا کہ ایک بائیسکل جو ملازموں کے لئے رہتی تھی ، دس روپے کا ایک نوٹ جس میں سے ان کو چاء کا ڈبہ لانا تھا ایک کمبل جو وہ اوڑھے ہوئے تھے لے کر جو غائب ہوئے ہیں تو آج آتے ہیں پولیس میں رپورٹ تو لکھوا دی ہے مگر پولیس والوں کے پاس ایک یہی کام تو ہے نہیں کہ ان کے ہجر سے بے قرار ہو کر ان کی جستجو شروع کردیں ۔" [2]

" روزہ چور " میں شوکت تھانوی نے ڈاکٹروں اور حکیموں پر نکتہ چینی کی ہے کہ وہ بغیر تشخیص کئے مریض کو دوا تجویز کردیتے ہیں خواہ مریض نے بیماری کا ڈھونگ ہی کیوں نہ رچایا ہو ۔ " اقربا ہوگئے ہیں آگاہ " میں شوکت تھانوی ایک معاشرتی برائی کی نشان دہی کرتے ہیں کہ جونہی کوئی شخص کسی بڑے عہدے پر فائز ہوتا ہے اس کے دور دراز کے عزیز یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ ان کے جائز و ناجائز ہر قسم کے کام کرے ۔ اگر کوئی شخص یہ کام نہیں کرسکتا تو اسے مجبوراً نوکری سے استعفیٰ دینا پڑتا ہے جیسا کہ شوکت تھانوی لکھتے ہیں ۔

---

[1] شوکت تھانوی: " عالی جاہ " ماخوذ از شوکتیات ، صفحہ 26 ، 27 ، طبع سوم ، اردو بک اسٹال ، لاہور ۔

[2] شوکت تھانوی: " ایک ملازم کی ضرورت ہے " صفحہ = 124 ۔ ایضاً

"میں ان دونوں بزرگوں کو اسی کمرے میں چھوڑ کر دوسرے کمرے میں آکر ایک میز کے سامنے بیٹھ کر استعفٰی لکھنے لگا کہ چونکہ میں پاکستان کے ساتھ اقربا نوازی اور خویش پروری کر کے غداری کرنا نہیں چاہتا ۔ لہٰذا یہ استعفٰی پیش کر رہا ہوں ۔ انیس سو سنتالیس کے ہنگامہ میں میرے بہت ضروری اعزاء مارے گئے مگر غیر ضروری اعزاء چونکہ اب تک زندہ ہیں ۔ لہٰذا میں مستعفی ہوتا ہوں ۔"[1]

"جگر کے مریض" میں کورانہ تقلید پر نکتہ چینی کرتے ہوئے شوکت تھانوی کہتے ہیں کہ لوگ بالعموم کسی مشہور شاعر کی ظاہری چیزوں کی تقلید کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان جیسی سیرت و کردار پیش نہیں کرسکتے ۔ یہ تقلید کرنے والے ہر مشہور شخص کے صرف ایک ہی پہلو کی تقلید کرتے ہیں ۔ اس نکتہ چینی سے شوکت تھانوی کی مراد یہ ہے کہ ہماری قوم کے افراد تقلید کی بجائے اپنے حالات و واقعات کے مطابق اپنے لئے نئے راستے کا انتخاب کریں ۔ "السلام علیکم ! یہ مضمون رسالہ سروش لاہور کے سالنامے جنوری انیس سو اکتیس عیسوی میں شائع ہوا ۔ اس مضمون میں شوکت تھانوی نے تعلیم یافتہ طبقے پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے میں اپنے مذہب اور اپنی معاشرت کا شعور بتدریج کم ہوتا جا رہا ہے لیکن اس کے برعکس جاہل اور نچلے درجے کے لوگوں میں ابھی تک اپنے مذہب سے محبت ہے وہ اپنی اسلامی روایات کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن تعلیم یافتہ طبقہ السلام علیکم کو باعثِ شرم اور گڈ مارننگ کو باعثِ افتخار تصور کرتا ہے وہ لکھتے ہیں : " ہمارے نزدیک تو یہی راز ہے "السلام علیکم" کے متروک ہونے کا کہ لوگوں نے اس کو جولاہوں کا سلام سمجھ کر چھوڑ دیا ہے اور جولاہے اپنے "سلاما لیکم" کو عادتاً اختیار کئے ہوئے ہیں وہ تو کہئیے کہ جولاہوں میں یہ

---

[1] شوکت تھانوی : "اقربا ہوگئے ہے آگاہ" ماخوذ از شوکتیات ، صفحہ = 198 ، طبع سوم ، اردو بک اسٹال ، لاہور ۔

بات اچھی ہوتی ہے کہ جو عادت پڑ جاتی ہے مشکل سے چھوٹتی ہے ورنہ السلام علیکم صرف مسجدوں اور علی گڑھ کالج میں رہ جاتا ۔ علی گڑھ کالج میں ڈھیلا مارنے کی طرح اور مسجد میں بم کی آواز بن کر ، لیکن شکر ہے کہ جولاہے حقّہ کی طرح ، ساما لیکم "کے بھی عادی ہیں ۔" [1]

" ہم زلف کا بکرا " اور " مقروض " میں شوکت تھانوی نے قرض کی خرابیاں بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ قرض میں مبتلا ہو کر انسان ذہنی سکون اور وقار کھو دیتا ہے ۔ " نبھے کیوں کر " میں تعصب کی وجہ سے پیدا ہونے والی برائیوں کا ذکر ہے ۔ " شاہین بچے " کے بارے میں شوکت تھانوی نے لکھا ہے " لوگ میرے مضمون سودیشی ریل کو لے اڑے اور میں محض اس خیال سے چپ ہو رہا کہ تھیں نہ لگ جائے ۔ اب اپنا مضمون " شاہین بچے " مجھ کو سودیشی ریل سے کہیں زیادہ پسند ہے ۔" [2]

" شاہین بچے " میں شوکت تھانوی نے اپنے عہد کے بچوں کی تن آسانی اور محنت سے جی چرانے کی عادت پر طنز کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ان بچوں کا " شاہین بچے " بننا بہت مشکل ہے ۔ اس مضمون میں لیڈر بننے کے لئے جن دشواریوں سے گذرنا پڑتا ہے کا ذکر اس طرح کیا ہے " اس کے لئے بڑے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں ۔ صرف زندہ باد ہی کے نعرے بلند نہیں ہوتے مردہ باد کے نعرے بھی ہم نے سنے ہیں ۔ صرف پھول ہی نچھاور نہیں کئے جاتے ۔ جوتے بھی اچھالے جاتے ہیں ۔ خوش آمدید ہی نہیں کہا جاتا ۔ واپس جاو بھی کہا جاتا ہے ۔ جلوس ہی نہیں نکلتا ۔ کالی جھنڈیاں بھی دکھائی جاتی ہیں ۔ خیر یہ سب

---

[1] شوکت تھانوی: " السلامُ علیکم " ماخوذ از بحرِ تبسم ، صفحہ = 55 ، بار اول ، نسیم بک ڈپو ، لکھنُو ۔

[2] شوکت تھانوی: " اپنے مضامین اپنی نظر میں " ماخوذ از ماہنامہ کتاب لکھنو ، شوکت تھانوی نمبر ، صفحہ = 64 ۔

کچھ بھی سہی مگر لیڈر بننے کے لئے پریس کے ڈنڈے بھی کھانا پڑتے ہیں ۔ کبھی کبھی ، اور شیطان کے کان بہرے جیل میں چکی بھی پیسنا پڑتی ہے ۔ "[1]

شوکت تھانوی کے دوسری قسم کے مضامین وہ ہیں جن میں انہوں نے ادب اور ادب سے تعلق رکھنے والے مسائل کو گفتگو کا موضوع بنایا ہے ۔ یہ مضامین تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کے نہیں ہیں ان کا دائرہ صرف مشاعروں ، جلسوں اور زبان کے بعض مسائل تک محدود ہے ۔ ان مضامین میں شوکت تھانوی نے ادبی زندگی کے بعض ذاتی تجربات کو شگفتہ انداز بیان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ بعض مضامین میں اردو زبان کی اہمیت اور اس کی ضرورت کو واضح کیاگیا ہے مثال کے طور پر " اردو میں انگریزی " ، " ہائے اردو " میں اردو کو نستعلیق رسم الخط میں لکھنے پر زور دیا گیا ہے اور رومن رسم الخط کی خرابیاں بیان کی گئی ہیں " ہمنوا میں بھی کوئی گل ہوں ؟ " میں پاکستان بننے کے بعد پاکستان کی قومی زبان کو موضوع بحث بنایا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ اردو کے لئے قومی زبان بننے کے سب سے زیادہ قوی امکانات ہیں وہ لکھتے ہیں: "پاکستان اردو کو اپنانے کے لئے اس وجہ سے بھی مجبور ہے کہ مسلم روایات جس حد تک اس دیسی زبان سے وابستہ ہیں شاید کسی اور زبان سے نہیں ہیں ۔ پاکستان میں اردو کی بقا کے لئے یک جہتی کے ساتھ بہت کچھ کیا جائے گا مگر اس کے لئے ہم کو ابھی سے تیار رہنا چاہئیے کہ اردو اب چھوئی موئی بن کر نہیں رہ سکتی ۔ اس کے حدود میں وسعت کے گوشے پیدا ہوں گے اور اس کی موجودہ شکل ایک حد تک ہمارے ہاتھوں نہ سہی زمانے کے ہاتھوں ضرور تبدیل ہوگی بغیر اس کے ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ خود اردو کو بھی پاکستان کی قومی زبان بننے کا حق حاصل نہ ہوسکے

---

[1] شوکت تھانوی : " شاہین بچے " ماخوذ از سودیشی ریل اور دوسرے افسانے ، صفحہ = 110 ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور۔

گا ۔ مگر اب یہ انقلاب اس لئے خوش اسلوبی سے گذر جائے گا کہ مسلمانوں کو صوبجاتی تعصّبات کو بھول کر اب صرف مسلمان ہونا شاید یاد آ چکا ہے اور وہ اغیار کے مقابلہ میں اپنوں سے یگانگت برتنے کے جذبے کو بیدار کر چکے ہیں ۔ " [1]

" ہندوستان میں اردو " اور " انیس سو ستاون عیسوی کا ایک مشاعرہ " میں شوکت تھانوی نے برصغیر کی تقسیم کے بعد بھارت میں اردو کی حالت زار بیان کرتے ہوئے اس شبہ کا اظہار کیا ہے کہ مستقبل قریب میں اردو بولنا اور اردو لکھنا ایک ایسا جرم بن جائے گا جو قابلِ دست اندازی پولیس ہوگا وہ لکھتے ہیں کہ " اس قسم کی خبریں بھی آنے لگیں گی کہ پولیس کی ایک جماعت نے ایک مکان پر چھاپہ مار کر پانچ ایسے اشخاص کو گرفتار کیا ہے جو پوشیدہ طور پر ناجائز زبان میں ایک دوسرے کو شعر سنا رہے تھے پولیس نے ان کی تلاشی لے کر اشعار کی کتابیں بھی برآمد کیں ۔ معلوم ہوا ہے کہ شہر میں کچھ دنوں سے اس قسم کی وارداتیں چوری چھپے ہو رہی تھیں ۔ امید ہے ان پانچ گرفتار شدگان سے اردو کے مزید اڈوں کا بھی پتہ چلے گا جہاں اردو ناجائز طور پر کشید کی جاتی ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ حکومت اردو بولنے والوں کے بعض لائسنس ہولڈرز کے لائسنس بھی اسی سلسلہ میں منسوخ کرنے والی ہے ۔ " [2]

" انیس سو ستاون عیسوی کا مشاعرہ " میں شوکت تھانوی لکھنؤ کے ایک مشاعرہ کا حال بیان کرتے ہوئے اردو زبان اور اردو شاعری کی حالت پر افسوس

---

[1] شوکت تھانوی : " ہمنوا میں بھی کوئی گل ہوں "؟ ماخوذ از وغیرہ وغیرہ صفحہ = 66 ، 67 ، بار دوم ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور ۔

[2] شوکت تھانوی: " ہندوستان میں اردو " ، ماخوذ از شوکتیات ، صفحہ = 210 طبع سوم ، اردو بک اسٹال لاہور ۔

کرتے ہیں ۔ مصنف کے میزبان سراج الہ آبادی سے دیپک پریا گی بن چکے ہیں ۔ وہ شوکت تھانوی کو وہاں کے حالات بتاتے ہوئے گذارش کرتے ہیں کہ "بھیّا میری دو تین باتیں گرہ میں باندھ لو ۔ تفصیل تو گھر جا کر بتاؤں گا فی الحال یہی کہنا ہے کہ یہ بات بھول کر بھی کسی سے نہ کہنا کہ تم کسی مشاعرے کی شرکت کے لئے یہاں آئے ہو ۔ بس تم میرے بھائی ہو اور مجھ سے ملنے آئے ہو ۔ پاکستان کی تعریف اور ہندوستان کی برائی جہاں تک ہو سکے مجھ سے بھی نہ کرنا ۔ کسی کو شعر سنانے کی کوشش بھول کر بھی نہ کرنا کسی سے شعر سنانے کی فرمائیش بھی خطرے سے خالی نہیں ہے مختصر یہ ادبی اور سیاسی ذکر تو چھیڑنا ہی نہیں ۔

میں نے تعجب سے کہا "عجیب مسخرے ہیں آپ بھی اتنا بڑا مشاعرہ کر رہے ہیں کہ پاکستان سے اڑ کر آیا ہوں اور احتیاطیں اتنی شدید ۔" سہمے ہوئے انداز میں میرا بازو دبا کر بولے "وہ مشاعرہ بڑے راز کی چیز ہے ۔ یہی تو مطلب ہے کہ کسی کو مشاعرہ کا شبہ بھی نہ ہونے پائے میں گھر چل کر تم کو سب کچھ تنہائی میں بتا دوں گا ۔" [1]

"مادری اور سوتیلی زبانیں" میں قومی زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو کو محبت کرنے اور محبت کو پروان چڑھانے کی زبان قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

> معلوم نہیں کیوں مختلف زبانوں کی تقسیم کچھ یوں ہو کر رہ گئی ہے کہ عبادت کرنے کے لئے عربی ، گالی دینے کے لئے انگریزی اور محبت کرنے کے لئے اردو ہی کچھ مناسب اور برمحل زبانیں معلوم ہوتی ہیں ۔" [2]

---

[1] شوکت تھانوی : " 1957ء کا مشاعرہ " ماخوذ از شوکتیات ، صفحہ= 218 ، 219 ، طبع سوم اردو بک اسٹال ، لاہور ۔

[2] شوکت تھانوی: " مادری اور سوتیلی زبانیں " ماخوذ از شوکتیات ، صفحہ= 53 ، طبع سوم ، اردو بک اسٹال ، لاہور ۔

شوکت تھانوی کے بعض مضامین کا موضوع شاعری اور مشاعرہ ہے " نواب اچھے مرزا " میں شاعری کو ذریعۂ معاش بنانے کی روش اور شاعری میں سرقے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے ۔ " صدر مشاعرہ " میں مشاعروں میں صدر کے طویل خطبات پر نکتہ چینی کی ہے کہ یہ خطبے اتنے طویل ہوتے ہیں کہ زیادہ وقت خطبات کی نذر ہوجاتا ہے اور مشاعرہ کا مقصد فوت ہوجاتا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں " آج کل لاہور میں مشاعرے کے صدر کی ایک نئی قسم دریافت ہوئی ہے جس نے " مشاعرہ " کو " مصادرہ " سا بنا کر رکھ دیا ۔ ممکن ہے کہ مشاعرے کے عادی اس " مصادرہ " کو نہ سمجھ سکیں لہذا اس کی تشریح ضروری ہے یہ بھی دراصل ایک قسم کا مشاعرہ ہوتا ہے مگر اس میں مشاعرہ کم اور صدر زیادہ ہوتا ہے ۔ آپ یہ کہیں گے کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے مگر ہم عرض کریں گے کہ ہو اس لئے سکتا ہے کہ ہم نے خود دیکھا ہے اور اس مصادرے میں شرکت کی ہے ---- یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ مشاعرہ کم سے کم ہوتا ہے اور صدارت زیادہ سے زیادہ ۔ صاحبِ صدر ہر شاعر کے متعلق ایک مستقل خطبۂ صدارت ارشاد فرماتے ہیں ۔ "[1]

اسی طرح کی جھلک شوکت تھانوی کے دوسرے مضامین میں بھی دیکھی جاسکتی ہے جن میں " ایک شعر " " ایک مشاعرے کی کہانی " ، " سودیشی مشاعرہ " ، شاعر اور شاعری " مشاعرہ اور جوتا خاص طور سے اہمیت کے حامل ہیں ۔ " مشاعرہ اور جوتا " کا آغاز اس طرح کیا ہے " جوتا چرانے کی رسم پہلے مسجد کے لئے مخصوص تھی لیکن جب نمازیوں نے نعلین در بغلین کا فیشن ایجاد کیا تو یہ رسم مسجد سے نکل کر شادی بیاہ کے موقعوں ، دعوتوں ، رقص کی محفلوں بلکہ ان تمام محفلوں میں جو فرنیچری نہیں بلکہ " فرشی " ہوں پھیل گئی یہاں تک

---

[1] شوکت تھانوی : " صدر مشاعرہ " ماخوذ از سودیشی ریل اور دوسرے افسانے صفحہ = 58 ، 59 ۔ بار دوم ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور ۔

که ادبی محفل یعنی مشاعرہ میں بھی اس کے جراثیم پائے جانے لگے ۔" [1]

" شاعر اور شاعری " میں شوکت تھانوی نے " ماضی " کے مشاعروں کا " حال " کے شاعروں سے موازنہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ " دنیا کے ساتھ ساتھ شاعر بھی رنگ بدل رہے ہیں جو حالت شعراء کی پہلے تھی وہ اب نہیں ہے اور جو اب ہے وہ کچھ دن بعد نہ ہوگی ہم کو تو کچھ ایسے آثار نظر آتے ہیں کہ کچھ دنوں کے بعد عام انسانوں اور شاعروں میں مشکل سے امتیاز ہوسکے گا ۔ ابھی ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے جو تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں ان سے تو بس یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ تھوڑے دنوں میں ہر قسم کے انسان شاعر ہونے لگیں گے پہلے یہ ہوتا تھا کہ ایک شاعر دنیا کے اور کسی کام کا نہ رہتا تھا اس کو دن رات مصرع کے اوپر مصرع یا مصرع کے نیچے مصرع لگانے کی ایسی فکر ہوتی تھی کہ دنیا کے دوسرے کام کیسے کھانا پینا تک دشوار ہوجاتا تھا ------ لیکن اب جو شاعر پیدا ہو رہے ہیں وہ وکالت بھی کرتے ہیں اور ڈپٹی کلکٹری بھی ۔ پروفیسری بھی کرتے ہیں اور ایڈیٹری بھی ۔ طبابت بھی کرتے ہیں اور تجارت بھی ۔ ٹکٹ کلکٹری بھی کرتے ہیں اور کلرکی بھی اور اس کے بعد شاعر بھی ہیں ۔" [2]

" یہ اقبالئے اور اقبالیات " میں اہل ملک کی اس روش پر تنقید کی گئی ہے کہ ہر شخص اقبال کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے کوئی اس کی تقلید کو شہرت کا ذریعہ بناتا ہے اور کوئی اپنے خیالات کی وضاحت کے لئے کلام اقبال کی غلط سلط تاویلیں کرتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ : " اقبال کے متعلق یہ تو خیر طے ہی ہے کہ وہ پڑھے لکھے سمجھداروں اور فکر و نظر والوں کا شاعر ہے تو اب آپ

---

[1] شوکت تھانوی : " مشاعرہ اور جوتا " ماخوذ از موج تبسم ، صفحہ = 88 ، صدیق بک ڈپو ، لکھنو ۔

[2] شوکت تھانوی: " شاعر اور شاعری " ماخوذ از موج تبسم " صفحہ= 168 ، 169 ، 170 ، صدیق بک ڈپو ، لکھنو ۔

ہی بتائیے کہ کس کو اس بات کا شوق نہ ہوگا کہ وہ بس اس ذرا سی بات سے اپنے کو پڑھا لکھا ، سمجھدار اور اہل فکر و نظر ثابت کردے ۔ اس سلسلہ میں نہ تو کسی لائسنس کی ضرورت ہے نہ کسی پر کوئی قانونی پابندی عائد ہوسکتی ہے اور نہ اس کا امکان کہ کوئی صاحب امتحان لینے بیٹھ جائیں گے لہذا آبروئے شیوہ اہل نظر جائے یا رہے مگر بوالہوس تو حسن پرستی شعار کرنے سے باز رہ نہیں سکتے اور کیوں باز رہیں ۔ مفت میں ایک بھرم قائم ہوسکتا ہے تو کیوں نہ قائم ہو "[1]

" ماسٹر چھوٹے لال عاصم " میں شوکت تھانوی نے اشعار کی غلط تشریح کرنے والے اساتذہ پر تنقید کی ہے ۔ اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ شعری ذوق نہ ہونے کے سبب شعر کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں اور طلبہ پر اپنی علمیت کا رعب ڈالنے کے لئے مشکل الفاظ میں تشریح کرتے ہیں ۔ ماسٹر چھوٹے لال عاصم کی معلومات اسلامی تہواروں کے بارے میں بہت محدود ہیں وہ بقرعید اور عید الفطر کے پس منظر سے واقف نہیں ہیں لیکن اپنے طالب علموں کو ایک ایسے شعر کی تشریح جس میں عید الفطر کا تصور ابھرتا تھا اس طرح سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں " خدا کے ایک پیغمبر تھے حضرت ابراہیم جن کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ خدا کی راہ میں ہر قربانی دے سکتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کو جب ان کے اس دعویٰ کی خبر ہوئی تو اس نے آپ کو حکم دیا کہ اپنے اکلوتے بیٹے اسمٰعیل کو اپنے ہاتھ سے خدا کی راہ میں قربان کردیں ۔ حضرت ابراہیم نے اس حکم کی فوراً تعمیل کی اور اپنے بیٹے اسمٰعیل کو لے کر جنگل پہنچے اور ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ان کو لٹا دیا اور چھری پھیرنے ہی والے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابراہیم تم اپنے امتحان میں پورے اترے اور تمہاری قربانی میں نے قبول کرلی ۔

---

[1] شوکت تھانوی : " اقبالیات " ماخوذ از وغیرہ وغیرہ ، صفحہ = 169 ، بار دوم ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور ۔

میں تمہارا بیٹا نہیں چاہتا بلکہ تمہارے لئے بکرا بھیج رہا ہوں ۔ اس کو تیس دن تک روزے رکھ کر عید کے دن قربان کردینا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسی طرف میرا اشارہ ہے کہ ع روزہ داری فضلِ باری سے کش

یعنی اگر فضلِ باری نہ ہوتا تو روزہ داری نہ کشتی بلکہ اسمٰعیل کی گردن کشتی مگر چونکہ فضلِ باری تھا لہٰذا کیاچیز کشی ؟ عرض کیا " روزہ داری "[1]

" افسانہ نگار " میں افسانہ نگاروں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہر معمولی لکھا پڑھا شخص افسانہ نگار بن جاتا ہے اور وہ معیار سے گرے ہوئے اور فحش افسانے لکھتا ہے جس کی وجہ سے ہمارا ذوقِ سلیم زندہ در گور ہوجاتا ہے ۔ اور یہ اخلاق سوز ادب قومی کردار پر بھی بہت برا اثر ڈالتا ہے ۔ " تکبند شاعر " میں شوکت تھانوی نے تکبند شاعروں پر تنقید کی ہے اور ان کو سانپوں سے تشبیہ دی ہے کہ جس طرح سانپ خطرناک اور زہریلا ہوتا ہے اسی طرح اس قسم کا شاعر اپنے کلام سے زہر پھیلاتا ہے اور معاشرے کے لئے خطرناک ثابت ہوتا ہے ۔ " ادیبوں کی لڑائی " میں کہا گیا ہے کہ نقاد دیانتداری سے تنقید نہیں کرتے ۔ وہ لکھتے ہیں : "جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ادیبوں کی لڑائی میں عام طور پر صرف ایک جذبہ کار فرما نظر آتا ہے یعنی اپنا نام اور دوسرے کی ٹوپی اچھالنے کا جذبہ ، اب یہ آپ کو اختیار ہے کہ اسی اکلوتے جذبے کو آپ بہت سے ماتحت جذبوں میں تقسیم کردیں مثلاً دوسروں کی غیر معمولی مقبولیت اور اپنے بجھتے ہوئے چراغ پر کسی ادیب کو اگر غصہ آجاتا ہے تو وہ لڑ بیٹھتا ہے ۔ اس لڑائی کو عام طور پر تنقید سے شروع کیا جاتا ہے اور چونکہ تنقید محض بہانہ ہوتی ہے لہٰذا تنقید تو برائے نام رہ جاتی ہے تو تو ، میں میں البتہ

---

[1] شوکت تھانوی : " ماسٹر چھوٹے لال عاصم " ماخوذ از شوکتیات ، صفحہ 47 ، 48 ، طبع سوم ، اردو بک اسٹال ، لاہور ۔

زیادہ ہوتی ہے ----- جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فنّی بات تو خیر کوئی پیدا ہی ہی نہیں ہوئی ۔ رہ گئی خالص لڑائی وہ بھی کچھ یوں ہی سی ہو کر رہ گئی ہے یعنی نہ ادب نہ بے ادبی بلکہ سچ پوچھئے تو کچھ اناڑی پن سا دونوں حیثیتوں سے معلوم ہوتا ہے ۔ گویا ارادہ تھا اپنا نام اور دوسرے کی ٹوپی اچھالنے کا ، مگر اچھل کر رہ گئی دونوں کی ٹوپی اور نام بدنام ہوا ادب اور لڑائی دونوں کا ۔" [1]

" لکھنؤ " ، تکلفاتِ لکھنؤ " اور " موازنۂ لکھنؤ و لاہور " میں لکھنوی تہذیب کے تکلفات کو موضوع بناتے ہوئے یہ کہنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ادیب یا نقاد کو تعصب اور تنگ نظری سے کام نہیں لینا چاہئیے ۔

شوکت تھانوی نے " ادبی مضامین " مختلف رسائل اور اخبارات کے نمائشی نمبروں کے لئے تحریر کئے ہیں اس لئے وہ اس قسم کے مضامین کو " نمائشی مضامین " کہتے ہیں ۔ یہ نمائشی مضامین کس مجبوری کے تحت لکھے جاتے ہیں اس سلسلے میں شوکت تھانوی لکھتے ہیں کہ ان کے تین قریبی دوست " اقبال نمبر " نکال رہے تھے " اس لئے تینوں کے لئے مضامین لکھنا از بس ضروری تھا ۔ ایسا ضروری کہ زندگی اور موت کی قسم کا سوال آپڑا تھا یعنی لکھیں تو خود مریں اور نہ لکھیں تو یقین یہ دلایا گیا تھا کہ لکھوانے والے خودکشی کریں گے لہذا ایک مضمون لکھا ہو کھپ کر ۔ اب سوال یہ تھا کہ دوسرا اور تیسرا کیونکر لکھا جائے آخر ایک ترکیب ذہن میں آئی کہ اس مضمون کا درمیانی حصہ اگر پہلے لکھ دیا جائے ۔ آخری حصہ درمیان میں لکھ دیا جائے اور ابتدائی حصہ آخر میں آجائے تو معلوم ہوگا کہ جیسے نیا مضمون ہے ۔ لیجئے دوسرا مضمون بھی ہوگیا ۔ اب اسی

---

[1] شوکت تھانوی: " ادیبوں کی لڑائی " ماخوذ از لاہوریات ، صفحہ = 175 ، 176 ، 177 ، بار چہارم ، اردو بک اسٹال ، لاہور ۔

فارمولے سے تیسرا مضمون تیار کرلیا کہ تیسرے مضمون میں آخری حصہ شروع میں تھا ۔ درمیانی حصہ آخر میں تھا اور آخری حصہ کی جگہ پہلا حصہ تھا ۔ یہ تینوں مضامین تین مختلف اقبال نمبروں میں چھپ گئے اور زیادہ سے زیادہ یہ ہوا ۔ ایک بہت بڑے نقاد قسم کے بزرگ نے صرف یہ لکھا کہ شوکت تھانوی کے یہاں خیالات و افکار کی تکرار اور تواتر کا غلبہ ہوتا جاتا ہے ۔" سہ[1]

شوکت تھانوی کے تیسری قسم کے مضامین وہ ہیں جنہیں ہم انشائیہ قرار دے سکتے ہیں ۔ انشائیہ کی تعریف کے سلسلے میں اب تک جن خیالات کا اظہار ہوا ہے ان میں جانسن کے الفاظ کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے ۔ "جانسن انشائیہ کو ایک ایسی ذہنی ترنگ سمجھتا ہے جس میں کسی نظم و ضبط اور ترتیب کا اہتمام نہیں ہوتا اور جس میں فنکار اپنے ناپختہ جذبات کا اظہار کرتا ہے ۔ جانسن بذات خود ایک ممتاز انشائیہ نگار تھا لہذا اس کی انشائیہ کی تعریف میں ایک ناقد کا تجزیہ ہی نہیں بلکہ ایک انشائیہ نگار کا ذاتی نقطۂ نظر بھی شامل ہے ۔" سہ[2]

شوکت تھانوی کے جن مضامین کو ہم انشائیہ کہہ سکتے ہیں ان میں چائے ، میز ، کھجلی ، مطب ، مروت ، چوری ، ہنسی ، آزادی ، مکھیاں ، مینار میں گنبد ، کیرم بورڈ ، اتوار ، آئینہ کے سامنے ، مشرقی اور مغربی کتا قابل ذکر ہیں ۔

---

[1] شوکت تھانوی: " اپنے مضامین اپنی نظر میں " ماخوذ از ماہنامہ کتاب لکھنؤ ، شوکت تھانوی نمبر ، صفحہ = 62، 63 ۔

[2] ڈاکٹر آدم شیخ : ماخوذ از " انشائیہ " صفحہ = 26 ، طبع اول 1965ء ، مطبع رحیمی پریس ، بمبئی ۔ 8 ۔

شوکت تھانوی کے انشائیوں کی نمایاں خوبی اختصار ، جامعیت اور عدم تکمیل ہے - وہ انداز بیان پر قدرت کی وجہ سے اختصار اور معلومات و مشاہدات کی وسعت کی بناء پر جامعیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں - وہ اپنے انشائیوں میں تشریح ، وضاحت اور تفصیل کی بجائے چند مسائل کی طرف ہمارے ذہن کو منتقل کرکے چھوڑ دیتے ہیں جس سے عدمِ تکمیل کا احساس پیدا ہوتا ہے - مثال کے طور پر "چائے" ، "میز" اور "مروّت" کو پیش کیاجاسکتا ہے -

شوکت تھانوی کے انشائیوں کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے بلکہ دوسرے کے کاندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کے قائل ہیں- اور بالواسطہ انداز برتنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے لئے وہ دو صورتیں اختیار کرتے ہیں - پہلی صورت یہ کہ وہ ایسے لطیفے اور چٹکلے بیان کرتے ہیں کہ جس سے پس منظر کی پستی ابھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے - اور دوسری صورت یہ کہ وہ شخصیت کے کسی پہلو کو چبھتے ہوئے اشعار اور حکیمانہ اقوال کے چوکھٹے میں اس طرح فٹ کر دیتے ہیں کہ خوبی یا خرابی خود بخود نمایاں ہوجاتی ہے، ان دونوں صورتوں کی تکمیل کے لئے شوکت تھانوی زیادہ تر مزاح سے کام لیتے ہیں اور اپنی تحریروں کو شگفتہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ تبسّم زیرِ لب کی بات پیدا ہوجائے اس قسم کی انشائیوں میں "کھجلی" ، "مکھیاں" ، "ہنسی" "چوری" اور "مینار میں گنبد" خاص طور سے اہمیت کے حامل ہیں - "مینار میں گنبد" کا آغاز شوکت تھانوی نے اس طرح کیا ہے "قطب مینار کی آخری منزل تک پہنچنے کی سیڑھیاں بس ایسی تنگ ہوکر رہ گی ہیں کہ ہمارا ایسا سینک سلائی آدمی تو نکل سکتا ہے لیکن اگر مولانا شوکت علی چاہیں کہ وہ بھی ان سیڑھیوں سے اطمینان کے ساتھ گذر کر اوپر پہنچ جائیں تو ان کو اپنے

جسم اور محدود گنجائش کے تناسب کو پیشِ نظر رکھ کر اقلیدس کی قابلیت صرف کرنا پڑے گی اور اپنے جسم کو آڑا ترچھا کر کے ایسے زاویے اختیار کرنا پڑیں گے کہ ایک طرف شانہ رگڑ رہا ہے تو دوسری طرف توند معرض خطر میں ہے - بہر حال بمشکل تمام اور بعد از خرابیٔ بسیار شاید وہ اوپر تک پہنچ سکیں - لیکن اگر ایک شخص اوپر سے آ رہا ہو اور دوسرا الفربہ و الطویل نیچے سے اوپر جا رہا ہو تو سوائے تصادم کے اور کوئی صورت ہی ممکن نہیں ہوسکتی اور تصادم بھی اس وقت تک بے نتیجہ ثابت ہوگا جب تک کہ اوپر سے آنے والا پھر الٹے پیر اوپر ہی کی طرف واپس نہ جائے اور جب نیچے سے اوپر جانے والا اوپر پہنچ لے تو پھر وہ بے چارا لائن کلیر لے کر نیچے اترے - "[1]

شوکت تھانوی کے اخبارات و رسائل میں چھپنے والے ، ریڈیو پر نشر ہونے والے اور کتابی صورت میں شائع ہونے والے مضامین کی تعداد دو سو چونتیس کے لگ بھگ ہے ان میں وہ تمام مضامین شامل ہیں جنہیں شوکت تھانوی نے فرمائشی ، فہمائشی ، نمائشی ، معاشی اور پیدائشی مضامین کہا ہے - اور ان کے معیار کے بارے میں لکھا ہے کہ " اگر ان مضامین کو آپ ادبی کسوٹی پر جانچیں تو یہ آپ کی زیادتی ہوگی جو مضامین اس معاملت پر لکھے جائیں کہ جتنا ہی گڑ ڈالو گے اتنا ہی میٹھا پاؤ گے - ان مضامین کو ادبی معیار پر جانچنا زیادتی نہیں تو اور کیا ہے - "[2]

شوکت تھانوی نے یہاں انکساری سے کام لیا ہے - حقیقت یہ ہے کہ ان کے بہت سے مضامین ادبی معیار پر پورے اترتے ہیں - بعض مضامین میں موضوع

---

[1] شوکت تھانوی : " مینار میں گنبد " ماخوذ از دنیائے تبسم " صفحہ = 15 ، حالی پبلشنگ ہاوس ، کتاب گھر ، دہلی -

[2] ماخوذ از ماہنامہ کتاب لکھنؤ ، صفحہ = 63 -

کی یکسانیت اور تواتر نظر آتا ہے مثال کے طور پر " پڑوسی عذاب " اور " ایک مکان کی ضرورت ہے " ، میں " بلائے جاں " ، " مہمان " اور " دوست " میں ، " نبھے کیوں کر ؟ " اور " شائیگر " میں " یہ اقبالئے " اور " اقبالیات " میں موضوع کی یکسانیت نظر آتی ہے ۔

شوکت تھانوی اپنے زمانے میں " زیادہ بکنے " والے ادیب مانے جاتے ہیں اور یہی ان کی مقبولیت کا راز بھی ہے ۔ ان کی اس حیثیت سے ان کے پبلشرز نے ناجائز فائدہ اٹھایا ۔ انہوں نے پہلے سے کتابی صورت میں شائع ہونے والے مضامین کو اپنی کتابوں کی زینت بنایا ۔ مثال کے طور پر لارک پبلشرز ، اورنگ زیب مارکیٹ بندر روڈ کراچی نے " خواہ مخواہ " کے نام سے شوکت تھانوی کے اٹھارہ مضامین کا مجموعہ شائع کیا ہے ۔ جبکہ یہ اٹھارہ مضامین " طوفانِ تبسم " میں جو شوکت تھانوی کا چوتھا مجموعۂ مضامین ہے ، شائع ہو چکے ہیں ۔ ادارہ فروغ اردو لاہور نے چند اہم مضامین کا انتخاب کرکے اور چند نئے مضامین لکھوا کر " برے بھلے " کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس میں سترہ مضامین شامل کئے گئے ۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو کتاب کا نام " برے بھلے " کی بجائے " سودیشی ریل اور دوسرے افسانے " کردیا گیا ۔

اس بے احتیاطی کے باوجود شوکت تھانوی کے مضامین کا فنّی اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو بقول نیاز فتحپوری ہمیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ "شوکت ، ایک فطری ادیب و شاعر کی طرح جزئیات کے مطالعہ کے بہت شائق ہیں اور ان کے اظہار پر بھی قدرت رکھتے ہیں لیکن کھلنڈرے پن کے ساتھ اور یہی وہ چیز ہے جس نے انہیں " مزاح نگار " بنا دیا ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو انہیں ملک کے دوسرے مزاح نگاروں سے جدا کرتی ہے اس

رنگ کے لکھنے والوں میں اس وقت پطرس ، رموزی ، رشید اور عظیم بیگ چغتائی بہت مشہور ہیں لیکن جس طرح ان میں سے ہر ایک دوسرے سے ممیّز ہے اسی طرح شوکت ان سب سے علیحدہ ہیں ۔" [1]

شوکت تھانوی ذہانت اور زندہ دلی کا مجسم پیکر تھے اور زبان کے معاملے میں بہت زیادہ محتاط تھے وہ نازک سے نازک خیال کو سلجھا کر پیش کرتے تھے ان کے مضامین میں کوئی الجھاؤ اور ابہام نظر نہیں آتا ۔ وہ سیدھی سادی بات کو بلا وجہ دقیق اور فلسفیانہ بنانے کی کوشش نہیں کرتے کہ پڑھنے والے کو مزاحیہ مضامین میں سوچنا پڑے کہ یہ مزاح ہے یا کچھ اور ہے ۔ شوکت تھانوی کے تراشے ہوئے جملے ، ان کے مزاح کا بے ساختہ پن ، ان کی ادائیگی اور ان کی بندشیں ایسی ہوتی ہیں کہ پڑھنے والا لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ ایک مضمون " خدا سر دے تو سودا دے میں شوکت تھانوی لکھتے ہیں " آخر ایک دن غور کیا کہ عشق کس طرح کریں ۔ معشوق بھی خدا کے فضل سے مل گیا ہے اور عاشق بھی ہم ہیں لیکن عشق کرنے کا طریقہ تو معلوم ہونا چاہئیے ۔ یہ سوچ کر قصہ لیلیٰ مجنوں شروع سے آخر تک رات بھر میں پڑھ ڈالا اور نہایت غور سے پڑھا ۔ صبح ہوتے ہی گھر سے نکل کر اپنے بیٹھکے میں آئے اور عاشق کی صورت بنانا شروع کی ۔ اچکن اتاری ، قمیص کو پھاڑ کر پھینک دیا ۔ صرف گریبان گلے میں ڈال لیا ۔ پاجامے کو لنگوٹی کی شکل میں پھاڑ کر باندھ لیا اور ننگے سر ننگے پاؤں گھر سے نکل کر یکّے کی تلاش میں چلے ، لیکن کوئی یکّے والا بٹھانے پر راضی نہ ہوا ۔ ایک آدھ سے لڑائی بھی ہوگئی ----- مجبوراً بے چارے کو پیدل جانا پڑا ۔ راستہ میں کتے بھونکے ۔ لڑکوں

---

[1] ماخوذ از بحر تبسم ، صفحہ = 9 ، بارِ اوّل ، نسیم بک ڈپو ، لکھنؤ ۔

نے ڈھیلے مارے ۔ لوگوں نے مذاق کیا لیکن یہ اپنی زد میں سیدھے کوچہ یار میں آکر ٹھہرے اور خدا کا شکر ادا کیا کہ آج کچھ کچھ عشق رنگ لایا ہے اس لئے کہ مجنوں پر بھی شروع شروع میں کتّے بھونکے تھے اور یہی تمام واقعات گذرے تھے ۔" [1]

" ادیبوں کی لڑائی " میں شوکت تھانوی نے ضلع جگت کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ لکھتے ہیں : " فرض کر لیجئے کہ کوئی بےچارہ شاعر ایسا ہے جو شاعری ذوق کے لئے اور کپڑے کی دوکان پیٹ کے لئے کرتا ہے ۔ اب اس پر جن صاحب کو غصہ آئے گا وہ کچھ اس طرح کی تنقید فرمائیں گے کہ " جناب کے کلام میں ململ کی سی نرمی مخمل کی سی نفاست اور کمخواب کی سی دلآویزی تو بظاہر بہت ہے مگر عروض سے شاید آپ کو کوئی سروکار نہیں ۔ مصرعے بھی غالباً گز ہی سے ناپتے ہیں اور گرہ دو گرہ کی کمی بیشی کی چنداں پرواہ نہیں کرتے ۔" [2]

شوکت تھانوی کی مزاح نگاری کے زیادہ شگفتہ اور زیادہ موثر نمونے اس وقت سامنے آتے ہیں جب ان کی ذہانت رنگینیٔ تخیل اور تازگیٔ فکر کی ابھارتی اور ان کے میل جول سے لفظوں کا طلسم خانہ آباد کرتی ہے ۔ لفظوں کے اس میل ملاپ کی ان کے یہاں مختلف صورتیں ہیں ایک صورت تو یہ ہے کہ ایک ہی جملے میں اتنی بڑی بات کہہ جاتے ہیں کہ پوری شخصیت کا پھیلاؤ اس میں سما جاتا ہے اس کی مثالیں خاکہ نگاری کے باب میں پیش کی جاچکی ہیں ۔

---

[1] شوکت تھانوی: " خدا سردے تو سودا دے " ماخوذ از موجِ تبسم صفحہ = 152 ، 153 ، صدیق بک ڈپو ، لکھنو ۔

[2] شوکت تھانوی: " ادیبوں کی لڑائی " ماخوذ از لاھوریات ، صفحہ = 175 ، 176 ، بار چہارم ، اردو بک اسٹال ، لاھور ۔

پروفیسر سیّد وقار عظیم کے بقول " شوکت تھانوی کے بے تکلف اور بے ساختہ مزاحیہ اسلوب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی گفتگو میں بات میں بات نکلتی ہے اور اس کے باوجود کہ وہ برابر بڑھتی چلی جاتی ہے اس کی لطافت اور شگفتگی میں فرق نہیں آتا ۔ اور آورد آورد ہونے کے باوجود آمد کا مزہ دیتی ہے ۔ اس مزے دار آمد میں ہر جگہ لفظوں کا طِلسم اپنا کام کرتا ہے ۔ کبھی لفظوں کا تضاد ، کبھی ایہام اور رعایت ، کبھی فقرہ بازی ، کبھی پھبتی اور معترضہ جملے اور کبھی محض لفظوں کی الٹ پھیر ۔ لفظوں کو پرلطف اور پرمعنی تبصرے اور تنقید کا ذریعہ بنانا شوکت کی شخصیت نگاری اور مزاح نگاری کی مشترک خصوصیت ہے ۔" [1]

شوکت تھانوی عورتوں کی زبان لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں " مونڈی کاٹے " کے تمام مضامین ان کی اس مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں ۔

شوکت تھانوی کی زبان و بیان کے بارے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی رائے ہے کہ : " شوکت صاحب کی زبان اچھی ہے اور بیان بہت اچھا ۔ اس موقع پر بعض لوگ کوثر و تسنیم کا لفظ استعمال کئے بغیر نہ رہتے لیکن محض اس ڈر سے کہ آج کل ہماری انشا پردازی پر سب سے بڑا جرم یہ لگایا جاتا ہے کہ ہم عوب و فارس و ترکستان وغیرہ سے لائے ہوئے تشبیہ و استعاروں کے بڑے دلدادہ ہیں میں کوثر و تسنیم کے الفاظ سے ہاتھ دھوتا ہوں اور اپنے دوستوں کی خاطر یہ کہوں گا کہ شوکت صاحب کی زبان و بیان میں وہی لطف ہے جو لکھنؤ کی بالائی اور کھنیوں میں ہے ! شوکت صاحب نے لکھنؤ کی زبان میں پورب کے بعض خاص الفاظ اور لہجے بڑے لطف و لطافت سے سموئے ہیں ۔ کبھی کبھی

---

[1] ماخوذ از نقوش لاہور شوکت نمبر صفحہ = 47 ، ستمبر 1963 ء ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور ۔

ان کے فقرے شعر و ادب کا مزا دے جاتے ہیں ۔"[1]

شوکت تھانوی کے یہاں زبان کا لطف اور جزئیات نگاری کا کمال اس قدر خوبی کے ساتھ ملے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اپنی ایک خاص فضا پیدا کرلیتے ہیں اور قاری بے اختیار داد دینے پر مجبور ہوجاتا ہے ۔

شوکت تھانوی کی جزئیات نگاری کا کمال " پرابلم " کے اس اقتباس میں دیکھا جاسکتا ہے " صبح گائیڈ صاحب نے چائے پی کر جب المکلّف الخدمت کو رہینِ منت فرمالیا تو مکان دکھانے لے چلے ۔ یہ مکان یقیناً کسی زمانے میں مکان تھا غالباً نانا فرنویس کے زمانہ میں اس کی پہلی مرتبہ مرمت ہوئی تھی ۔ آسانی صرف یہ تھی کہ اس مکان میں رہ کر انسان اپنی اس نخوت کو بھول سکتا تھا جو بلا وجہ اشرف المخلوقات سمجھ سمجھ کر اپنے اوپر طاری رکھتا ہے ۔ گائیڈ صاحب نے نام کے ساتھ " تھانوی " دیکھ کر غالباً یہ سمجھ لیا تھا کہ ان حضرت کو اصطبل درکار ہے ۔ آفتاب کی روشنی سے آنکھوں کو جو تکلیف ہوتی ہے ۔ اس کے پورے بچاؤ کا انتظام تھا ۔ ہوا لگ جانے سے جو بیماریاں پیدا ہوسکتی ہیں ان کا بھی کوئی خطرہ نہ تھا ۔ ہر کمرہ غسل خانہ اور ہر غسل خانہ آسانی سے کمرہ بن سکتا تھا ۔ نمی اس قدر تھی کہ خس کی ٹٹیوں کا خرچ آسانی سے بچایا جاسکتا تھا ۔ ہر کمرے کا فرش ایسا کہ چاہے کھیتی باڑی شروع کردیجئے ، چاہے پھول دار چمن بنا لیجئے ۔ مختصر یہ کہ ہم نے مکان دیکھنے کے بعد گائیڈ صاحب کا منہ جو دیکھا تو دونوں میں ذرا بھی فرق نہ تھا ۔"[2]

شوکت تھانوی کے مضامین کے اقتباسات سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے اسلوب پر کسی دوسرے ادیب کی چھاپ نہیں ہے ۔ ان کی

---

[1] ماخوذ از دنیائے تبسم ، صفحہ = 11 ، حالی پبلشنگ ہاوس کتاب گھر دہلی ،

[2] شوکت تھانوی : "پرابلم" ماخوذ از سودیشی ریل اور دوسرے افسانے ، صفحہ = 231 ، 232 ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور ۔

شگفتہ بیانی سے ہر آدمی ہنسنے پر مجبور ہوجاتا ہے ۔ سیّد احتشام حسین ان کی مزاح نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ " شوکت کا مزاح اسی زندگی میں پروان چڑھا تھا اور اس کی سطح وہی تھی جو لکھنو کے ذہین اور طبیعت دار تعلیم یافتہ لوگوں کی ہوتی ہے ۔ لفظوں ، فقروں اور جملوں سے مزاح پیدا کرنا ، واقعات کے معمولی پیچ و خم سے ظرافت کے پہلو نکالنا ، بات میں بات پیدا کرکے ہنسانا شوکت کے لئے معمولی بات تھی ۔ ان کے تخیل کی جولانی واقعات کو وہ شکل دینے میں کامیاب ہوجاتی تھی جو امکانی حدوں کے اندر لطف پیدا کرے "۔[1]

شوکت تھانوی کے چوتھے مجموعۂ مضامین " طوفانِ تبسّم " کا مقدمہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے "کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے " کے عنوان کے تحت لکھا ہے وہ لکھتے ہیں "اس مجموعے کے سارے مضامین خوش مذاقی میں ڈوبے ہوئے ہیں ، میری ہمیشہ سے یہ رائے ہے کہ اس طرح کے مضامین لکھنا آسان کام نہیں ہے ۔ شعر کی تعریف کی گئی ہے کہ جب وہ پڑھا جائے تو ہر شخص سمجھے کہ میں بھی ایسا شعر کہہ سکتا ہوں لیکن جب لکھنے بیٹھیں تو بڑے بڑے معجز نگار ہزاروں دفعہ قلم دوات میں ڈبوئیں اور ویسا ایک شعر نہ لکھ سکیں ، بس یہی حال خوش مذاقی کا ہے ۔ ہر شخص پڑھتے وقت سمجھتا ہے کہ یہی میرے دل میں ہے لیکن دل کی اس بات کو زبانِ قلم پر لانے والے ڈھونڈنے ہی سے کچھ ملیں تو ملیں ۔ دور کیوں جاؤ خود اپنے ملک کی حالت ہی دیکھ لو یہاں ہزاروں اخبارات اور سینکڑوں رسالے چھپتے اور بکتے ہیں اور شاید ہی کوئی پرچہ ہوگا جس میں خوش مذاقی کا ایک آدھ مضمون نہ ہوتا

---

[1] ماخوذ از ماہنامہ کتاب لکھنؤ ، شوکت تھانوی نمبر ، صفحہ = 37 ، جولائی 1963 ء ۔

ہو لیکن بس رہنے ہی دیجئیے ۔
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں[1]

شوکت تھانوی کو اس بات کا احساس تھا کہ معاشی پریشانیوں کی وجہ سے ان کے مضامین کا معیار وہ نہیں رہا جو ہونا چاہئیے تھا ۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون " اپنے مضامین اپنی نظر میں " بڑا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ :

" اب اگر مجھ کو غمِ روزگار اور فکرِ معاش دونوں سے آزاد کر کے خود اپنے مضامین پر نظر ڈالنے کا موقع دیا جائے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بہت ہی کم سخت جان مضامین ایسے نکلیں گے جن کو میں باقی چھوڑ دوں باقی سب ردّی کی ٹوکری میں نظر آئیں گے ۔ لہٰذا خیریت اسی میں ہے کہ مجھ کو اس طرف متوجہ نہ کیجئے اور میرے مضامین کو میری نظرِ بد سے بچائیے ۔ "[2]

شوکت تھانوی کی اس رائے کے باوجود ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شوکت تھانوی اردو کے ایک صاحبِ اسلوب مضمون نگار ہیں انہوں نے متنوّع موضوعات پر مضامین لکھے ہیں انہوں نے معمولی موضوعات پر شگفتہ مضامین لکھ کر اس بات کو ثابت کردیا ہے کہ موضوع اچھا یا برا نہیں ہوتا بلکہ موضوع کو برتنے والا اسے اچھا اور برا بنا دیتا ہے ۔ شوکت تھانوی نے علمِ اشیاء کے مقابلے میں مشاہدۂ اشیاء سے زیادہ کام لیا ہے ۔ انداز بیان کا بے ساختہ پن اور زبان و بیان کی شگفتگی کی وجہ سے اردو مضمون نگاری کی تاریخ میں شوکت تھانوی کا نام ہمیشہ ادب اور احترام سے لیا جاتا رہے گا ۔

---

[1] ماخوذ از طوفانِ تبسّم ، صفحہ = 8 ، 9 ، صدیق بک ڈپو لکھنو ۔

[2] ماخوذ از ماہنامہ کتاب لکھنؤ ، صفحہ = 64 ، شوکت تھانوی نمبر ، جولائی 1963ء ۔

: ———— : : ———— :

اردو ادب میں " افسانہ " کی عمر ایک صدی سے بھی کم ہے لیکن دیگر اصنافِ ادب کی طرح یہ ابتدا ہی سے ارتقاء کے منازل طے کرتا رہا ہے جس کی وجہ سے اس نے اردو ادب میں ایک مستقل اور ممتاز صنف کی حیثیت اختیار کر لی ہے اس کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر سیّد وقار عظیم لکھتے ہیں : "جس طرح انگریزی میں (FICTION) کا لفظ ایک وسیع مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح اردو میں افسانہ ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے اور -------- افسانوی ادب کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالتے وقت اس بظاہر سیدھے سادے لفظ کے ان گنت اور ایک سے زیادہ ایک رنگین تصوّر ہماری نظر کے سامنے آتے ہیں ۔" [1]

ڈاکٹر جعفر رضا نے " پریم چند کہانی کا رہنما " میں مختصر افسانہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " کہانی اس صنفِ نثر کو کہتے ہیں جس میں کسی واقعہ ، کردار یا تجربہ کو مختصر اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کے قارئین یا سامعین کو تاثیر کی یک جہتی کا احساس ہو اور ان میں ادبی فن پارے کی تخلیقی انبساط محسور کرتی رہے اس لئے کہانی کے پیکر کو مرکزی نقطہ پر استوار ہونا چاہئیے ۔" [2]

شوکت تھانوی نے جب افسانہ نگاری شروع کی تو انہوں نے افسانہ کی تعریف اور اس کی بنیادی خصوصیات کو مدِّ نظر رکھ کر افسانے نہیں لکھے ۔

---

[1] سیّد وقار عظیم : " نیا افسانہ " صفحہ = 13 ، اردو اکیڈمی سندھ ، بندر روڈ ، کراچی ، 1957 ء ۔

[2] بحوالہ ڈاکٹر فردوس فاطمہ نصیر " مختصر افسانہ کا فنّی تجزیہ " صفحہ = 34 ، طبع اوّل ، 1957ء ، مطبوعہ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۔

یہی وجہ ہے کہ وہ مضمون کو افسانہ اور افسانے کو مضمون کہتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ شوکت تھانوی " مابدولت " میں لکھتے ہیں : " ترچھی نظر " کے افسانے پڑھ کر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم خود کیوں نہ کہانیاں لکھیں چنانچہ بہت ڈرتے ڈرتے ایک افسانہ لکھ کر " ترچھی نظر " کو بھیجا اور ہم کو تعجب ہوا کہ وہ افسانہ مِن وعَن چھپ گیا ۔ دوسرا افسانہ ، تیسرا افسانہ اور چوتھا افسانہ ہر افسانہ چھپ جایا کرتا تھا ۔ لیجئے شاعر تو تھے ہی افسانہ نگار بھی بن گئے ۔" [1]

شوکت تھانوی کا پہلا افسانہ " امرود کا چور " رسالہ " ترچھی نظر " میں شائع ہوا ۔ ماہر القادری ایک مضمون میں لکھتے ہیں " پہلا افسانہ جس سے وہ دنیائے اردو میں متعارف ہوئے " امرود کا چور " ہے ۔" [2]

شوکت تھانوی کا پہلا افسانہ " امرود کا چور " سیلابِ تبسّم میں ہے ۔ یہ شوکت تھانوی کا تیسرا مجموعۂ مضامین ہے ۔ پہلا مجموعۂ مضامین " موجِ تبسّم " انیس سو بتیس عیسوی میں شائع ہوا تھا جس میں شوکت تھانوی کا مشہور افسانہ " سودیشی ریل " شامل ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہے کہ شوکت تھانوی نے پہلے مجموعے کے لئے اچھے مضامین اور اچھے افسانوں کا انتخاب کیا اور " امرود کا چور " پہلا افسانہ ہونے کے باوجود تیسرے مجموعے " سیلابِ تبسّم " میں شائع ہوا ۔

شوکت تھانوی " سودیشی ریل " کو کبھی مضمون اور کبھی افسانہ کہتے ہیں ۔ " مابدولت " میں وہ لکھتے ہیں " اسی زمانہ میں رسالہ

---

[1] شوکت تھانوی: " مابدولت " صفحہ = 70 ، بار چہارم ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور ۔

[2] ماخوذ از نقوش لاہور " شوکت نمبر " ، صفحہ = 380 ۔

" نیرنگِ خیال " لاہور کے سالنامہ انیس سو تیس عیسوی کے لئے ہم نے ایک مزاحیہ افسانہ " سودیشی ریل " کے نام سے لکھا ۔"[1] اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں : " انیس سو تیس عیسوی میں سودیشی ریل نامی جو مضمون لکھا تھا اس کی مانگ اب تک بہت زیادہ تھی حالانکہ وہ چھپّن مرتبہ مختلف زبانوں کے مختلف رسالوں میں چھپ چکا تھا ۔"[2]

" کچھ یادیں کچھ باتیں " میں لکھتے ہیں : " میرے لئے خود میرا ہی ایک مزاحیہ مضمون " سودیشی ریل " اچھی خاصی مصیبت بن چکا تھا ۔ یہ مضمون میں نے انیس سو تیس عیسوی میں رسالہ نیرنگِ خیال لاہور کے سالنامے کے لئے لکھا تھا ۔"[3]

شوکت تھانوی نے " سودیشی ریل " کو دوستوں کے اصرار پر انیس سو چھتیس عیسوی میں ناول کی شکل دے دی اور اسے شوکت بک ڈپو لکھنؤ سے شائع کیا ۔ مقدمہ ڈاکٹر سیّد نجم الدین احمد جعفری نے لکھا وہ لکھتے ہیں کہ : " یہ افسانہ اب سے چھ سال پہلے نیرنگِ خیال لاہور کے سالنامہ کے صفحات کی جان بن چکا ہے اور ملک میں عام طور پر مقبول ہوا تھا ۔ اب مصنّف اسے ضروری اضافہ و ترمیم کے بعد پہلے سے زیادہ دلچسپ بنا کر علیحدہ کتابی صورت میں شائع کر رہے ہیں ۔ میں نے ان کا یہ افسانہ دونوں حالتوں میں پڑھا ہے ۔"[4]

---

[1] شوکت تھانوی : " مابدولت " صفحہ = 127 ، بارِ چہارم ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور۔

[2] شوکت تھانوی: ایضاً صفحہ = 194 ،

[3] شوکت تھانوی : کچھ یادیں کچھ باتیں ، صفحہ = 121 ، بارِ اوّل ، ایضاً

[4] ماخوذ از سودیشی ریل ، صفحہ = 11 ، بارِ اوّل ، شوکت بکڈپو ، لکھنؤ

شوکت تھانوی نے اسی کتاب میں " عنوانِ بیان " کے تحت تحریر کیا کہ : " خود میری رائے ہو یا نہ ہو لیکن عام رائے یہ ہے کہ " سودیشی ریل " میرے مزاحیہ افسانوں میں سب سے بہتر افسانہ ہے جو میں نے رسالہ نیرنگِ خیال لاہور کے سالنامہ انیس سو تیس عیسوی کے لئے اب سے چھ سال پہلے لکھا تھا اور اس وقت تک ستآون مرتبہ مختلف زبانوں کے اخبارات و رسائل میں چھپ چکا ہے اور انگریزی کے علاوہ ہندی ، مرہٹی ، گجراتی ، گورمکھی اور بنگالی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوچکے ہیں ۔" [1]

شوکت تھانوی کا یہ شاہکار افسانہ کن حالات میں لکھا گیا اس کا پس منظر بیان کرتے ہوئے نیرنگِ خیال کے مدیر حکیم یوسف حسن لکھتے ہیں : " ہماری عادت تھی کہ ہم نوجوان اور نوخیز ادیبوں کو مختلف ڈھنگوں سے لکھنے اور اچھا لکھنے کی ترغیب دیا کرتے تھے اور بعض کو بعض سے اصلاح لے لینے پر بھی مجبور کرتے تھے ----- شوکت صاحب نے کہا " افسانہ لکھوں" ؟ میں نے کہا افسانہ ! افسانے تو بہت آجاتے ہیں اور نظموں کے لئے تو جگہ نہیں نکلتی ۔ نثری علمی مقالے کم ملتے ہیں لیکن اگر آپ مزاحیہ یعنی مزاحیہ افسانہ لکھیں تو بات دلچسپ رہے گی ۔ اس انداز میں لکھنے والے عنقا ہیں اور آپ میں بڑی صلاحیت ہے کوئی وجہ نہیں کہ ایک مزاحیہ افسانہ جب پوری کوشش سے لکھا جائے تو وہ کامیاب نہ ہو ۔ ذرا ذہن پر زور دے کر کوئی پلاٹ سوچئے اور مزاح کا رنگ بھرتے جائیے ------ ہم نوجوان کو اکساتے رہے شوکت نے ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری اور کہا میں کوشش کروں گا ۔ اس وقت میں بھی نہیں جانتا تھا کہ میں سودیشی ریل کے مصنف سے بات

---

[1] ماخوذ از سودیشی ریل صفحہ = 12 ، بارِ اول ، شوکت بکڈپو ، لکھنؤ ۔

چیت کر رہا ہوں یا میری اس تحریک کے نتیجہ میں ایک شاہکار مضمون کی تخلیق ہونے والی تھی ۔ نیرنگِ خیال کے اس سالنامہ میں بڑے پایہ کے مضامین تھے مگر جو چرچا سودیشی ریل کا ہوا وہ کسی دوسرے مضمون کو نصیب نہ ہوا ۔ "[1]

شوکت تھانوی نے " مابدولت " اور " کچھ یادیں کچھ باتیں " میں سودیشی ریل کا سنِ تصنیف انیس سو تیس عیسوی لکھا ہے جبکہ نیرنگِ خیال کی فائلیں دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ افسانہ انیس سو اٹھائیس عیسوی کے سالنامہ میں شائع ہوا ہے ۔ یہ نیرنگِ خیال کا پہلا سالنامہ تھا اس لئے اس کی خاص طور سے تیاری کی گئی اور اشتہارات کے ذریعے اس کی خاص پبلسٹی کی گئی ۔ نیرنگِ خیال کے مدیر حکیم یوسف حسن اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں : انیس سو اٹھائیس عیسوی کا زمانہ تھا ۔ متحدہ ہندوستان پر ہر جگہ برطانوی پرچم لہرا رہے تھے ۔ بھارت میں سودیشی تحریک زوروں پر تھی ------- نیرنگِ خیال نے سب سے پہلے سالنامہ انیس سو اٹھائیس عیسوی میں شائع کیا ---- ---- ہمارے اعصاب پر " نیرنگِ خیال " بری طرح سوار تھا ۔ پھر سالنامہ کے مضامین کیسے ہوں ؟ اس کے لئے ہندوستان کا سفر کرنے کی تیاری ہونے لگی ------- ان دنوں شوکت ایک نوخیز نوجوان تھے ۔ کچھ تھوڑا بہت لکھ لیتے تھے ۔ کبھی شعر و شاعری سے شوق فرماتے ۔ کبھی افسانوں میں دلچسپی لیتے کبھی کسی اخبار میں کچھ کام کرلیتے کبھی کسی کو کتاب مرتّب کردی ۔ دو چار ایسے مضامین بھی ان کے قلم سے نکلے تھے جن میں مزاح کی چاشنی اسی طرح تھی جس طرح ان کے منہ سے وہ پھولوں کی صورت جھڑتی رہتی تھی ۔ ابھی ادب میں ان کی صحیح لائن یا مقام کا تعیّن نہ ہوا تھا ۔ لکھنؤ میں نیرنگِ

---

[1] ماخوذ از نقوش لاہور " شوکت نمبر " ، صفحہ = 401 ـ 402 ـ

خیال کے محسنِ اوّل ہمارے دوست حامد اللہ افسر مقیم تھے ------- وہیں ہماری پہلی ملاقات شوکت صاحب سے ہوئی اور متعدد ملاقاتیں ہوئیں ------- ----- ہم نے باتوں باتوں میں شوکت کے ذہن پر نیرنگِ خیال کے آنے والے سالنامے کا ایسا خاکہ بھرا کہ یہ نوجوان ادیب ٹھٹھک کر رہ گیا ۔ وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگتا اور سمجھتا کہ کسی علاؤالدین چراغ کے ذریعے دنیائے ادب کے سامنے ایک ایسا طلائی اور نقوئی محل پیش کرنے والا ہوں جس میں سینکڑوں کھڑکیاں ہوں گی اور ہر ایک کھڑکی میں ایک نامور ادیب جلوہ افروز ہوگا اور پھر کیا اس میں شوکت تھانوی بھی ہو سکتا ہے یہ سوال تھا جو اس نوجوان ادیب کے ذہن میں بار بار ابھر رہا تھا ۔ کیوں نہیں ! اس میں شوکت تھانوی بھی ہوسکتا ہے مگر ذرا محنت کرکے ایک ایسا شاہکار مضمون لکھو کہ لوگ محوِ حیرت رہ جائیں --------- نیرنگِ خیال کے اس سالنامہ میں بڑے پایہ کے مضامین تھے مگر جو چرچا سودیشی ریل کا ہوا وہ کسی دوسرے مضمون کو نصیب نہ ہوا ۔ انیس سو اٹھائیس عیسوی میں انگریزی حکومت ہندوستان پر اپنا تسلّط مضبوط کرنے کی فکر میں تھی ------- سودیشی ریل کا بے ساختہ پن ۔ ہندوستانیوں کی تحریکِ سودیشی کا اُپمان کرنے والا ثابت ہوا ۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا ریلوے ممبر اس مضمون سے بہت متاثر ہوا اور محکمہ اطلاعات حکومتِ ہند نے اس مضمون کے انگریزی تراجم مختلف ذمہ دار افسروں ، گورنروں اور وائسرائے کو بھجوائے کیونکہ اس میں سودیشی تحریک کا مضحکہ جس انداز میں اڑایا گیا تھا وہ حکومت کے ہاتھ مضبوط کرتا تھا ------- ہمیں سو فیصدی یقین ہے کہ شوکت تھانوی کا ذہن اور دامن اس قسم کی آلائشوں سے پاک تھا اور انہوں نے سودیشی ریل خالص مزاحیہ انداز اور مزاحیہ بنیادوں پر استوار کی تھی ۔ اسے سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا ۔" [1]

---

[1] ماخوذ از نقوش لاہور " شوکت نمبر " صفحہ = 400 ، 401 ، 402 ۔

انیس سو اٹھائیس عیسوی میں " سودیشی ریل " کے چھپنے سے دنیائے ادب میں تہلکہ مچ گیا اور شوکت تھانوی ایک مزاح نگار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں داخل ہوئے ۔ " سودیشی ریل " کے حوالے سے شوکت تھانوی کی اتنی شہرت ہوئی کہ شوکت تھانوی اور " سودیشی ریل " لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے تھے ۔ شوکت تھانوی نے اس افسانے کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا لیکن لوگ اس مضمون کے شائع ہونے کے پندرہ بیس سال بعد بھی اگر شوکت تھانوی سے ملے ہیں تو وہ تعریف صرف " سودیشی ریل " ہی کی کرتے تھے حالانکہ بقول شوکت تھانوی " اس کے بعد میں نے اور بھی بہت سے مضامین لکھے جن میں سے بعض خود مجھے " سودیشی ریل " سے زیادہ پسند تھے[1] ۔" لوگوں کی اس عادت کی وجہ سے شوکت تھانوی کو " سودیشی ریل " وبالِ جان معلوم ہونے لگی ۔ وہ لکھتے ہیں " ادبی رسائل کی طرف سے فرمائشیں کچھ اس قسم کی آتی تھیں کہ " ہمارے لئے آپ سودیشی ریل کی قسم کا ایک سودیشی ڈاک خانہ لکھ دیجئے ۔" اور ـــــ " ہمارے لئے ایک مضمون سودیشی یونیورسٹی کے نام سے لکھ دیجئے جو آپ کی سودیشی ریل کی قسم کا ہو " عاجز آگیا تھا !! ان فرمائشوں سے اور سچی بات تو یہ ہے کہ جلنے لگا تھا سودیشی ریل کے نام سے کہ اس ایک مضمون نے مجھ کو عجیب سودیشی بھنڈار بنا کر رکھ دیا تھا ۔ لاکھ لوگوں سے کہتا کہ خدا کے لئے سودیشی ریل لکھنے کے اس قصور کو بخش دو مگر توبہ کیجئے کہ وہ کہاں بخشنے والے تھے ۔ خط و کتابت ہو یا آمنے سامنے کی گفتگو ۔ یہ بات وہ بات اور سودیشی ریل ۔ اور میرا یہ حال کہ جس طرح بعض لوگ اِمرتی اور گلاب جامن سے چڑنے لگتے ہیں کہ جہاں اِمرتی اور گلاب جامن کا نام آیا وہ پٹڑی سے اترے اور لگے اول فول بکنے ۔ کچھ

---

[1] شوکت تھانوی : "کچھ یادیں کچھ باتیں " صفحہ = 122 ، بارِ اوّل ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور ۔

اسی قسم کی کیفیت میں میں اپنے کو بھی مبتلا ہوتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ "[1]

شوکت تھانوی کے افسانوں اور مضامین میں خطِ امتیاز کھینچنا کافی حد تک مشکل ہے چونکہ ان کے بالعموم ہر مضمون میں افسانے کا رنگ اور ہر افسانے میں مضمون کا رنگ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ شوکت تھانوی کا مقصد افسانہ نگاری یا مضمون نگاری نہ تھا بلکہ ان کا مقصد زیادہ سے زیادہ لکھنا اور اپنی تحریروں میں مزاح کا رنگ پیدا کرنا تھا ۔ وہ اس مقصد میں کافی حد تک کامیاب ہوئے ۔ افسانے کی بنیادی خصوصیات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اگر شوکت تھانوی کی تحریروں کا تجزیہ کیا جائے تو پچاس کے لگ بھگ تحریروں کو افسانہ قرار دیا جاسکتا ہے ۔ یہ افسانے " ترچھی نظر " ، " سرپنچ " ، " حریم " ، " نقوش " ، " ساقی " اور " نگار " جیسے اہم رسالوں میں چھپتے رہے ہیں ۔ ان افسانوں کو شوکت تھانوی وقتاً فوقتاً اپنے مجموعۂ مضامین میں شامل کرتے رہے ہیں مثال کے طور پر پہلے مجموعۂ مضامین " موجِ تبسم " (انیس سو بتیس عیسوی) میں " سودیشی ریل " ، " خودکشی " اور " آسیبی خلل " تین افسانے شامل ہیں ۔ تیسرے مجموعۂ مضامین " سیلابِ تبسم " (انیس سو تینتیس عیسوی) میں " امرود کا چور " ، " ہم زلف " ، " گھاگھرا پار " اور " شامت " افسانے ہیں ۔ چوتھے مجموعۂ مضامین میں " افیونی " ، " لاٹری کا ٹکٹ " اور " آبنوس کا کندہ " افسانے ہیں ۔ اس مجموعۂ مضامین میں کچھ مضامین ایسے ہیں جنہیں مکمل طور پر افسانہ تو قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن ان میں افسانوی رنگ جھلکتا ہوا ضرور نظر آتا ہے ۔ مثال کے طور پر " ہنسی " ، " سالیاں " ، اور " نہ ہوا میں بیوی " وغیرہ ۔ پانچویں مجموعۂ مضامین " دنیائے تبسّم " میں " اختلاج "

---

[1] شوکت تھانوی : " کچھ یادیں کچھ باتیں " ، صفحہ = 123 ، 124 ۔ بار اول ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور ۔

" مرحومہ " ، " قلم فوجدار " ، " احمق اداکار " ، " شہتوت " ، "بردکھوا " اور " سرود خانۂ ہمسایہ " افسانے ہیں ۔

شوکت تھانوی کی زیادہ تر کتابیں " مجموعۂ مضامین " کہلاتی ہیں صرف دو کتابیں افسانوں کے مجموعے کی حیثیت سے شائع ہوئیں ایک کا نام ہے " سودیشی ریل اور دوسرے افسانے " جسے ادارہ فروغِ اردو لاہور نے شائع کیا اور دوسری کتاب کا نام ہے " کائناتِ تبسّم " (افسانے) جسے علوی بک ڈپو ، بمبئی نے جنوری انیس سو انسٹھ عیسوی میں شائع کیا ۔ ان دونوں کتابوں کے افسانے دیکھنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان افسانوں کے مجموعوں میں بہت سے مضامین شامل کردئیے گئے ہیں مثال کے طور پر " سودیشی ریل اور دوسرے افسانے " میں پانچ افسانے اور بارہ مضامین شامل ہیں اور جو افسانے اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں وہ کئی مرتبہ مختلف رسالوں میں شائع ہونے کے علاوہ کتابی صورت میں بھی چھپ چکے ہیں ۔ یہی حال " کائناتِ تبسّم " کے افسانوں کا ہے اس میں صرف چار افسانے ہیں اور باقی سولہ مضامین ہیں ۔

ان تفصیلات کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ بات واضح ہوسکے کہ شوکت تھانوی کے مضامین میں افسانویت اور افسانوں میں مضمون کا رنگ دکھائی دیتا ہے ۔ شوکت تھانوی کے افسانوں کا فنّی تجزیہ کیا جائے تو سب سے پہلے ہمیں ان کے افسانوں کے " پلاٹ " کو دیکھنا ہوگا چونکہ نقّاد افسانہ اور پلاٹ کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں ۔ پروفیسر سیّد وقار عظیم لکھتے ہیں کہ : " پلاٹ زندگی کے واقعہ کی ہوبہو شکل نہیں ہوسکتا اسے زندگی کے کسی واقعہ سے کسی نہ کسی حد تک مختلف ضرور ہونا پڑتا ہے ۔ اس کی ترتیب میں جب تک تھوڑا بہت تصنّع نہ ہو اس کی فنّی شکل پیدا نہیں ہوتی ۔ تصنّع کی یہ ہلکی سی چاشنی

ہی زندگی کے کسی واقعہ کو افسانہ بناتی ہے ۔"[1]

شوکت تھانوی کے افسانوں کے " پلاٹ " سادہ ہوتے ہیں ۔ ان میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں ہوتی جس کی وجہ سے قاری پر ان کا مقصد واضح ہوتا چلا جاتا ہے ۔ " جلوس " میں بنسی مزدور پیسے نہ ہونے کی وجہ سے تین دن تک فاقہ میں مبتلا رہا تو سود خور مہاجن ، زمیندار ، مولانا ، مندر کے پجاری اور مزدوروں کے لیڈر کے پاس باری باری بھیک مانگنے کے لئے جاتا ہے لیکن کسی نے اس کی مدد نہ کی تو وہ مندر کے باہر بیٹھ جاتا ہے اور شدید سردی کی وجہ سے مرجاتا ہے ۔ صبح کو لوگ جب اسے مرا ہوا پاتے ہیں تو اسے " سادھو " سمجھ کر اس کا شاندار جلوس نکالتے ہیں ـــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شوکت تھانوی نے یہ افسانہ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر لکھا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ شوکت تھانوی اس تحریک سے وابستہ نہیں تھے لیکن جس زمانے میں یہ افسانہ لکھا گیا اس زمانے میں ایسے افسانے فیشن میں داخل سمجھے جاتے تھے اور ہر افسانہ نگار اس قسم کے افسانے شعوری یا لاشعوری طور پر لکھ رہا تھا چنانچہ بظاہر شوکت تھانوی نے بھی لاشعوری طور پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کو قبول کر کے ایک شاہکار افسانہ تحریر کیا ۔

" نمک مرچ " میں شوکت تھانوی نے اس بات کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے کہ مشرق کے رہنے والے جب مغربی معاشرت اختیار کرتے ہیں تو ان سے ایسی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں جن سے ان کا مشرقی ہونا ظاہر ہو جاتا ہے ۔ اس افسانے میں اسلم کی پرورش خالص مشرقی ماحول میں ہوئی لیکن وہ اپنے آپ کو مغربی معاشرت میں ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہے جس کے لئے اسے چھری کانٹے

---

[1] سید وقار عظیم : " فنِ افسانہ نگاری " صفحہ = 51 ، طبع اوّل ، ناظر پرنٹنگ پریس ، کراچی اکتوبر 1949ء ۔

سے کھانے کی پریکٹس کرنا پڑی ۔ شوکت تھانوی لکھتے ہیں : " اس غریب کو تو ابھی چھری کانٹے سے کھانے کی مشق کرنا تھی ۔ چنانچہ مرتا کیا نہ کرتا ۔ پریکٹس کے لئے ایک چھری خریدی ۔ ایک کانٹا خریدا اور دونوں وقت کا کھانا اسی چھری کانٹے سے شروع کر دیا کہ چھری سے کاٹی روٹی ۔ کانٹے سے بنایا اس کا نوالہ اور پھر کانٹے سے وہ نوالہ اٹھا کر سالن کے پیالے میں ڈالا ۔ اور اب وہ نوالہ منہ میں لے جاتے ہیں تو نوالہ گرا واپس پیالے میں اور کانٹا لڑا دانتوں سے ۔ کھٹاک سے چھری کی مدد سے اسے کانٹے میں پھنسایا اور ادھر اس کے خیر مقدم کے لئے نکالی پوری زبان ۔ مگر نہ جانے نوالہ کیا ہوا ۔ البتہ کانٹا زبان میں چبھ کر رہ گیا ۔ بعد میں پتہ چلا کہ نوالہ آغوشِ شفقت میں پڑا قمیض کا ناس مار رہا ہے " [1] اسلم صاحب اس طرح کی مشق کرتے رہے لیکن جب بردکھوے کے لئے مولوی صاحب کے یہاں پہنچے اور کھانے کی میز پر بیٹھے تو ان کی اصلیت ظاہر ہوگئی " اسلم کا یہ حال کہ مچھلی اور آلو غلط کانٹے میں جو غلط ہاتھ میں تھا مسلسل کوشش میں پلیٹ پر جلترنگ بجانے میں مصروف تھے کہ آلو کا ایک موٹا سا قتلا چھری کے نیچے سے پھسل کر اب جو اڑا ہے تو گھبراہٹ میں کانٹا بھی ان کے ہاتھ سے چھُوٹ گیا ۔ خیر اس بات کو تو مرزا صاحب پی گئے اور مولوی صاحب کو باتوں میں لگا لیا مگر جب پلیٹ سے اڑا ہوا قتلا اسلم نے میز سے اٹھا کر پھر کانٹے میں پھنسایا تو بیرے نے پھر منہ پر جھاڑن رکھ لیا ۔" [2]

" خواہ مخواہ " میں شوکت تھانوی نے کوئی اصلاحی مقصد یا اخلاقی فلسفہ بیان نہیں کیا بلکہ ایک معمولی سے موضوع میں الفاظ کے ذریعے مزاح پیدا کرکے

---

[1] شوکت تھانوی : " نمک مرچ " صفحہ = 43 ، 44 ، ادارہ فروغِ اردو ، لاہور ۔

[2] شوکت تھانوی : ایضاً ، صفحہ = 49 ۔

قارئین کو ہنسانے کی کوشش کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں : " بھائی صاحب یہ مکان نہیں بلکہ مکان کا نصف حصہ ہے ۔ نصف بہتر میں خود مالک مکان عبدالغفور صاحب ، ٹھیکیدار رہتے ہیں اور اس نصف بدتر میں پہلے صرف میں رہتا تھا اب تم بھی رہو گے ۔" [1] اسی افسانہ میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں : " ان کے یہاں ایک ایسا نامعقول ریڈیو ہے جو سننے کے لئے نہیں ہے بلکہ کان پڑی آواز سننے نہ دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔" [2]

" لاحول ولاقوۃ " میں لکھنؤی معاشرت کو موضوع بنایا گیا ہے اس افسانے میں نواب صاحب کی مضحکہ خیز حرکتوں ، کرداروں کے دلچسپ مکالموں اور مصنف کی بامحاورہ زبان سے دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

" ان کی تصویر " ایک خیالی افسانہ ہے لیکن شوکت تھانوی نے اس میں شروع سے آخر تک دلچسپی قائم رکھی ہے اور پڑھنے والا یہ سوچتا ہے کہ زندگی دلچسپ واقعات کا مجموعہ ہے اور اس کے لئے قدم قدم پر ہنسنے کے سامان موجود ہیں ۔

" آسیب " کا مقصد بھی محض ہنسنا ہنسانا ہے ۔ افسانے کے تمام واقعات خیالی ہیں اور پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ زندگی میں اس طرح کی حالتیں بہت کم پیدا ہوتی ہیں اس کے باوجود وہ افسانہ پڑھنے میں منہمک رہتا ہے ۔ بیان کی شگفتگی اسے ذرا سی دیر کے لئے بھی کسی اور طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی ۔ " سودیشی ریل " میں بھی بیان کی شگفتگی سے قاری کو متاثر کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

---

[1] ماخوذ از نقوش لاہور شوکت نمبر ، صفحہ = 247 ۔

[2] ایضاً ، صفحہ 262 ۔

شوکت تھانوی نے اپنے افسانوں کے لئے زندگی سے جو موضوعات چنے ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم انسانی فکر اور عمل کے وہ پہلو ہیں جو بڑی مضحکہ اور تمسخر کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ انسان فکر اور عمل کے اعتبار سے جہاں اشرف المخلوقات ہے وہاں عجیب الخلقت بھی ہے۔ کوئی فن کار اگر دوسری چیز کو چھوڑ کر اس کی زندگی کے اس پہلو پر نظر رکھنے کو اپنی عادت بنالے تو اسے اپنے فن کے لئے ایسا مواد مل جاتا ہے جو اسے دوسروں سے منفرد کردیتا ہے۔ اب اگر فن کار میں اس مضحکہ خیز پہلو کو ذہانت کے ساتھ شگفتہ انداز میں پیش کردینے کی قدرت بھی موجود ہے تو یہ انفرادیت قابلِ رشک بن جاتی ہے۔ شوکت تھانوی کے افسانوں میں انفرادیت کا یہ پہلو ان کی فنّی زندگی کے آغاز سے ان کی خصوصیت رہا ہے۔ انہوں نے عورتوں اور مردوں کے میک اپ کو بارہا اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے کہ وہ اس مصنوعی میک اپ کے ذریعے اپنی اصلیت کو کس طرح چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے افسانے "بردکھوّا" کا آغاز شوکت تھانوی نے اس طرح کیا ہے۔ ایک مرتبہ تو حجام نے بال کاٹنے کے ساتھ داڑھی بنائی تھی۔ دوسری مرتبہ کوئی دو گھنٹے کے بعد خود ہم نے "دستِ خود دہانِ خود" کے اصول پر چلتے ہوئے احتیاطاً اس لئے نظر ثانی کرلی کہ مبادا کوئی کھونٹی رہ گئی ہو، اس کے بعد غسل خانہ میں پیر سوپ کی ایک بٹی مسلم اور دوسری نصف کے قریب اس کوشش میں صرف ہوئی کہ کسی طرح سنگ موسیٰ کو سنگ مرمر بنادیں۔ غسل خانہ میں دو گھنٹہ تک سخت محنت کرنے کے بعد لباس بھی اسی اہتمام سے تبدیل کیا اور آئینہ کے سامنے نوک پلک کی احتیاط کے ساتھ سولہ سنگھار کئے، اور جب اپنے متعلق ہر حیثیت سے اطمینان کرلیا تو ایک منصف مزاج غیر جانب دار نقّاد کی حیثیت سے خود اپنے اوپر نظر ڈالی کہ آیا ہم کسی معزز گھرانے کے داماد اور خوش مذاق، تعلیم یافتہ اور

مہذب لڑکی کے شوہر بننے کے قابل ہیں یا نہیں ؟ اور جب اس اعتبار سے بھی اپنے آپ کو خوب اچھی طرح پر کھ لیا تو اپنی ہونے والی سسرال کی طرف ایک مانگے کے موٹر پر روانہ ہوگئے ۔" [1]

شوکت تھانوی نے " افیونی " میں انسان کی مضحکہ خیز حالت کی ایک اور تصویر پیش کی ہے ۔ انسان نشہ کی حالت میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے جس کی وجہ سے قدرتی طور پر بہت سی نئی ادائیں اس میں پیدا ہوجاتی ہیں ۔ شوکت تھانوی لکھنؤ کے ایک افیونی کے بارے میں لکھتے ہیں : " میر صاحب کا زیادہ تر وقت اسی گوشۂ عافیت میں گذرتا تھا لیکن ہر روز کم از کم ایک مرتبہ آپ اپنے ایک دوست کے مکان پر ضرور جاتے تھے جہاں آپ کے تمام ہم مشرب یکجا ہوکر تھوڑا سا وقت دلچسپی کے ساتھ گذارتے تھے ۔ اس اجتماع میں بڑے بڑے ملکی اور قومی ، سیاسی اور معاشرتی ، ادبی اور تمدنی ، اخلاقی اور علمی مسائل پر بحث ہوتی تھی --------- ۔ ایک صاحب نے فوراً آنکھیں کھول کر فرمایا " ارے بھائی میر صاحب خوب یاد دلایا ، یار ، ان ہوائی جہازوں سے تو بڑی بے پردگی ہوتی ہے سب پردہ دار عورتوں کو یہ لوگ دیکھتے ہوں گے ؟" دوسرے صاحب کہنے لگے " ہاں بھائی کل ہی کا ذکر ہے کہ ایک ہوائی جہاز میرے مکان پر نکلا مگر بہت نیچا تھا میں نے بھی لڑکے کا لنگڑ لے کر جو اس پر مارا تو قسم ہے آپ کے سرِ عزیز کی بس ذرا سا بچ گیا ۔ نہیں تو زمین پر ہوتا اور ہڈی پسلی سرمہ ہوگئی ہوتی ۔" [2]

---

[1] شوکت تھانوی : " بر دکھوّا " ماخوذ از دنیائے تبسم ، صفحہ = 174 ، حالی پبلشنگ ہاوس کتاب گھر ، دہلی ۔

[2] شوکت تھانوی : " افیونی " ماخوذ از طوفانِ تبسم صفحہ = 104 ، 105 ، 108 ، صدیق بک ڈپو لکھنؤ ، بارِ دوم ، 1942ء ۔

" بیگم کی جنّت " میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شوکت تھانوی نے اپنی ازدواجی زندگی کا ایک ورق پیش کیا ہے۔ وہ ایک رات دوستوں کی محفل میں گِھر جانے کے باعث رات کے بارہ بجے کے بعد گھر پہنچتے ہیں تو بیگم صاحبہ کو اپنا منتظر پاتے ہیں۔ ان سے گفتگو کے دوران میں تخیّل کے بنائے ہوئے وہ مناظر پیش کرنے شروع کردیتے ہیں جن میں عورت کو مرد اور مرد کو عورت بنا دیتے ہیں۔ اس افسانے کی تمام تر دلچسپی مزاحیہ فقروں کی وجہ سے ہے۔ شوکت تھانوی نے اسی افسانہ کے خیال کو طول دے کر ناول " خدانخواستہ " میں پیش کیا ہے۔ اسی موضوع کو ایک ریڈیو ڈراما " کایا پلٹ " میں بھی بیان کیا ہے۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ شوکت تھانوی کو اخبارات ، رسائل ، ریڈیو ، دوستوں اور پبلشروں کی خاطر اتنا زیادہ لکھنا پڑا ہے جس کی وجہ سے ان کے یہاں خیالات کی کمی کا احساس ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خیالات کی اس کمی کو الفاظ کے الٹ پھیر سے پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

افسانہ کو جانچنے کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس افسانے نے پڑھنے والے کے دل و دماغ پر کتنا اور کیسا اثر کیا ؟ افسانہ نگار[1] کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ جو اثر اپنے پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر پیدا کرنا چاہتا ہے اس میں اسے کس حد تک کامیابی ہوئی۔ اگر افسانے میں یہ خوبی موجود ہے کہ اس سے ہر پڑھنے والے پر وہی جذبات اور کیفیات طاری ہوں جو مصنّف پیدا کرنا چاہتا ہے تو وہ ایک کامیاب افسانہ کہے جانے کا مستحق ہے۔ ڈاکٹر فردوس فاطمہ نصیر لکھتی ہیں " افسانہ کی ابتدا تو زندگی کے صرف ایک واقعہ یا حادثہ سے شروع ہوتی ہے اس لئے اس میں اتحادِ اثر کی پابندی نہایت ضروری اور ناگزیر ہے۔ واقعہ یا جذبہ کے بیان ، کردار نگاری ، فضا اور اسلوبِ بیان غرض ہر چیز سے افسانہ میں اتحادِ اثر لانا چاہئیے۔

جو تاثر مختصر افسانہ لکھنے کے وقت مصنف کے دل پر مسلّط ہے اس کو ہر ترکیب سے قاری پر طاری کردینا اس کا فرض ہے ۔"[1]

پروفیسر سیّد وقار عظیم افسانہ میں وحدتِ تاثر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں : " افسانہ میں اتحادِ اثر پیدا کرنے کے لئے افسانہ نگار کو جس چیز کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کرنی چاہئیے وہ یہ ہے کہ افسانہ میں وہ ہمیشہ صرف ایک مقصد پر زور دے ۔ ایک افسانہ میں ایک سے زیادہ مقاصد کی طرف متوجہ ہوجانے سے بہت سی فنّی خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں ۔"[2]

شوکت تھانوی نے اپنے افسانوں میں مقصد اور اندازِ بیان کو ایک دوسرے سے اتنا ہم آہنگ کردیا ہے کہ دونوں کو الگ کرنا دشوار ہے ۔ وہ چاہے سماجی اور معاشرتی اصلاح کے پیش نظر افسانے لکھیں یا صرف مزاح پیدا کرنے کے لئے ، دونوں حالتوں میں قاری میں کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے ۔ اس دلچسپی کو قائم رکھنے کے لئے شوکت تھانوی نے شاعرانہ استدلال ، تخیّل ، تشبیہات اور تراکیب کے استعمال سے کام لیا ہے ۔ وہ ہر چیز میں مزاح کا پہلو تلاش کرسکتے ہیں اس لئے انہوں نے اپنے افسانوں میں مزاحیہ اندازِ بیان اختیار کرکے وحدتِ تاثر کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے ۔ " لاحول ولا قوۃ " ، " خواہ مخواہ " ، "قلم فوجدار " ، " احمق اداکار " ، " اختلاج " ، " خودکشی " ، اور " افیونی " ایسے افسانے ہیں جن میں یہ خصوصیت نمایاں نظر آتی ہے ۔

---

[1] ڈاکٹر فردوس فاطمہ نصیر : " مختصر افسانہ کا فنّی تجزیہ " صفحہ = 51،50 ، طبع اول 1975ء ، مطبوعہ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۔

[2] سیّد وقار عظیم : " فنِ افسانہ نگاری " صفحہ = 66 ۔ طبع اوّل ۔ اکتوبر / 1949 ناظر پرنٹنگ پریس کراچی ۔

شوکت تھانوی کے افسانوں میں جو کردار پیش کئے گئے ہیں وہ دو طرح کے ہیں ایک تو ایسے ہیں جو واقعات کی ترقی ، ان کے مخصوص اثرات اور نتائج کے ساتھ نفسیاتی قوتوں کے اثر سے مجبور ہو کر بدلتے رہتے ہیں یا کسی خاص موقع پر ایک دم بدل جاتے ہیں اور اپنی پرانی فطرت کو قوانینِ قدرت کے قدموں پر نثار کر کے ایک نئی اور زیادہ بہتر یا بدتر زندگی میں قدم رکھ لیتے ہیں - دوسری قسم کے کردار وہ ہیں جن میں شروع سے آخر تک کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی - وہ جیسے شروع میں تھے ویسے ہی آخر تک رہتے ہیں - مثال کے طور پر " افیونی " ، " خواہ مخواہ " اور " پرائیویٹ سیکرٹری " کے کرداروں کو دیکھا جاسکتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ شوکت تھانوی نے اپنے بیشتر افسانوں میں دوسری قسم کے کردار زیادہ پیش کئے ہیں -

شوکت تھانوی نے کرداروں کی صورت و سیرت پیش کرنے میں حقیقت نگاری سے کام لیا ہے اس لئے وہ ہمیں ایسے مانوس اور جانے پہچانے معلوم ہوتے ہیں کہ جیسے ان اشخاص سے ہم شب و روز دوچار ہوتے رہتے ہیں - ان کرداروں میں وہ اگر کچھ خصوصیات ایسی بھی بیان کر دیتے ہیں کہ جن کی طرف ہماری توجہ اس سے بیشتر مبذول نہیں ہوئی تھی تو پڑھتے وقت ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے ان لوگوں کو تنقیدی نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا - اپنے افسانے " جلوس " میں شوکت تھانوی نے ایک زمیندار کی شکل و صورت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے : " زمیندار صاحب شکل و صورت میں بھوندو استاد کے خاندان سے نظر آتے تھے - وہی پختہ رنگ وہی بے قابو توند - کچھ دانت ٹوٹے ہوئے ، باقی میں سے کچھ اصلی اور کچھ نقلی - کھچڑی بال جو اس سیاہ رنگ پر اور بھی نمایاں تھے - پان اِس بدتمیزی سے کھا رہے تھے کہ دہانِ مبارک سے ہر خوش مذاق کو اگالدان کا تخیّل مل سکتا تھا - سر کے بالوں میں پڑا ہوا

چنبیلی کا تیل کنپٹیوں سے بہہ رہا تھا ۔" [1]

شوکت تھانوی نے مکالمہ کے ذریعے سے واقعات کو بیان کرنے اور کردار نگاری کے جوہر دکھانے میں بڑی مدد لی ہے ۔ وہ خیالی واقعات کے مکالموں کو بھی حقیقی اور فطری بنانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ انہوں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ وہ جس مخصوص طبقہ کے فرد کی گفتگو قلمبند کر رہے ہیں وہ اس طبقہ سے ہم آہنگ ہے یا نہیں بقول ڈاکٹر فردوس فاطمہ نصیر " افسانہ نگار کو اپنی تخلیق میں کسی خاص طبقہ یا کسی خاص مقام کے حالات کو مکالموں کے ذریعے ظاہر کرنا مقصود ہو تو اس کا فرض ہے کہ اس طبقہ یا اس مقام کی ایک ایک چیز کا غور سے مطالعہ کرے اور قابلِ انتخاب باتوں کو دقّتِ نظر سے دیکھے اور پھر ان کو نہایت اختصار کے ساتھ ایمائی بیان کے ذریعہ مکالموں میں ظاہر کرے چونکہ کرداروں کے جذبات کی بلندی و پستی ، ان کے اضطرابات و انتشارات اور ان کی دماغی کیفیتوں کا اندازہ ہمیں ان کی آپس کی گفتگو سے ہوتا ہے ۔" [2]

" نمک مرچ " میں شوکت تھانوی نے دو ایسے کردار پیش کئے ہیں جنہوں نے کبھی یورپ کا منہ نہیں دیکھا لیکن عملی زندگی وہ اس طرح بسر کر رہے ہیں جیسے تمام عمر یورپ میں گذاری ہو ۔ یہ دونوں کردار مرزا صاحب کی معرفت جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ان کے دلچسپ مکالمہ سے قاری پر ان کی اصلیت واضح ہو جاتی ہے ۔ شوکت تھانوی لکھتے ہیں :

---

[1] شوکت تھانوی : " جلوس " ماخوذ از وغیرہ وغیرہ ، صفحہ = 26 ، ادارۂ فروغ اردو ، لاہور

[2] ڈاکٹر فردوس فاطمہ نصیر : " مختصر افسانہ کا فنی تجزیہ " صفحہ = 195 ، مطبوعہ اسرار کریمی پریس الہ آباد ، طبع اوّل ، 1975ء ۔

" مرزا صاحب نے کہا " مولوی صاحب ! ہمارے اسلم میاں یوں تو خیر بچپن ہی سے انگریزی اٹھان اٹھائے گئے ہیں مگر ولایت نے تو ان کو بالکل ہی انگریز بنادیا ہے "

مولوی صاحب نے خوشی سے سگار کا پورا کش لے کر کھانستے ہوئے کہا ۔ " اچھا اچھا تو گویا آپ بھی میری طرح ولائت رہ چکے ہیں ۔ کہاں رہتے تھے آپ وہاں "؟ اسلم نے گڑبڑا کر کہا " جی میں ۔ وہاں زیادہ تر وکٹوریہ ٹرمینس میں رہا ہوں " ۔ مولوی صاحب نے کہا ۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے بڑی خوبصورت جگہ ہے میں بھی شروع شروع میں وہیں رہا پھر ۔ پھر ۔ بھلا سا نام تھا اس کا ڈربی ریس ہاں ٹھیک تو ہے ڈربی ریس میں رہنے لگا ۔" [1]

" احمق اداکار " میں شوکت تھانوی نے ایک ایسے عاشق کی تصویر پیش کی ہے جو بلند بانگ دعوے کرتا ہے لیکن جب آزمائش کا وقت قریب آیا تو بغلیں جھانکنے لگا ۔ وہ لکھتے ہیں ۔

سلمیٰ نے ایک طعن آمیز تبسّم کے ساتھ کہا " کیا آپ دل چیر کر نہیں دکھا سکتے ، کیوں ؟ آخر اس میں کونسی مجبوری ہے ، اگر آپ واقعی مجھ سے محبّت کرتے ہیں تو محبّت کی صداقت کا یہ ثبوت پیش کرنے میں تأمل کیوں ہے ؟"

اکبر ۔ " یعنی تم میرا دل میرے سینے سے باہر دیکھنا چاہتی ہو ، اچھا تو میں اپنی صداقت کا یہ ثبوت پیش کرنے کو تیار ہوں "

سلمیٰ نے فوراً اٹھ کر ایک چمکدار خنجر اٹھایا اور اکبر کو دیتے ہوئے کہا لیجئیے ۔ مگر دیکھئیے محبّت کا نام نہ ڈبوئیے گا ۔"

---

[1] شوکت تھانوی : " نمک مرچ " صفحہ - 46 ، ادارۂ فروغ اردو ، لاہور ۔

اکبر نے تھرتھراتے ہاتھوں میں خنجر لے کر لرزتے ہوئے کہا " کیا واقعی سچ مچ دل نکال لوں "

سلمیٰ نے لاپروائی سے کہا " اور نہیں تو کیا میں مذاق کر رہی ہوں "

اکبر نے سلمیٰ کی طرف غور سے دیکھا اور چہرہ پر تبسّم پیدا کر کے کہا "کیوں خوامخواہ مذاق کرتی ہو۔"

سلمیٰ نے ترکی بہ ترکی کہا "اچھا تو گویا آپ اتنی دیر سے محبّت کا مذاق اڑا رہے تھے ، اور اگر آپ کی محبّت سنجیدہ تھی تو میں بھی آپ سے سچ کہتی ہوں ، یا تو اپنا دل نکال کر دکھائیے ورنہ میں آخری مرتبہ کہتی ہوں کہ آئندہ سے لفظ محبّت میرے سامنے اپنی زبان سے نہ نکالئے گا ۔"[1]

" جلوس " شوکت تھانوی کے اچھے افسانوں میں شمار ہوتا ہے اس میں رعایتِ لفظی ، محاوروں کا استعمال اور الفاظ کے الُٹ پھیر سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

" خواہ مخواہ " کا شمار بھی شوکت تھانوی کے شاہکار افسانوں میں ہوتا ہے اسی مضمون کو انہوں نے تھوڑے سے فرق کے ساتھ ناول " سسرال " میں پیش کیا ہے ۔ اس افسانے میں جا بجا ایسی مثالیں ملتی ہیں جہاں انہوں نے الفاظ کے ذریعے سے مزاح پیدا کیا ہے وہ لکھتے ہیں :

" میں خود بھی فوراً نہانا چاہتا تھا اس لئے کہ لاہور سے کراچی آنے والے کو محسوس یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی جنازے میں شرکت کرنے گیا تھا جہاں گورکنوں نے بجائے مردے کے خود اسی کو دفن کر دیا تھا غلطی سے ، اور وہ

---

[1] شوکت تھانوی : " احمق اداکار " ماخوذ از دنیائے تبسّم " صفحہ 120 - 121 ، حالی پبلشنگ ہاوس ، کتاب گھر ، دہلی ۔

اپنی اس تدفین کے بعد بمشکل تمام قبر سے نکل کر بھاگنے میں کامیاب ہوا ہے۔ گرد میں اٹا ہوا تھا چنانچہ آئینہ کے سامنے پہنچ کر خود اپنے ہی عکس پر عبدالغفور صاحب ٹھیکیدار کا شبہ ہوا، جو ٹھیکیداری کی مناسبت سے اس حلیہ میں نظر آ سکتے ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ میں خود اپنے ہی عکس کو سلام کرتا۔ گرد آلود عینک کو جو اتارا تو اپنے عکس کی اسی حرکت سے فوراً سمجھ میں آ گیا کہ یہ کوئی اور نہیں "خاکسار" ہی ہے اور اگر سچ پوچھئیے تو آج ہی "خاکسار" کے معنی بھی سمجھ میں آئے کہ بغیر لاہور سے کراچی آئے ہوئے کوئی شخص صحیح معنوں میں "خاکسار" بن ہی نہیں سکتا۔" [1]

"سودیشی ریل" میں شوکت تھانوی نے مزاحیہ صورتِ واقعہ سے کام لیا ہے بقول ڈاکٹر وزیر آغا "مزاحیہ صورتِ واقعہ تین اہم عناصر کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ ناہمواریوں کی اچانک پیدائش، الجھن میں اسیر انسان کے مقابلے میں ناظر کا احساسِ برتری اور یہ تسکین وہ احساس کہ اس واقعے میں صدمے یا دکھ کا پہلو موجود نہیں۔" [2]

شوکت تھانوی نے صورتِ واقعہ کے حربے سے مزاح پیدا کرتے وقت ہمیشہ ان باتوں کا خیال رکھا ہے۔ ایک اقتباس سے اس بات کی وضاحت ہوسکتی ہے۔ "سودیشی ریل" میں ایک جگہ شوکت تھانوی لکھتے ہیں: "ہم اپنے ڈبہ میں بیٹھ گئے ہمارے بیٹھتے ہی دوتین درجن لٹھ بند گنوار ہمارے درجہ میں گھس آئے۔ ان سے ہم نے لاکھ کہا "ارے سیکنڈ کلاس ہے۔ اماں سیکنڈ کلاس

---

[1] ماخوذ از نقوش لاہور شوکت نمبر، صفحہ = 245 ۔

[2] ڈاکٹر وزیر آغا: "اردو ادب میں طنز و مزاح" صفحہ = 46، تیسرا ایڈیشن 1977ء، مکتبۂ عالیہ، لاہور۔

ہے ۔ بھائی سیکنڈ کلاس ہے " مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور یہی کہتے رہے " ہم ہو جانت ہے ڈیوڑھا ہے ۔ ہم ہو ٹکس لیا ہے ۔ خیر صاحب ہم چپ ہو رہے اور پلیٹ فارم پر اس غرض سے آئے کہ کسی سے کہدیں مگر گارڈ وارڈ نظر نہ آیا مجبوراً انہیں اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب سے عرض کردیا ۔ جس کا جواب انہوں نے اپنی سودیشی شان سے صرف یہ دیا " بیٹھئیے جناب سب ہندوستانی برابر ہیں ۔ سب بھائی ہیں ، سب بھارت ماتا کے سپوت ہیں ۔ کوئی کسی سے بڑا یا چھوٹا نہیں ہے ۔ اب سیکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس کے فرق کو بھول جائیے سب کو برابر کا سمجھئیے ، جائیے ، تشریف رکھئیے نہیں تو تھرڈ کلاس میں بھی جگہ نہ ملے گی " ہم یہ کھرا جواب سن کر منہ لٹکائے ہوئے اپنے درجہ میں آ گئے جہاں ہماری جگہ پر قبضہ ہو چکا تھا اور ہم کو یہ طے کرنا پڑا کہ کھڑے کھڑے سفر طے ہوگا یا غسل خانہ میں جگہ ملے گی مجبوراً اپنا ٹرنک گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئے اور گاڑی چھوٹنے کا انتظار کرنے لگے ۔"[1]

شوکت تھانوی افسانے کے آغاز سے ہی قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کی کوشش کرتے ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ افسانہ میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ بات کو طول دے کر بیان کیا جائے ۔ وہ اپنی بات صاف ، دلچسپ اور تھوڑے سے سے لفظوں میں قاری کے ذہن تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں ۔

شوکت تھانوی تمہید میں دلچسپی پیدا کرکے قارئین کے دلوں پر قابو پالینے کا فن خوب اچھی طرح سے جانتے ہیں مثال کے طور پر " خودکشی " ، " بیوی سلام کہتی ہیں " ، " بر دکھوّا " ، " اِختلاج " اور " احمق کردار "

---

[1] شوکت تھانوی : " سودیشی ریل " ماخوذ از موجِ تبسم ، صفحہ = 68 ، 69 ، صدیق بک ڈپو ۔ لکھنؤ

کی تمہید دیکھی جاسکتی ہیں ۔ شوکت تھانوی نے " خودکشی " کی ابتدا اس طرح کی ہے ۔

> " پیغامبر نے کہا ۔ " اس کی شادی ہوگئی "
> میں نے کہا ۔ " کیا بکتا ہے "
> اس نے پھر کہا " اس نے شادی کرلی "
> میں نے پھر کہا " تو جھوٹا ہے "
> اس نے اپنی صداقت کے ثبوت میں ایک شادی کا چھپا ہوا دعوت نامہ دکھایا اور میں اف کہہ کر گر پڑا " [1]

" بیوی سلام کہتی ہیں " کا آغاز شوکت تھانوی نے اس طرح کیا ہے ۔

> " بیوی سلام کہتی ہیں " ۔ یہ آٹھواں سلام تھا جو یہ لڑکی لے کر آئی تھی اور اب میری سمجھ میں بالکل نہ آتا تھا کہ میں کیا جواب دوں ۔ جب سے اس مکان میں آیا ہوں میری حیثیت عجیب وعلیکم السلام " کی سی ہو کر رہ گئی ہے کہ صبح ہے تو " بیوی سلام کہتی ہیں" اور شام ہے تو " بیوی سلام کہتی ہیں " معلوم ہوتا ہے یہ سلام مجھ سے یہ گھر بھی چھڑوائیں گے ۔" [2]

تمہید کے ساتھ ساتھ اختتام یا انجام بھی افسانہ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس پر بھی کہانی کا دار و مدار ہوتا ہے بقول ڈاکٹر فردوس فاطمہ نصیر " افسانہ کے انجام کو سلیقہ کے ساتھ پیش کرنا بڑا ہی

---

[1] شوکت تھانوی: " خودکشی " ماخوذ از موج تبسم ، صفحہ 256 ، صدیق بک ڈپو ، لکھنؤ ۔

[2] شوکت تھانوی : " بیوی سلام کہتی ہیں " ماخوذ از نمک مرچ ، صفحہ 52 ادارہ فروغ اردو ، لاہور ۔

مشکل کام ہے۔ اس مشکل سے صرف باشعور فنکار ہی عہدہ برآ ہوسکتے ہیں ۔ افسانہ کی اس آخری سیڑھی کو سلامتی کے ساتھ طے کرنا نہایت ہی نازک مرحلہ ہے انجام کو زیادہ سے زیادہ مختصر اور موثر ہونا لازمی ہے ۔" [1]

شوکت تھانوی افسانہ کے خاتمہ کو ایجاز و اختصار سے کام لے کر زیادہ دلچسپ اور زیادہ موثر بنانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ مثال کے طور پر " سناؤں تمہیں بات اک رات کی " کا اختتام اس طرح ہوا ہے ۔

" ہم نے ہانپتے ہوئے کہا ۔ " ڈاکو مجھ پر چڑھ بیٹھا تھا ۔"
بیگم نے کہا ۔ " نہیں ڈاکو نہیں ، میں آپ کے پاس آئی تھی ۔ ڈاکو تو باورچی خانہ میں جاکر برتن سمیٹ رہا تھا " ۔
پہرہ دار نے فوراً لالٹین اٹھا کر باورچی خانہ میں جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ڈاکو نے سوائے اس کے کوئی جرم نہیں کیا ہے کہ دودھ کی پتیلی گراکر دودھ پھینک دیا اور پھر اس کو چاٹ بھی گیا ۔
پہرہ دار نے کہا ۔ " واہ ، واہ ، واہ " ۔
بچے ہنس دئیے ۔
بیگم نے کہا " توبہ ہے اللہ " ۔
میں نے کہا ۔ " لاحول ولاقوۃ اب کے یہ حرامزادی بلی آئی تو گولی مار دونگا ۔"
اس کے بعد مرغ اذان دے رہا تھا اور ہم سو رہے تھے ۔" [2]

---

[1] ڈاکٹر فردوس فاطمہ نصیر : " مختصر افسانہ کا فنی تجزیہ " صفحہ = 203 ، طبع اول 1975ء مطبوعہ اسرار کریمی پریس ، الہ آباد ۔

[2] شوکت تھانوی : " سناؤں تمہیں بات اک رات کی " ماخوذ از سودیشی ریل اور دوسرے افسانے " صفحہ = 98 ۔ 99 ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور ۔

شوکت تھانوی کے دوسرے افسانوں میں بھی اس طرح کے دلچسپ اختتام جس سے افسانے کے تاثر میں اضافہ ہوتا ہے ، دیکھے جاسکتے ہیں ان میں خاص طور سے "افیونی کی جنّت" ، "عمدۃ الحکماء" ، "نمک مرچ" "جلوس" ، "احمق اداکار" ، "بیگم کی جنّت" ، "لحاف اندر لحاف" "سانچ کو آنچ" ، اور "دولت خانہ" قابل ذکر ہیں ۔

شوکت تھانوی کے افسانوں کو پڑھ کر یہ احساس نہیں ہوتا کہ افسانہ نگار نے یہ افسانہ زبردستی لکھا ہے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود افسانہ نے افسانہ نگار کو مجبور کرکے اپنے تئیں اس سے لکھوایا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں تاثر کی شدت انتہائی بلندی پر نظر آتی ہے قرۃ العین حیدر کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ " شوکت تھانوی بے حد ہر دلعزیز تھے اور آج سے نہیں " سودیشی ریل " کے زمانے سے اب تک ان کی ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوتا آرہا تھا ۔ یہ مقبولیت انہیں دونوں ملکوں میں حاصل تھی ۔ آزادی کے بعد سے ہندوستان میں ان کی تصانیف کا ہندی میں ترجمہ ہوتا رہا ہے اور وہ ہندی داں طبقے میں بھی بہت مقبول تھے ۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا ۔ ناول ، افسانے ، ڈرامے ، اخبار کے کالم ، ریڈیو فیچر ، وہ قلم برداشتہ لکھتے تھے ۔ ایک ایسے محکمے سے ان کا تعلق تھا جہاں ادیب کو اخبار نویس کی مانند متواتر لکھنا اور لکھتے رہنا پڑتا ہے ، لکھنا ایک عادتِ ثانیہ اور میکانکی عمل بن جاتا ہے — مگر اس زود نویسی کے باوجود شوکت صاحب کی زیادہ تر تحریریں جو وقتی موضوعات پر لکھی گئی تھیں ، اپنی شگفتگی اور برجستگی کی وجہ سے پڑھنے کے لائق ہوتی تھیں ۔ " [1]

---

[1] ماخوذ از نقوش لاہور " شوکت نمبر " صفحہ = 345 ۔

شوکت تھانوی کے افسانوں بالخصوص سودیشی ریل کے بارے میں شاھد احمد دھلوی کی رائے ھے کہ " شوکت تھانوی کا نام پہلی بار اسوقت سنا جب 35 سال ادھر کسی نے بتایا کہ " نیرنگِ خیال " کے سالنامہ میں ان کا ایک مضمون " سودیشی ریل " پڑھنے کے لائق چھپا ھے ۔ رسالہ منگا کر پڑھا ، واقعی طبیعت پھڑک گئی ۔ اب بھی جب کبھی وہ مضمون یاد آجاتاھے تو ھنسی آجاتی ھے ۔ جب اس مضمون کی شہوت عام ھوئی تو کسی حاسد نے پتہ چلایا کہ کسی انگریزی اخبار میں کوئی مضمون چھپا تھا ، یہ مضمون اس کا ترجمہ ھے ۔ ھمیں بھی اس کی شوہ لگ گئی ۔ اصل مضمون کا تراشہ حاصل کیا ۔ ترجمہ تو ترجمہ ان دونوں مضمونوں میں کوئی مناسبت ھی نہیں تھی ۔"[1]

نیرنگِ خیال کے مدیر حکیم یوسف حسن نے شوکت تھانوی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ھوئے ایک مضمون میں لکھا ھے ۔

" شوکت تھانوی ھر فن مولا تھے ۔ وہ جو کچھ چاھتے کر لیتے تھے ۔ وہ جو کچھ چاھتے تھے لکھ لیتے تھے ۔ یہ خوبی آج اردو کے کتنے ادیبوں میں ھوگی ؟ ---- جو جانِ محفل بھی ھو اور جانِ ادب بھی ۔"[2]

شوکت تھانوی کی پہلی برسی پریس کلب راولپنڈی میں منائی گئی ۔ جہاں آغا بابر نے " شوکت تھانیدار " کے موضوع پر ایک مضمون پڑھا جس میں وہ لکھتے ھیں : " وہ کبھی کسی ایک راہ کا پابند نہ رھا ۔ جس راستے پر چلا بڑھتا ھی چلا گیا ۔ میں کبھی کبھی اسے " شوکت تھانیدار " کہا کرتا تھا کیونکہ وہ ادب کی ھر صنف پر " تھانیداری " کرتا تھا اس تھانیداری کے لئے اسے محنت بھی

---

[1] ماخوذ از نقوش لاھور " شوکت نمبر " ، صفحہ = 358 ۔

[2] ایضاً ، صفحہ = 405 ۔

کرنی پڑتی تھی ، اسے بہت کچھ لکھنا ہوتا تھا ۔ اتنا لکھنے کے لئے اسے رات کو جاگنا پڑتا تھا ۔ صبح فلم والوں سے وعدے پورے ہوجاتے ۔ ریڈیو والوں کی آبرو رکھ لی جاتی ۔ رسالوں کا تنورِ شکم بھر دیا جاتا ، پھر اسے اِدھر اُدھر سے چیک آتے رہتے ۔ لباس اچھا پہنتا ۔ اچھا کھاتا ۔ اچھا رہتا ۔ اچھے روابط پیدا کرتا یہ سب کچھ اپنے آپ نہیں ہوجاتا ۔ اس کے لئے خود بھی کچھ کرنا پڑتا ہے ۔ تب کہیں جا کر روابط پیدا ہوتے ہیں ۔ شوکت کو راہ و رسم پیدا کرنے کا گر خوب آتا ہے ۔ جو ہمارے دانشوروں میں اب ناپید ہوتا جا رہا ہے ۔" ـه[1]

شوکت تھانوی نے ایک ایسے دور میں جب افسانہ نگاری کے عہد شباب کا آغاز تھا اپنے لئے مزاحیہ افسانے کا راستہ منتخب کیا اور پورے خلوص کے ساتھ اس راستہ پر چلنے کو اپنے فن کا منصب بنایا ۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ کی تاریخ میں ان کے نام کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ۔

ـه[1] آغا بابر : " شوکت تھانیدار " ماخوذ از " ماہ نو " کراچی اشاعت خاص ، اکتوبر 1964 ء ، صفحہ 43 ، 44 ۔

:———:———:

پانچواں باب

ناول نگاری

شوکت تھانوی بنیادی طور پر ایک مزاح نگار ہیں - ان کے کم و بیش سب ناول ان کے مخصوص مزاج اور مزاح کے حامل ہیں انہوں نے انیس سو چونتیس عیسوی میں پہلا ناول لکھا - ترتیبِ اشاعت کے اعتبار سے ان کا آخری ناول انیس سو انسٹھ عیسوی کا ہے ان کے پہلے اور آخری ناول کے درمیان پچیس برس کا فاصلہ ہے - انہوں نے پچیس سے زیادہ ناول لکھے ان کی ناول نگاری کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ اس دور کے اہم ادبی رجحانات کا جائیزہ لے کر یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ بیسویں صدی کی ناول نگاری میں کون کون سے نئے رجحانات داخل ہوئے ہیں - ربع اوّل کے رجحانات میں جو رجحان سب سے پہلے ہمارے سامنے آتا ہے وہ ماضی پرستی کا رجحان ہے - گو یہ رجحان انیسویں صدی ہی میں تاریخی ناول نگاری کی صورت میں شروع ہوچکا تھا لیکن بیسویں صدی کے ربع اوّل میں اس رجحان نے ایک علیحدہ شکل اختیار کرلی تھی - ماضی پرستی کے ساتھ ساتھ مشرقی روایات کے تحفظ کا رجحان بھی اس دور میں ایک علیحدہ رجحان کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ روایت کا رجحان بھی ناولوں میں نظر آتا ہے - روایت پر تنقید پر تنقید /کے علاوہ نئی اور پرانی تہذیب کے امتزاج پر بھی زور دیا جانے لگا اور یہ بھی ایک رجحان کی صورت میں نمایاں ہوا -

برِصغیر میں بے اطمینانی کی کیفیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا ایک طرف انگریز اور ان کا تمدن تھا تو دوسری طرف برِصغیر کے عوام اور ان کی تہذیب تھی - ایسے موقع پر ترک و اختیار کا مسئلہ اہم صورت اختیار کرلیتا ہے جان وین نے لکھا ہے کہ یورپ میں نازی ازم جب پھیل رہا تھا تو انگلستان کی ناول نگاری کا محرک یہی مسئلہ تھا کہ مختلف اور متضاد حالات میں کن چیزوں کو اختیار کرنا چاہئیے ، کن کو چھوڑ نا چاہئیے ، کونسی باتیں سماج کے لئے

مفید ہو سکتی ہیں اور کون سی مضر[1] یہی مسئلہ برصغیر میں اس وقت موجود تھا ۔ اس عہد کی ناول نگاری میں ہندوستان کی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے ۔ یہ تبدیلیاں دو تمدنوں اور تہذیبوں کے تضاد اور تصادم کی وجہ سے رونما ہوئی تھیں اس لئے اس عہد کی ناول نگاری میں متضاد اور متصادم قسم کے رجحانات ملتے ہیں کیونکہ نئے حالات کی وجہ سے نئی اور پرانی قدروں میں شدید کشمکش ہو رہی تھی ۔ اس دور کی ناول نگاری میں ہر ایک ناول نگار کے پاس قدروں کی یہ کشمکش اور تبدیلی دیکھی جاسکتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ربع ثانی کے ابتدائی دس سال کی ناول نگاری میں ہم کو ایک نئے ذہن اور ایک نئے شعور کا احساس ہونے لگتا ہے جو ترقی پسند تحریک کے شروع ہونے کے بعد کی ناول نگاری میں ایک شدید صورت اختیار کرلیتا ہے ۔ گویا ربع ثانی کے دس سال ترقی پسند تحریک کی ناول نگاری کا پیش خیمہ تھے ۔ اس دور میں روایات سے رشتہ توڑ کر نئے طریقوں کو اپنانے اور نئے تجربے کرنے کا رجحان ملتا ہے اب انسان کی نگاہیں ماضی کی بجائے مستقبل کی جانب رہنے لگی ہیں کیونکہ حال کی غیر یقینی کیفیت نے انسان کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیا ہے ۔

بیسویں صدی میں ہونے والی تبدیلیوں ، نئی ایجادوں ، نئے نظریوں اور نئے خیالات نے سوچنے کے انداز کو بدل دیا تھا اس لئے ناول کی ہیئت میں کافی تنوّع ہوا ۔ چونکہ اس عہد میں دروں بینی بڑھ گئی تھی اس لئے ناول کی ایسی ہیئت اختیار کی گئی جو زیادہ سے زیادہ اندرونی احساسات اور جذبات کی عکاسی کر سکے ۔ اس دور میں ہیئت کے تنوّع کے ساتھ ناول کی قسموں میں بھی تنوع نظر آتا ہے ۔ یہ تنوّع اس دور میں اس لئے نمایاں نظر آتا ہے

---

[1] John Wain : Essays on Literature and Ideas, P-42, 1963, London.

کہ مختلف ناول نگاروں نے اختصاص طور پر مختلف اقسام میں سے کسی ایک قسم کو اپنایا ۔ قاضی عبد الغفار نے عشق پیشہ عاشق و معشوق کو موضوع بنایا۔ عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی نے مزاحیہ ناول لکھے ۔ ظفر عمر نے جاسوسی ناول لکھے ۔ اس طرح ناول کی مختلف قسموں میں سے کسی ایک رنگ کو اپنانے کا رواج بھی اس دور میں عام ہونے لگا ۔ مزاحیہ ناول نگاری کے بارے میں ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں :

" یوں تو سجاد حسین ایڈیٹر " اودھ پنچ " نے سب سے پہلے مکمل مزاحیہ ناول " حاجی بغلول " لکھا لیکن مزاحیہ ناول نگاری ، کو بیسویں صدی میں ایک مستقل حیثیت اور صورت دینے میں عظیم بیگ چغتائی کا بڑا ہاتھ ہے ۔ بعد میں شوکت تھانوی نے بھی یہی راستہ اختیار کیا اور یوں اردو میں مزاحیہ ناول نگاری کا سلسلہ قائم رکھا ۔" [1]

مزاحیہ ناول نگاری کے بارے میں ڈاکٹر سید علی حیدر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں : " اسی دور میں بعض مزاحیہ ناول بھی لکھے گئے ۔ اپنے اسلوب کی جاذبیت کی بنا پر بے حد مقبول ہوئے ۔ ان ناولوں میں نہ صرف تفریحات کے پہلو پیش کئے گئے بلکہ ان میں سماجی حقائق کو طنزیہ پیرائے میں تجزیہ کرنے کی کوشش بھی نظر آتی ہے ۔ اسی طرح کے ناولوں کو قبولِ عام کا درجہ دلانے میں عظیم بیگ چغتائی کی جنت کا بھوت ، خانم ، چمکی اور شوکت تھانوی کی خدا نخواستہ ، معمّہ خاتون اور بڑبھس اہم ہیں ۔" [2]

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست : بیسویں صدی میں اردو ناول ، دسمبر 1973ء ، حیدر آباد ، آندھرا پردیش ، صفحہ = 262 ۔

[2] ڈاکٹر سید علی حیدر : اردو ناول سمت و رفتار ، طبع دوم 1979ء ، الہ آباد ، صفحہ = 212 ، 213 ۔

شوکت تھانوی بنیادی طور پر ایک مزاح نگار ہیں اسی لئے انہوں نے مزاحیہ ناول لکھے ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ وہ اپنے قاری کو اس کشمکشِ غم و الم اور امید و بیم کی دنیا سے نکال کر گھڑی دو گھڑی کے لئے ہنسا کر ان کو خوشی و مسرت کا سامان فراہم کریں ۔ چنانچہ وہ ناول مزاح کی خاطر اور پڑھنے والے کی تفریح کی غرض سے لکھتے ہیں اور اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے ایسے وسائل سے کام لیتے ہیں جن پر انہیں پوری قدرت حاصل ہے ۔

شوکت تھانوی نے اپنے ناولوں میں مزاح کے تمام حربوں سے کام لیا ہے ۔ کچھ ناولوں میں اسلوبِ بیان کے حوالے سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور کچھ میں موضوع کے اعتبار سے ۔ "خدانخواستہ" کا موضوع ہے کہ اگر عورتیں پردہ کے باہر آجائیں اور مردوں کو پردہ نشین ہونا پڑے ، تو کیا ہو ؟ ۔ اس میں موازنہ اور صورتِ واقعہ کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ ناول میں ایک جگہ تھانیدارنی کے لڑکے کی شادی کا ذکر ہوتا ہے تو نازکستان کے رواج کے مطابق لڑکی کے بجائے لڑکے کو مانجھے بٹھایا جاتا ہے ۔

جب رخصت کا وقت آیا تو تھانیداری صاحبہ اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتی ہیں ۔: " ظفو میاں اب میری عزت تمہارے ہاتھ ہے تم اب اپنے گھر جا رہے ہو مگر میں اسی وقت تک تم سے خوش ہوں جب تک کہ تم اپنی اہلیہ کے اطاعت گذار رہوگے ۔ آج سے ان کی خوشی تمہاری خوشی ہے اور ان ہی کو خوش رکھ کر تم اپنی دنیا اور عقبیٰ دونوں کو سنوار سکتے ہو ۔"[1]

---

[1] شوکت تھانوی : " خدا نخواستہ " صفحہ = 79 ۔

موازنہ اور صورتِ واقعہ کے علاوہ شوکت تھانوی نے الفاظ کی مدد سے جا بجا مختلف طریقوں سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہیں مکالموں کی شوخی اور بے تکلفی سے ، کہیں محاوروں کے بے ساختہ استعمال سے ، کہیں فقرے بازی سے ، کہیں روز مرہ سے اور کہیں الفاظ کے الٹ پھیر سے۔ شوکت تھانوی نے ایک ناول " انشاءاللہ " میں الفاظ کا مزاح پیدا کیا ہے ۔ مولوی رجب علی سے جوانی میں تو اکثر لغزشیں ہوتی رہیں لیکن پنشن کے بعد سارا وقت یاد خدا میں گذرتا ہے وہ لکھتے ہیں : " پولیس کی نوکری ۔ بے چین دل ، رشوت کی آمدنی آخر انسان کیونکر اپنے قابو میں رہ سکتا ہے مگر وہ تمام حالات پنشن لے چکے تھے ۔ جوانی پنشن لے چکی ، دل کی ہر امنگ پنشن لے چکی ۔ حد یہ ہے کہ تمام پریاں بھی پچپن سالے میں آچکی تھیں جو اس وقت غارت گرِ ایمان کہلاتی تھیں اور چونکہ اب کوئی ایمان کا غارت گر نہ رہا تھا لہذا ایمان ہی ایمان تھا ۔" [1]

شوکت تھانوی ذو معنی الفاظ استعمال کرکے مزاح پیدا کرنے پر قدرت رکھتے ہیں " کتیا " میں طلعت کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اختر صاحب ان کے رشتہ دار ہیں اور صرف ان سے ملنے کے لئے نینی تال آئے ہیں تو طلعت اور اختر کی بات چیت میں جو ذو معنی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ آپ بھی دیکھئیے :

> " طلعت نے پھر قصہ وہیں سے شروع کردیا ۔
>
> " ہاں یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ آپ میرے لئے کیوں آئے تھے "
> ہم نے کہا ۔ " تم کو دیکھنے ۔ دیکھ کر پسند کرنے اور پھر شادی کا پیغام بھجوانے " ۔

---

[1] شوکت تھانوی : انشاءاللہ ، صفحہ = 11 ۔

طلعت نے جھینپ کر گردن جھکاتے ہوئے کہا " اوں - اچھا تو اب میں جا رہی ہوں "

ہم نے گوبڑا کو کہا " یہ غلط ہے - چور سے اقبالِ جرم کرانے کے بعد عدالت کو چاہئیے کہ فیصلہ بھی سنا کر اٹھے -"

طلعت نے شوخی سے کہا " چور گرفتار کیا جائے "

ہم نے کہا " اور اسے حبسِ دوام کی سزا بھی دی جائے گی یا نہیں "

طلعت نے کہا " یہ فیصلہ ھائی کورٹ کرے گی میرا فیصلہ تو یہی ہے کہ چور گرفتار ہو کر جلد سے جلد غریب خانہ کی جیل میں آ جائے -" [1]

" بکواس" میں نجمہ اور جمال کی نوک جھونک بھی کافی دلچسپ ہے یہ وہ موقع ہے جب شوق صاحب کی بے وقوفی کے بارے میں تذکرہ ہو رہا ہے - جمال نے نہایت عبرت انگیز صورت بنا کر کہا - " حالی نے سچ کہا ہے ع

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا

نجمہ نے ہنس کر کہا - " مجھ کو اس مصرعہ پر ہمیشہ ہنسی آتی ہے کتنا عجیب و غریب تصوّر ہے کہ عشق بیٹھا ہوا ہے دستر خوان پر اور اکثر قومیں بھنی ہوئی اس کے سامنے رکھی ہیں اور وہ کھا رہا ہے سب کو "

عرفان نے کہا " خیر قوموں کی تو نہیں مگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ع

اے عشق تو نے اکثر لوگوں کو کھا کے چھوڑا

میبل نے بڑا ترس کھاتے ہوئے کہا "POOR FELLOW"

جمال نے کہا " آج کل ہر طرف تو یہ کوشش ہو رہی ہے کہ GROW MORE FOOD اور عرفان صاحب نے اپنا یہ مشن شروع کر رکھا کہ "GROW MORE FOOLS"

---

[1] شوکت تھانوی : "کتیا" صفحہ = 104 ، 105 -

نجمه نے کہا " غله غذائے معده ہے تو بیوقوف غذائے روح۔ جمال نے ترکی به ترکی کہا " خصوصاً جب کوئی روحانی بے وقوف بنا ہو۔ "[1]

شوکت تھانوی نے اپنے ناولوں میں مزاح پیدا کرنے کے لئے کہیں کہیں لطیفه گوئی سے بھی کام لیا ہے۔ " کتیا " میں ایک جگه طلعت اپنے دوستوں کو بتاتی ہے که ان کے گھر ایک مہمان آئے ہوئے ہیں جو انتہائی فرسوده لطیفے سنانے کے ماہر ہیں۔ انہوں نے آج ایک تو غالب کے آموں والا لطیفه سنایا اور ایک یه : " راسته میں ایک مسافر سے اس کے بچے نے کہا که میری شادی کر دیجئے۔ مسافر نے کہا۔ اچھا بتاؤ کس کے ساتھ کرو گے۔ اس بچے نے کہا " دادی اماں کے ساتھ " مسافر نے اس کو ڈانٹا که " تو میری ماں سے شادی کرے گا " اس پر میں نے کہا که حضرت آپ نے بھی تو اس کی ماں سے شادی کی ہے۔ "[2]

" کارٹون " میں کہکشاں کی شکل و صورت کی تصویر کشی کرتے ہوئے جو تشبیہات استعمال کی ہیں ان میں عبارت میں ایک حسن پیدا ہوگیا ہے۔ یه تشبیہات آپ بھی ملاحظه کیجئے " وه تو خود واقعی اس قدر حسین تھی، که اگر اس نے ہماری اس قدر توہین نه کی ہوتی تو شاید ہم خود اس کو دیکھنے کے بعد مارے شرم کے اگر ڈوب نه مرتے تو کم سے کم امیدواری سے دست بردار ضرور ہوجاتے۔ سنجیده بن کر بیٹھے تو معلوم ہو که وینس کا مجسمه رکھا ہوا ہے۔ بات کرے تو معلوم ہو که جمنا کی لہروں میں تاج محل کا عکس متحرک ہے مسکرائے تو محسوس ہو که چاندنی پھیل رہی ہے اور کھلکھلا کر ہنس پڑے تو ایسا منظر نگاہوں کے سامنے آجائے گویا جنت میں قوسِ قزاح کا رقص ہو رہا ہے۔ نہاکر

---

[1] شوکت تھانوی : " بکواس " ، صفحه = 90 ، 91 ۔

[2] شوکت تھانوی : " کتیا " صفحه = 64 ۔

روکھے سنہرے بال لہراتی ہوئی چلی آئی تھی - خدا کا کوئی منکر اگر ہم کو مل جاتا تو ہم کہکشاں کو دکھا کر اس سے پوچھتے کہ اگر خدا نہیں ہے تو اس کی قدرت کا یہ نمونہ کہاں سے آیا -" [1]

اس عبارت میں تشبیہات کے استعمال کے ساتھ ساتھ کہکشاں کے حسن کی ایک بھرپور تصویر ہمارے سامنے آتی ہے شوکت تھانوی نے بیشتر ناولوں میں اس قسم کی تصویر کشی کی ہے جس سے کسی شخصیت کے تمام نقوش نمایاں ہوجاتے ہیں " چار سو بیس " میں بھی اسی قسم کے حسن کی تصویر کشی کی ہے - مِس براؤن جو ایک انگریز خاتون ہیں لیکن ہندوستان میں پرورش پانے کی وجہ سے اردو اہلِ زبان کی طرح سے بولتی ہیں ، کے حسن کی تصویر کشی اس طرح کرتے ہیں " مس براؤن کو آخر ان آرائشوں کی ضرورت ہی کیا تھی - پاوڈر کا رنگ اس کے قدرتی رنگ کے سامنے پھیکا نظر آتا تھا - غازے میں وہ سرخی کہاں جو اس کے رخسار پر گلاب کھلایا کرتی تھی اور آفتاب طلوع کرتی رہتی تھی - لپ اسٹک زیادہ سے زیادہ لبوں کو سرخ ہی تو کر سکتی ہے مگر یہاں تو بغیر اس کے ہی شراب برسانے والے لب ہائے رنگین قدرت نے اس کو مہیا کر رکھے تھے بحیثیتِ مجموعی اس کا چہرہ کسی جوہری کی دکان نظر آتا تھا جہاں لعل و جواہر کو نہایت سلیقے کے ساتھ سجا کر گاہکوں کے لئے وہ بے پناہ کشش پیدا کر دی جاتی ہے جس کو جوہری سمجھتا ہے اور بادشاہ جانتا ہے -" [2]

" غزالہ " میں بھی الفاظ کی مدد سے جا بجا مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے - لفظی رعائتیں پیدا کر کے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ایک مثال:

---

[1] شوکت تھانوی : " کارٹون " صفحہ = 34 -

[2] شوکت تھانوی : " چار سو بیس " صفحہ 165 ، 166 -

" آنند نے جلدی سے کہا " وہی مطلب ہے میرا مجھے ان کی وفا شعاری پر شبہ تھوڑی تھا ۔ قاصد ہی لنگڑا ہو تو وہ بے چاری کیا کریں میں پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ ڈاک کا عذرِ لنگ پیش کرینگے ۔"[1]

یہاں شوکت تھانوی نے لنگڑا قاصد اور ڈاک کا عذرِ لنگ میں لفظی رعایت پیدا کی ہے ۔

ہر بڑے ادیب کی طرح شوکت تھانوی نے بھی زندگی کو ایک خاص زاویۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے ۔ انہوں نے زندگی کے ظاہر و باطن پر غور و فکر کیا ہے اور اس کی حقیقت جاننے کی کوشش کی ہے ۔ ناول کا موضوع چونکہ انسانی زندگی کے تہ در تہ حقائق اور اس کے گونا گوں مسائل ہوتے ہیں اس لئے شوکت تھانوی نے اپنے ناولوں میں ان مسائل کو کہیں مربوط اور واضح اور کہیں غیر مربوط اور مبہم صورت میں پیش کیا ہے ۔ شوکت تھانوی معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور اپنے معاشرے سے ہر اس رسم کو ختم کردینا چاہتے تھے جو فضول خرچی کو تقویت پہنچاتی ہو ۔ بہت سے گھرانوں میں سالگرہ کی رسم کو بہت تزک و احتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے ۔ شوکت تھانوی " مولانا " میں لکھتے ہیں :

> " بھلا سالگرہ بھی کوئی تقریب ہے ۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ زندگی کا ایک سال کم ہونے کی لوگ خوشی کیوں مناتے ہیں ۔"[2]

شوکت تھانوی چھوٹی عمر کی شادیوں کو معیوب سمجھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں شادی کا فیصلہ اس وقت کیا جائے جب بچے

---

[1] شوکت تھانوی : "غزالہ" صفحہ = 23 ، بار سوم ادارہ فروغ اردو ، لاہور ۔

[2] شوکت تھانوی : " مولانا " صفحہ = 82 ۔

باشعور ہوجائیں۔ " سپنے " میں مس قریشی کے عزیزوں نے بچپن میں ان کے چچا زاد بھائی سے منگنی کردی تھی لیکن جب یہ دونوں جوان ہوئے تو ان کی طبیعتوں میں بہت فرق تھا اس لئے مس ساجدہ قریشی اپنے منگیتر کے بارے میں فرماتی ہیں " میرے اعزاء میں سے چند ایسے ہیں جن کا مجھ سے مختلف حیثیتوں سے دل دکھ چکا ہے مثلاً ایک میرے چچا زاد بھائی ہیں جو بے چارے اپنے بچپن سے اس غلط فہمی کا شکار بنائے گئے تھے کہ گویا میری شادی ان کے ساتھ ہوجائے گی اور اس مبارک تجویز کی ریڑھ کی ہڈی یہی تصور تھا کہ خاندانی جائیداد خاندان سے باہر نہ جانے پائے مگر میں آپ سے کیا عرض کروں کہ یہ ذاتِ شریف کیا چیز واقع ہوئے ہیں۔ اس اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔"[1]

شوکت تھانوی نے اپنے بیشتر ناولوں میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ " خانم خاں " اور " مولانا " میں خاص طور سے اس مسئلہ کو موضوع بحث بنایا ہے۔ " مولانا " میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ : " نزہت کو ابھی اس گھر میں شادی کے قابل ہی نہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ لاکھ جوان سہی، اس کی عمر بھی یقیناً شادی کے قابل تھی مگر جج صاحب ان اگلے وقتوں کے لوگوں میں سے نہ تھے جو اس کے قائل ہوا کرتے تھے کہ جوان لڑکی گھر میں ہو تو ماں باپ کی نیند حرام ہوجاتی ہے۔"[2]

شوکت تھانوی نے خواتین کے میک اپ کو اپنے ناولوں میں موضوع بنایا ہے وہ خواتین کے لئے میک اپ کو ضروری سمجھتے ہیں بشرطیکہ یہ میک اپ سلیقہ سے کیا جائے لیکن ایسا میک اپ جو خواتین کو خوبصورت بنانے کے بجائے

---

[1] شوکت تھانوی : " سپنے " صفحہ = 167 ، استقلال پریس لاہور بار سوم -

[2] شوکت تھانوی : " مولانا " صفحہ = 27 ۔

بد صورت بنا دے اور جس سے عورت کا پھوہڑ پن ظاہر ہو ، اسے شوکت تھانوی پسند نہیں کرتے " چار سو بیس " میں وہ لکھتے ہیں " ہم نے تو آرائشوں کے ایسے نمونے بھی دیکھے ہیں که رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں ۔ سیاہ رنگ ہے ۔ موٹا نقشه ہے اور اس پر تھپا ہوا پوڈر اس طرح گویا آٹے کی بوری میں منه ڈال کر ابھی نکالا ہے یا باورچی خانه کی دیوار پر چونے کا ہلکا سا کوٹ ہوا ہے یا سیاہ گاجر کے حلوے پر پھپھوندی لگ گئی ہے پھر لبوں پر وہ پھیلی پھیلی سی گھوی سرخی جیسے بلاٹنگ پیپر پر لال روشنائی الٹ جائے ۔ سمجھ میں نہیں آتا که اس کو آرائشِ جمال کہا جائے یا حسنِ دم نکال ۔"[1]

شوکت تھانوی کا خیال ہے که بوڑھی عورتوں کو میک اپ زیب نہیں دیتا اس لئے انہیں میک اپ نہیں کرنا چاہئیے لیکن بعض عورتیں بڑھاپے میں زیادہ میک اپ کرتی ہیں یہی حال بیگم صاحبه کا ہے وہ لکھتے ہیں که :

" ذرا بیگم صاحبه کی یه عمر ملاحظه فرمائیے اور ٹھسّے دیکھئیے که بال تو سفید ہونا شروع ہوگئے مگر کیا مجال که جوڑے میں گجرا نه لپٹا جائے اور ایک گجرے پر کیا منحصر ہے جس کو کہتے ہیں بال بال موتی پروتا وہ سلسله جاری تھا ۔ اب تک تو مشہور ہیں سوله سنگھار مگر بیگم صاحبه بیس پچیس سنگھار تو کرتی ہی ہوں گی ۔ علیٰ الحساب ۔ خوشبودار بٹنا وہ ملواتی تھیں ۔ جسم کے کپڑے درکنار ان کی تو چادر اور رضائی تک میں عطر لگایا جاتا تھا اور جب تک رات کے وقت تکیوں کے آس پاس بیلے " چنبیلی کے تازہ پھول نه رکھ دئیے جائیں ان کو نیند نه آتی تھی ۔"[2]

---

[1] شوکت تھانوی : " چار سو بیس " صفحه = 164 ، 165 ،
طبع چہارم ، 1961ء ، کتب خانه علم و ادب ، کراچی ۔

[2] شوکت تھانوی : بیگم صاحبه ، صفحه = 5 ، دوسرا ایڈیشن جنوری 1963ء
شمع بک ڈپو ، لاہور ۔

شوکت تھانوی عورت کی عظمت کے دل سے قائل تھے اس لئے ان کے تمام ناولوں میں بالعموم اور " سپنے " چار سو بیس " سوتیاہ چاہ ، جوڑ توڑ میں بالخصوص اس بات کا پر زور اظہار کیا گیا ہے :

> " عورت بنی ہے معبود بننے کے لئے اور مرد کا منصب ہے صرف پرستاری اور عبودیت ۔ مرد کی سجاوٹ ہے اس کی بہادری ۔ اس کی قوت ، اس کی صداقت اور اس کی ان تمام طاقتوں کے بعد کمزور عورت کے سامنے پسپا ہونے کی صلاحیت "۔ [1]

شوکت تھانوی شادی کے لئے والدین کی رائے کے ساتھ ساتھ فریقین کی رضا مندی کو بھی اہمیت دیتے ہیں ۔ " بیگم صاحبہ " میں مسعود اپنی منہ بولی بہن نازلی کی شادی ریاض سے کرنا چاہتا ہے جس کے لئے وہ اپنی بہن کی رائے خود طلب کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ شوکت تھانوی صاحب مسعود کی زبانی فرماتے ہیں " وہ چاہتا تھا کہ نازلی سے براہِ راست اسی معاملے میں گفتگو کرلے اور اس کو واقعی سمجھا دے کہ اس نسبت کی منظوری یا نامنظوری سے اس کی خوشی یا ناراضگی کا کوئی تعلق نہیں ہے اور اگر وہ اپنے دل میں ریاض کے لئے کوئی کشش نہیں پاتی یا ریاض کی طرف اپنے کو کھینچتا ہوا محسوس نہیں کرتی تو اس کو پورا حق ہے کہ وہ اور کسی سے نہ سہی خود اس سے صاف صاف کہہ دے تاکہ یہ قصہ یہیں پر ختم کر دیا جائے ۔" [2]

شوکت تھانوی شادی کے لئے ہم خیالی کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں ۔ " پگلی " میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ : " مجھ کو دراصل تلاش تھی

---

[1] شوکت تھانوی : سپنے ، صفحہ = 63 ، استقلال پریس ، لاہور بار سوم اپریل 1952 ء ۔

[2] شوکت تھانوی : "بیگم صاحبہ" صفحہ = 95 ، دوسرا ایڈیشن ، جنوری 1963ء ، شمع بک ڈپو لاہور ۔

اپنے ایک ہم خیال کی اور چونکہ میرے خیالات نہایت الجھے ہوئے اور دنیا سے کچھ نرالے ہیں لہٰذا مجھ کو اپنی اس جستجو میں کبھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ نہ جانے کتنی خاک چھاننے کے بعد یہ حضرت مجھ کو ایسے ملے جن کو میں نے ہو بہو ویسا ہی پایا اور اتنا ہی ہمخیال دیکھا جتنا اور جیسا میں چاہتی تھی اور وہ بھی میرے طرف اس لئے متوجہ ہوگئے کہ دنیا کی ہر کشش سے زیادہ ہم خیالی کی کشش ہوتی ہے۔" [1]

شوکت تھانوی کے بیشتر ناولوں میں جہیز کو ایک لعنت قرار دیا گیا ہے۔ وہ دھوم دھام سے شادی کرنے اور جہیز کو ایک معاشرتی برائی تصور کرتے ہیں "بیگم صاحبہ" میں ریاض کی والدہ مسعود سے کہتی ہیں کہ "میں ریاض کی شادی جہیز کے ساتھ نہیں کر رہی ہوں، مجھ کو تو نازلی اور صرف نازلی چاہئیے۔" [2]

اسی ناول میں ایک اور جگہ بیگم صاحبہ فرماتی ہیں کہ "مسعود میاں کی شرط بھی تو یہی تھی کہ ان کی شادی کو تماشہ نہ بنایا جائے جس میں دولہا سرکس کا جانور معلوم ہوتا ہے۔ نہ وہ محفل چاہتے ہیں نہ دھوم دھام، نہ دعوت نہ کچھ اور۔" [3]

قیامِ پاکستان نے اردو ادب کو ایک نیا موضوع عطا کیا۔ بھارت سے پاکستان آنے والے مسلمان بھیانک حالات سے دوچار تھے۔ راستے میں خون کی

---

[1] شوکت تھانوی: "پگلی" صفحہ 62، 63، لارک پبلشرز، جہانگیر روڈ، کراچی۔

[2] شوکت تھانوی: "بیگم صاحبہ" صفحہ = 114، دوسرا ایڈیشن، شمع بک ڈپو، لاہور۔

[3] ایضاً، صفحہ = 181۔

ہولی کھیلی جا رہی تھی اور انسان انسان کے خون کا پیاسا معلوم ہوتا تھا ۔ اس ہلچل میں متعدد نظریات و روایات کے مفاہیم بدلنے لگے ۔ ادب نے بھی ان بدلے ہوئے حالات کی ترجمانی کی ۔ ناول نگاروں نے ان انسانیت سوز واقعات کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ۔ شوکت تھانوی نے 1947ء کے بعد لکھے گئے بہت سے ناولوں میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے ۔ ناول " چار سو بیس " اگست انیس سو سنتالیس عیسوی کے واقعات سے شروع ہوتا ہے اس ناول کا پہلا فقرہ وہ ہی یہ ہے کہ " اگست انیس سو سنتالیس عیسوی میں عجیب عجیب انقلاب آئے کسی کو ہندوستان ملا ۔ کسی کو پاکستان ملا اور ہمارے گھر میں بھائی جان کو بھابی جان ملیں ۔ "[1] اسی ناول میں شوکت تھانوی نے بھارت سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کا حال بیان کیا ہے کہ راستے میں سکھ انہیں طرح طرح کی تکلیفیں دے رہے تھے ۔ بہت سے مسلمان اس حادثہ میں شہید ہوئے اور کچھ زخمی حالت میں لاہور پہنچتے تھے وہ لکھتے ہیں : " جالندھر سے لاہور تک عجیب خوفناک سفر تھا بعض مقامات پر تو باقاعدہ جنگ کی نوبت آگئی اور گولیوں کی بوچھاڑ سے ہم کو گذرنا پڑا ۔ ہمارے قافلے کے ساتھ ان فوجی جوانوں کی بھی خاصی تعداد تھی جو اب پاکستان کے سپاہی تھے ۔ ان کے پاس ان کے اسلحہ تو تھے ہی مگر ان فوجی اسلحہ کے علاوہ ایک آدھ ریوالور اور تین چار رائفلیں ہم غیر فوجیوں کے پاس بھی تھیں ------ ہمارا قافلہ امرت سر سے نکلا ہی تھا اور ہماری ٹرکیں لاشوں سے پٹے ہوئے راستے سے گذر رہی تھیں کہ یکایک " ست سری اکال " کے نعروں سے فضا گونج اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے خون کے پیاسے بلوائیوں کے غیر منظم لشکر نے ہمارا راستہ روک کر ہم کو ہر طرف سے گھیر لیا ۔ دونوں طرف سے گولیوں کی دھواں دھار بارش ہوگئی اور مجھ کو صرف اس قدر یاد

---

[1] شوکت تھانوی : " چار سو بیس " صفحہ = 5 ، طبع چہارم ، کتب خانہ علم و ادب ، کراچی ۔

نوک پر مارتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ " سوتیاہ چاہ " سے ایک اقتباس دیکھیئے ۔

" ابھی سنو تو سہی آپ کی صفاتِ حمیدہ کہ آپ ایسی جورو چاہتے ہیں جو بالکل میم کی بچی ہو یعنی بے پردہ ، بال کٹی ہوئی ، پیانو بجانے کی ماہر ، گانا بھی عمدہ جانتی ہو ، انگریزی گانا جاننے والی کو ترجیح دی جائے گی ۔ موٹر چلانا بھی جانتی ہو ۔ مختصر یہ کہ ان کو سودیشی نہیں بلکہ ولایتی بیوی درکار ہے

نگار نے کہا " تو اس میں کون سی دقت ہے تو ان تمام باتوں کی تعلیم دو ہی مہینے میں حاصل کر سکتی ہے اور بال میں آج ہی کاٹ دوں " تارا نے اپنے حسین چہرے پر سینکڑوں شکنیں پیدا کرتے ہوئے کہا میں کیوں بال کٹواؤں ۔ میں ایسے انگریز کے بچے کو اپنی جوتی کی نوک پر مارتی ہوں ۔ ابّو جان نے تو اس موٹے خبطی کا خط دیکھتے ہی اس کو لکھ دیا کہ آپ نے غلطی کی ولایت سے میم نہیں لائے ۔ "[1]

شوکت تھانوی کا زمانہ اصلاحِ معاشرت و مذہب کا زمانہ تھا اور اس کے زیرِ اثر مسلمانوں میں ایک نئی روح اور بیداری پیدا ہو رہی تھی ۔ قومی اتحاد اور قومی تعمیر کا ایک نیا تصور پیدا ہو چکا تھا ۔ شوکت تھانوی نے اپنے عہد کے حالات کا بغور مشاہدہ کیا اور ان تحریکوں سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو ملک و قوم کی خدمت کے لئے تیار کیا ۔ انہوں نے اپنے عہد کی زندگی کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ۔ وہ بنیادی طور پر ایک صحافی تھے اور اخبارات کی دنیا سے ان کا گہرا تعلق تھا ۔ انہوں نے ستائیس ناول لکھے ۔ ان میں کچھ ناول ایسے ہیں جو پہلے افسانہ یا مضمون کے طور پر لکھے گئے پھر ان کی مقبولیت کے پیش نظر

---

[1] شوکت تھانوی : " سوتیاہ چاہ " صفحہ = 33 ، 34 ۔

ہے کہ ایک گولی میرے بازو پر لگی تھی جس کے بعد کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہوا۔"[1]

پاکستان کا قیام بہت سی قربانیوں کے بعد روبہ عمل آیا ۔ خاندان کے خاندان تباہ ہوگئے " سپنے " میں طلعت کا کردار ایسا ہے جسے اپنی عصمت کی قربانی دینا پڑی ۔ ظفر نے اس کے بارے میں یہ بتایا کہ " وہ میری منگیتر تھی ہم دونوں کی شادی ہونے ہی والی تھی کہ یہ طوفان امنڈ آیا اور اسی طوفان کی زد میں اس معصوم کی دوشیزگی بھی آگئی ۔"[2]

سر سیّد احمد خاں کی اصلاحی اور ادبی تحریک نے ہندوستان کے مسلم معاشرے کو بالعموم اور اردو شعر و ادب کو بالخصوص انیسویں صدی میں کافی متاثر کیا لیکن بیسویں صدی کے ربع اول میں اس تحریک کے ردِ عمل کے طور پر مغرب پرستی کی بجائے مشرق پرستی کی تحریک شروع ہوئی شوکت تھانوی نے بھی اس تحریک کے زیرِ اثر مغربی تہذیب و تمدن پر بھرپور طنز کیا ہے۔ اور مشرقی اقدار کی تعریف کی ہے : " چار سو بیس " میں شوکت تھانوی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ " عذرا نے برا مان کر کہا : " شمس صاحب یہ آپ غلط کہہ رہے ہیں سوائے مشرقی کے اور کچھ ہونا اپنی توہین سمجھتی ہوں ۔"[3] بہت عرصہ تک ہندوستان کی لڑکیاں ولایت پلٹ لڑکوں سے شادی کرنا باعث فخر سمجھتی تھیں لیکن " سوتیاہ چاہ " کی تارا اب ولایت پلٹ لوگوں کو اپنی جوتی کی

---

[1] شوکت تھانوی : " چار سو بیس " صفحہ = 7،6 ، طبع چہارم ، کتب خانہ علم و ادب ، کراچی ۔

[2] شوکت تھانوی : " سپنے " صفحہ = 195 ، بار سوم ، استقلال پریس ، لاہور ۔

[3] شوکت تھانوی : " چار سو بیس " صفحہ = 62 ، طبع چہارم ، کتب خانہ علم و ادب ، کراچی ۔

انہیں ناول بنا دیا گیا مثال کے طور پر " سودیشی ریل " افسانہ کے طور پر لکھا گیا اور انیس سو اٹھائیس عیسوی کے " نیرنگِ خیال " کے سالنامہ میں شائع ہوا - انیس سو چھتیس عیسوی میں اسی افسانہ کو ناولٹ کی شکل میں پیش کر دیا گیا - اسی طرح ایک اور ناول " خدانخواستہ " ان کے ایک ریڈیو ڈرامہ کی ترقی یافتہ صورت ہے - یہ ڈراما 1939ء میں " کایا پلٹ " کے نام سے لکھا گیا جس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اگر عورتیں پردہ کے باہر آجائیں اور پردہ نشین ہوجائیں تو کیا ہو ؟ اس ڈرامہ کو شوکت تھانوی نے یہ کہہ کر کہ ریڈیو ڈراموں کو لوگ ایک کان سے سنتے ہیں اور دوسرے سے نکال دیتے ہیں اور اس کا مضمون اس قدر وسیع ہے کہ اسے ناول کی شکل دینا پڑی - اس ناول کے شروع میں شوکت تھانوی نے " ایک بات " کے تحت لکھا کہ " زیرِ نظر کتاب دراصل میرے اس تخیّل کی کتابی صورت ہے جس نے انیس سو انتالیس عیسوی میں ریڈیو کے ذریعے فضاؤں میں پرواز کی تھی - اور اب محمد طفیل صاحب مالک ادارہ فروغِ اردو نے اس پرند کو کتابی قفس میں محبوس کیا ہے -" [1]

ناول نگاری میں شوکت تھانوی کو ایک رات میں ناول مکمل کرنے کا امتیاز بھی حاصل ہے - انیس سو پینتالیس عیسوی میں شوکت تھانوی نے محمد طفیل مالک ادارہ فروغِ اردو کو لاہور سے لکھنؤ بلایا کہ آم بھی کھا جاؤ اور ناول بھی لے جاؤ - مرزا غالب کی طرح آم محمد طفیل صاحب کی بھی کمزوری ہیں چنانچہ فوراً لکھنؤ کے لئے روانہ ہوگئے ناول کا مطالبہ کیا تو شوکت تھانوی کہنے لگے کہ جب لاہور واپس جاؤگے تو لے لینا - ایک دن بقول محمد طفیل صاحب " شام کا کھانا کھانے کے بعد انہوں نے قلم ، دوات اور کاغذ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے

---

[1] شوکت تھانوی : " خدانخواستہ " صفحہ = 5 ، بارِ سوم ، ادارہ فروغِ اردو ، لاہور -

کہا کہ لکھو ناول ، تو میں سمجھا کہ مذاق کر رہے ہیں ۔ جب میں متواتر چار پانچ گھنٹے لکھتا رہا اور یہ زبانی لکھواتے رہے تو مجھے یقین ہوا کہ یہ مذاق نہیں تھا ۔ آخر میں کہاں تک لکھتا ۔ لکھتے لکھتے ہاتھ دکھنے لگے تو میں نے ان سے اپنی معذوری کا اظہار کیا ۔ اس وقت رات کے بارہ بجے ہوں گے لیکن یہ ایک صاحب کو جا کر پکڑ لائے اور ان سے لکھنے کو کہا ۔ وہ بے چارے بھی آنکھیں ملتے ملتے لکھتے رہے جب وہ بھی تین چار گھنٹے کے بعد آؤٹ ہوگئے تو پھر میری باری آئی چنانچہ اس طرح رات بھر شوکت صاحب لکھواتے رہے اور ہم لکھتے رہے اور جب صبح ان کا نوکر چائے لے کر آیا تو ڈھائی سو صفحے کا ناول ختم تھا ۔ اس ناول کا نام " بیوی " ہے ۔" ـہ[1]

ایک رات کی مدت میں لکھے جانے والے ناول کا تذکرہ عشرت رحمانی صاحب نے بھی کیا ہے وہ لکھتے ہیں : " کہ ان کے ایک مقبول ترین ناول " بیوی " کی تصنیفی مدت صرف ایک رات ہے ۔۔۔۔۔۔ لکھنے والے تھک گئے مگر شوکت کی روانی اور واقعات کے جوڑ توڑ میں کہیں تذبذب پیدا نہ ہونے پایا ۔" ـہ[2]

شوکت تھانوی نے اپنے ناولوں میں زندگی کے واقعات و تجربات ایسے دلچسپ انداز میں بیان کئے ہیں کہ قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ شوکت تھانوی میں یہ قوت خدا داد تھی کہ وہ قصے کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنا سکتے تھے ۔ ظاہر ہے کہ جس قصے میں دلچسپی جتنا زیادہ ہوگی ، قاری کے لئے وہ اتنا ہی پرکشش ہوگا ۔

ـہ[1] محمد طفیل : " صاحب " ماہنامہ "کتاب" لکھنؤ ، شوکت تھانوی نمبر ، جولائی 1963 ء ، صفحہ = 11 ۔

ـہ[2] عشرت رحمانی : نقوش شوکت نمبر ، صفحہ = 522 ۔

ناول کے پلاٹ کی تشکیل و تعمیر کے لئے تکنیکی ہنرمندی کی ضرورت ہے ایک اچھے ناول نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ ناول کے پلاٹ کے مختلف اجزاء کو خوبصورتی کے ساتھ ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرے ۔ شوکت تھانوی کے تمام ناولوں میں ربط اور تسلسل نظر آتا ہے ۔ اس لئے ان کے ناولوں کو مربوط پلاٹ کے ناول کہا جاسکتا ہے ۔ ان کے پلاٹ کے بالعموم پانچ مراحل ہوتے ہیں پہلے حصّے میں ناول کے کرداروں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے اور ناول کے واقعات کی پیشکش کے لئے وہ ابتدائی فضا تیار کرتے ہیں ۔ دوسرے حصے میں واقعات میں پیچیدگی پیدا ہونے لگتی ہے تیسرے حصے میں یہ پیچیدگیاں عروج پر پہنچ جاتی ہیں چوتھے حصے میں واقعات اور کرداروں کی الجھنیں کم ہونے لگتی ہیں ۔ پلاٹ کا پانچواں حصّہ اختتامی ہوتا ہے اس حصے میں کرداروں کی عملی سرگرمیاں مکمل ہوجاتی ہیں اور تمام واقعے فطری انجام پر پہنچتے ہیں ۔ ان تمام مرحلوں میں گہرا ارتباط اور مضبوط جوڑ ہوتا ہے اس لئے سلسلۂ واقعات کہیں ٹوٹنے نہیں پاتا ۔

شوکت تھانوی کے بیشتر ناولوں میں سیدھے سادے پلاٹ کی کہانیاں[1] پیش کی گئی ہیں لیکن کہیں کہیں ضمنی واقعات کی وضاحت اور مناظر کے تفصیلی بیان کی وجہ سے پلاٹ کے واقعات کی تاثراتی فضا میں گہرا تعلق برقرار نہیں رہا ہے اور پڑھنے والا ایسے مرحلوں پر یا تو ضمنی واقعوں میں الجھ گیا یا مناظر کی خوبصورتی میں کھو کر مرکزی واقعہ سے دور چلا گیا ہے پھر بھی اس کی وجہ سے واقعات کی عضویاتی تنظیم میں کوئی رخنہ پڑتا نظر نہیں آتا ۔ واقعے ایک دوسرے سے مربوط ہیں البتہ مناظر کی دلکشی ان کے فطری بہاؤ کی تاثیر کو کہیں کہیں دھیمی کردیتی ہے ۔ اس قسم کے پلاٹ " کارٹون " " بہروپیا " اور " بقراط " میں دیکھے جا سکتے ہیں ۔

شوکت تھانوی کے کچھ ناولوں میں پلاٹ کی یکسانیت پائی جاتی ہے - " نیلو فو " اور " غزاله " کے مطالعه کے بعد یه کہا جا سکتا ہے که ان دونوں ناولوں کے پلاٹ میں کافی حد تک یکسانیت ہے - " غزاله " میں نسیم نے نواب فلک رفعت کی بیٹی غزاله کو آگ سے بچایا - اس احسان کا بدله چکانے کے لئے نواب صاحب نسیم کو اپنے گھر لے آئے - " نیلو فو " میں شہاب نے " نیلوفو " کو ڈاکوؤں سے جو اسے اغوا کر کے لے جا رہے تھے ، بچایا اور شہاب صاحب کو ڈاکٹر لطیفی اپنے گھر لے آئے - دوسری بات یه که " غزاله " میں نواب فلک رفعت کے بھیتیجے سلیمان قدر صرف جائیداد حاصل کرنے کے لئے غزاله سے شادی کرنا چاہتے ہیں اسی طرح " نیلو فو " میں ڈاکٹر لطیفی کے بھتیجے افضل صاحب بھی " نیلو فو " سے شادی صرف جائیداد حاصل کرنے کے لئے کرنا چاہتے ہیں - اسی مسئله پر " غزاله " میں سلیمان قدر سے اور " نیلوفو " میں افضل سے مقدمه بازی ہوئی - تیسری بات یه که " غزاله " میں منیر ڈی - ایس - پی اور وسیم ڈی - ایس - پی نسیم کے دوست ہیں جبکه " نیلوفو " میں ارجمند ڈی - ایس - پی اور فاروقی ڈی - ایس - پی شہاب کے دوست ہیں اور ان اکے مقدمات میں مددگار ثابت ہوتے ہیں - چوتھی بات یه که " غزاله " میں سب لوگ غار میں قید ہوتے ہیں تو وہاں ان کے ساتھ مہمانوں کا سا سلوک ہوتا ہے - اسی طرح " نیلوفو " میں نیلوفو کو اغوا کر کے جب چٹاگانگ بھیج دیا جاتا ہے تو رشید صاحب اس کے ساتھ بہنوں کا سا سلوک کرتے ہیں - پانچویں بات یه ہے که دونوں کا انجام ایک ہی طرح کا ہے - " غزاله " میں غار دریافت ہوجاتی ہے اور " نیلوفو " میں دفینه مل جاتا ہے اس خوشی کے موقع پر ہیرو کی ہیروئین سے اور ہیرو کے دوستوں کی ہیروئین کی سہلیوں سے شادی ہوجاتی ہے -

شوکت تھانوی نے بعض ناولوں کے پلاٹ کی تشکیل میں نہایت دانشمندانه فنی شعور کا مظاہرہ کیا ہے - اس قسم کے ناولوں میں " خانم خاں " اور

"پگلی" کو خاص طور سے پیش کیا جاسکتا ہے ۔ ان ناولوں میں شروع سے اخیر تک شگفتہ اندازِ تحریر کو برقرار رکھ کر پلاٹ میں تنوّع اور وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ جس کی وجہ سے یہ ناول زندگی کے وسیع تجربات کا احاطہ کرتے ہیں ۔ اختتام پر شوکت تھانوی نے ان ناولوں کے تمام واقعات کو فنکارانہ احتیاط اور تخلیقی ذہانت کے ساتھ سمیٹا ہے ۔ مجموعی طور پر ان ناولوں کے پلاٹ میں کوئی خامی نظر نہیں آتی ۔

ناول کا قصہ چھوٹے بڑے واقعات پر مشتمل ہوتا ہے ۔ یہ واقعات انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تجربات سے اخذ کئے جاتے ہیں ۔ شوکت تھانوی اپنے گرد و پیش کے حالات کا مشاہدہ کرکے اپنے ناولوں کے لئے موضوع کی مناسبت سے چند خاص واقعات کا انتخاب کرتے ہیں اور انہیں ان کی ضروری جزئیات کے ساتھ ایک فطری ترتیب دے کر قاری کے سامنے پیش کردیتے ہیں ۔ واقعہ نگاری میں ابتداء، نقطہ عروج اور انجام بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں ۔ اس لئے شوکت تھانوی بھی ان تینوں مرحلوں کا خاص خیال رکھتے ہیں ۔ وہ ابتدائی مرحلہ میں واقعات اور کرداروں کا تعارف کرواتے ہیں اور آئندہ واقعات کے لئے فضا بندی کرتے ہیں ۔ دوسرے مرحلہ میں واقعات بتدریج آگے بڑھتے ہیں اور الجھنوں میں اضافہ ہونے لگتا ہے جیسے جیسے پیچیدگیاں بڑھتی ہیں تجسّس کی لہر تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے اور یہیں ان کے ناول کا نقطۂ عروج ہوتا ہے ۔ تیسرے مرحلہ میں واقعات اپنے فطری انجام پر پہنچ جاتے ہیں ۔ شوکت تھانوی کے ناول "بُڑبَھس" اور "خدا نخواستہ" واقعہ نگاری کے اعتبار سے شاہکار قرار دئیے جا سکتے ہیں ۔ "بڑبھس" میں مصنّف نے ایک ایسے بڑے میاں کے شب و روز بیان کئے ہیں ۔ جو بوڑھے ہونے کے باوجود ذہنی طور پر جوان ہیں

بلکہ نوجوان ہیں ان کے تمام مشاغل نوجوانوں کے سے ہیں - یہ بڑے میاں میر صاحب کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں - ان کے گھر میں رنگین مزاج لوگوں کا آنا جانا ہے اور ان کا گھر طوائفوں کی آماجگاہ بن چکا ہے - میر صاحب ایک تیرہ چودہ برس کی لڑکی پر عاشق ہوکر اس سے شادی رچانے کی فکر میں ہیں لیکن لڑکی کے والد شیخ عنایت اللہ اس کے باوجود کہ میر صاحب سے عقیدت رکھتے تھے ، ان سے اپنی لڑکی کی شادی کرنے کو تیار نہیں ــــ اس ناول میں شوکت تھانوی نے مزاحیہ انداز اختیار کرکے واقعات کو پہلے عروج تک پہنچانے اور پھر آہستہ آہستہ انہیں سلجھانے میں اتنی مہارت کا ثبوت دیا ہے کہ اس کا انجام بھی فطری بنا دیا ہے ــــ انجامِ کار شیخ عنایت اللہ کی بیٹی کی شادی میر صاحب سے ہونے کے بجائے ان کے بیٹے ارشاد احمد رضوی سے ہوجاتی ہے اور میر صاحب اپنی بوالہوسی پر نادم ہوتے ہیں -

ناول " خدا نخواستہ " میں ایک ایسی مملکت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جس میں عورتوں کی حکومت ہے اور مردوں کو پردہ میں بٹھایا جاتا ہے گھر کی صفائی ستھرائی اور روٹی ہنڈیا کے کام بھی ان کے فرائض میں شامل ہیں - اس خیال کو اتنی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے کہ ابتداء ، عروج اور انجام کے مرحلوں سے گذرتے ہوئے ان کی فنکارانہ چابک دستی کا اظہار ہوتا ہے -

ناول نگار اپنے قصے میں واقعات کا جو تانا بانا بنتا ہے اور ان واقعات سے ماحول کو پیش کرتا ہے ، اس کے کردار بھی اسی ماحول کے پروردہ اور نمائندہ ہونے چاہئیں - ہماری معاشرتی زندگی مختلف طبقاتی پیمانوں میں منقسم ہے - رہن سہن ، بول چال اور مذہب و مسلک میں بھی تنوّعات ہیں اور اقتصادی اعتبار سے بھی تضادات موجود ہیں - ناول نگار جس طبقے کو اپنا

موضوع بناتا ہے کردار کو اسی طبقے کا ترجمان ہونا چاہئیے - شوکت تھانوی نے اپنے بیشتر ناولوں کے موضوعات متوسط طبقے سے حاصل کئے ہیں اس لئے ان کے کردار بھی متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں - " سپنے " کے کردار شکیل ، سعید ، اور اکرام " سسرال " کے کردار ملک محمود احمد ، شعیب ، " بھابی " کے ریاض صاحب ، " چار سو بیس " کے مسعود صاحب وغیرہ یہ سب متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں -

شوکت تھانوی کی کردار نگاری کے سلسلہ میں ایک اہم بات یہ ہے کہ کردار اور قصہ ایک دوسرے سے اتنے مربوط ہوتے ہیں کہ انہیں کوشش کے باوجود ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا - وہ ناول کے کرداروں کو واقعات کے نشیب و فراز میں ایک فطری تسلسل کے ساتھ سامنے لاتے ہیں تاکہ پڑھنے والوں پر کرداروں اور واقعات کے ربط و ضبط کا سحر کارانہ اثر تا دیر برقرار رہے - اس قسم کا ربط و ضبط ان کے ناولوں " پگلی " ، " خانم خاں " ، بیگم صاحبہ " ، " داماد " ، " کتیا " ، " جوڑ توڑ " اور " بھابی " میں اپنے عروج پر نظر آتا ہے - ان ناولوں کے کرداروں میں باہمی ربط بھی ہے اور انفرادیت بھی - ان کرداروں کے افکار و اعمال سے ان کی ذہنی اور جذباتی کیفیتوں کی بھی آئینہ داری ہوتی ہے -

شوکت تھانوی نے اپنے ناولوں میں کم از کم ایک مزاحیہ کردار کو ضرور شامل کیا ہے جو سنجیدہ ماحول میں تفریحی کیفیت پیدا کرتا ہے - وہ اپنے ہر عمل کو درست اور حق بجانب سمجھتا ہے - " بڑبھس " میں میر صاحب " بیگم صاحبہ " میں اجمل ، " سپنے " میں نظام اور " مولانا " میں شفقت کے کردار مزاح پیدا کرنے کے لئے پیش کئے گئے ہیں - یہ سب کردار اپنی بات کو

اٹل سمجھتے ہیں اور کسی سمجھوتے پر آمادہ نہیں ہوتے - دوسرے کرداروں سے یہ اس لئے ناراض رہتے ہیں کہ وہ سب ان کا ساتھ نہیں دیتے - شوکت تھانوی نے اپنے مزاحیہ کرداروں کو مضحک بنا کر پیش کیا ہے - یہ کردار عشق میں مبتلا ہو کر مضحکہ خیز حرکتیں کرتے ہیں اور ان سے دوسرے کردار لطف لیتے ہیں - شوکت تھانوی بنیادی طور پر مزاح نگار تھے اور اس قسم کے کرداروں کو پیش کرتے وقت وہ اپنی تمام صلاحیتوں سے کام لیتے ہیں اس لئے یہ شوکت تھانوی کے شاہکار کردار ہیں -

ناول کے تمام واقعات اور کرداروں کی پیشکش کا وسیلہ "زبان و بیان" ہے - زبان دراصل وہ بنیادی قوت ہے جس پر واقعہ نگاری ، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کا پورا دار و مدار ہوتا ہے - مکالمہ ناول کے فن کا ایک نہایت اہم عنصر ہے اور یہ مکالمے لفظوں اور جملوں سے ترتیب دئیے جاتے ہیں - کرداروں کی گفتگو بھی مکالموں کے ذریعہ ہی سامنے آتی ہے اور ان کے طرزِ احساس اور اندازِ فکر کی آئینہ داری بھی مکالموں ہی سے ہوتی ہے - ایک ناول میں تمام دوسرے اوصاف موجود ہوں ، صرف مکالمے مصنوعی اور بے جان ہوں تو اس ایک کمزوری کی وجہ سے ناول کا تمام فنّی حسن ماند پڑ جاتا ہے -

شوکت تھانوی نے لکھنؤ کے علم پرور ماحول پرورش پائی تھی - اس لئے زبان و بیان پر قدرت رکھتے تھے - وہ مصنوعی اور مغلق زبان لکھنے کی بجائے صاف ، سادہ اور عام فہم زبان لکھنے کے عادی ہیں - شوکت تھانوی خود شاعر تھے اس لئے ان کے ناولوں کے اکثر کردار برمحل مصرعے اور شعر پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں - بعض مواقع پر کردار نثر کی بجائے شاعری میں بات کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں - ناول "کتیا" میں ایک جگہ مختلف کرداروں سے مصرعوں میں باتیں

کرواتے ہیں - وہ لکھتے ہیں " احسن نے تماشا دیکھتے ہوئے کہا ، اختر دیکھ رہے ہو ع

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

زیدی نے کہا " جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا "

نجم نے کہا " جہاں پر آپ جو سن لیں وہی ہے داستاں میری " [1]

ناول " سپنے " میں کرداروں کی گفتگو مصرعوں کی بجائے اشعار میں ملاحظہ کیجئے " مس قریشی کے خانساماں نے ناشتہ لگا کر ہم لوگوں کو اطلاع دی اور ہم سب کھانے کے کمرے میں پہنچ گئے - مس قریشی نے بڑی سنجیدگی سے کہا - نوش فرمائیے جو کچھ بھی موجود ہے اور پڑھئیے یہ شعر کہ ؎

قسمت میں جو لکھا ہے ملتا ہے بہر صورت
دانہ نہ سہی خرمن ، خرمن نہ سہی دانہ

اکرام نے کہا " یہاں تو یہ شعر بر محل ہوجائے گا - پھر بھی یہاں تو اس قسم کا شعر پڑھنا چاہئیے کہ ؎

اگر دل میں خیالِ شکوۂ بیداد آتا ہے
تو اس کے ساتھ پیمانِ وفا بھی یاد آتا ہے " [2]

شوکت تھانوی کے ناولوں میں استعمال ہونے والے اشعار اور مصرعوں کو دیکھتے ہوئے اس بات کا انداز ہوتا ہے کہ انہیں موقع و محل کی مناسبت سے یا مزاح پیدا کرنے کے لئے اشعار بہ کثرت اور خوب سوجھتے تھے - کہیں کہیں انہوں نے اشعار لکھنے کے بجائے انہیں نثر میں ڈھال کر اپنے مقصد کی بات بیان کردی ہے - شوکت تھانوی اس فن میں ماہر تھے - پڑھنے والا ان کی ذہانت کی

---

[1] شوکت تھانوی : " کتیا " صفحہ = 37 ، بارِ اول ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور

[2] شوکت تھانوی : " سپنے " صفحہ = 99 ، بار سوم ، مطبوعہ استقلال پریس ، لاہور -

داد دیتا ہے ۔ ایک موقع پر وہ لکھتے ہیں " اب سوال یہ ہے کہ آپ جو تصنیف فرما رہے ہیں وہ انسانی شکل و صورت میں یا ع کاغذی ہے پیرہن اس پیکرِ تصویر کا شریف نے کہا " بولتے کیوں نہیں ۔ اب " نقش فریادی بن کر رہ گئے اس شوخی تقویر کے بعد " [1]

ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں " تم کوشش کر کے دن بھر ناہید سے نہ ملو ۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے لئے یہ بہت ہی مشکل کام ہے مگر صبر کرو اس لئے کہ کتابوں میں ذکر آیا ہے کہ عاشقی صبر طلب ہوتی ہے اور ہر چند کہ تمنا بیتاب ہو مگر پھر بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ع

دل کا کیا حال کروں خونِ جگر ہونے تک

لہذا تم بھی خونِ جگر ہونے تک دل کا کچھ بھی نہ کرو " [2]

شوکت تھانوی اپنی نثر میں شگفتگی پیدا کرنے کے لئے جا بجا اشعار اور مصرعوں کا استعمال کرتے ہیں ۔ وہ اشعار کا انتخاب ناول کے مزاج کے مطابق کرتے ہیں ۔ ایک ناول " چار سو بیس " میں مختلف مواقع پر استعمال ہونے والے اشعار کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ تمام اشعار کا موضوع تقریباً ایک ہی ہے ۔ مثلاً :

1 ۔ ان کی مرضی میری قسمت ہوگئی
بات اتنی سی قیامت ہو گئی [3]

---

[1] شوکت تھانوی : " چار سو بیس " صفحہ = 103 ، طبع چہارم ، کتب خانہ علم و ادب ، کراچی ۔

[2] ایضاً ، صفحہ 112 ۔

[3] ایضاً ، صفحہ = 18 ۔

2 -
اب محبت سے بھی اکتا نے لگے
کیوں اچاٹ اپنی طبیعت ہو گئی [1]

3 -
محبت میں پہلے پر ستاریاں تھیں
محبت ہے اب اور بیزاریاں ہیں [2]

4 -
ادھر سے بھی زیادہ ہے ادھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی ان سے آہ بھی نہ ہوئی [3]

5 -
بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا دیا
اس کی بلا سے بوم رہے یا ہما بسے [4]

شوکت تھانوی نے زبان و بیان کے حوالے سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ہے - بحیثیتِ مجموعی شوکت تھانوی کی مکالمہ نگاری کی خوبی و کامیابی کا راز یہ ہے کہ ان کے کرداروں کی باہمی گفتگو ، ہماری عام زندگی کی گفتگو سے ملتی جلتی ہے - ان کے مکالموں میں روانی ، چستی اور بے تکلفی / پائی جاتی ہے ان کے مکالمے ناول کے واقعات کو آگے بڑھاتے ہیں - اور یہ مکالمے ناول کے پس منظر اور پیش منظر سے پوری طرح وابستہ ہوتے ہیں۔

منظر نگاری بھی ناول کا اہم جزو ہے - کامیاب منظر نگاری سے ناول کے قصے میں جان پڑ جاتی ہے - علی عباس حسینی کے قول کے مطابق "اس کی وجہ سے زبان و مکان کی تعین ہوتی ہے ، اوقات اور موسموں کا بیان ، کمروں

---

[1] شوکت تھانوی : "چار سو بیس" صفحہ = 20 ، طبع چہارم
کتب خانہ علم و ادب ، کراچی -

[2] ایضاً صفحہ = 20 ، [3] ایضاً 117 ،

[4] ایضاً صفحہ = 176 -

اور مکانوں کے خاکے ، آبادیوں کے نقشے ، اسبابِ ضرورت و زینت کی تصویروں اور ناچ رنگ ، میلوں ٹھیلوں ، جلسوں جلوسوں کے موقعے اسی جزو سے متعلق ہیں ۔ ناول نگار کو چاہئیے کہ وہ ان امور کو اس سلیقہ اور اس انداز سے بیان کرے کہ پڑھنے والے کے سامنے بالکل تصویر کھینچ جائے ۔" [1]

شوکت تھانوی زبان و بیان پر قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ مشاہدے کی گہرائی اور اعلی تخیّل کے بھی مالک ہیں اس لئے ان کے ناولوں میں منظر نگاری کے عمدہ نمونے نظر آتے ہیں ۔ ناول " نیلوفر " میں شہاب دو کمروں کے مکان میں رہتا ہے ۔ رات کو گرمی کی وجہ سے چارپائی فٹ پاتھ پر نکالنا پڑتی تھی وہاں اس کی جو حالت ہوتی تھی اس کی تصویر شوکت تھانوی نے اس طرح کھینچی ہے ۔ " اس فٹ پاتھ پر جو ایک نہایت کشادہ سڑک کے کنارے تھا ۔ اس سڑک پر گذرنے والی کاروں کی آنکھوں میں گھس جانے والی روشنی اور دماغ کو پاش پاش کردینے والے موٹروں کے ہارن اسے فٹ پاتھ پر بھی رات گئے تک سونے نہ دیتے تھے البتہ وہ اپنے بستر پرکروٹیں بدل بدل کر دل کو سمجھایا کرتا تھا کہ آج نہ سہی کل سہی ، ان ہی حالات میں سوجانے کی عادت پڑجائے گی ۔ ایک آدھ دن تو اسے یہ محسوس ہوا کہ سڑک پر گذرنے والی ہر کار بس آئی اس کے سرپر اور روندا اس کو ، مگر دو چار دن کے بعد ہی اس نے کاروں کے گذرنے پر پیر سمیٹنا یا گڑبڑا کر اٹھنا چھوڑ دیا اور اب وہ اطمینان سے اسی سڑک کے کنارے لیٹا عجیب عجیب باتیں سوچا کرتا تھا ۔" [2]

شوکت تھانوی وسیع معلومات رکھتے تھے وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کی جزئیات کی تصویر کشی ایسے دلکش انداز میں کرتے ہیں کہ ان کی

---

[1] علی عباس حسینی : "ناول کی تاریخ و تنقید " صفحہ = 64 ، بار اول مطبوعہ انڈین بک ڈپو ، لکھنو ۔

[2] شوکت تھانوی: " نیلو فر " صفحہ = 5 ، 6 ، مطبوعہ نقوش پریس لاہور ۔

معلومات پر رشک آتا ہے ناول " بزبھس " میں میر صاحب ، شیخ عنایت اللہ کی صاحبزادی سے شادی کرنا چاہتے ہیں - پیغام کے ساتھ مٹھائی کس اہتمام کے ساتھ بھیجتے ہیں اس کی تصویر کشی شوکت نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح کی ہے " تازہ تازہ امرتیاں " گرم گرم خوشگوار اور معطر شیرہ میں نہائی ہوئی اس طرح رکھی ہوئی تھیں کہ ان کو دیکھ کر ہمارے منہ میں پانی بھر آیا اور ہمارے معدہ کو تو گویا ان حسین امرتیوں سے عشق ہوگیا - دوسری کشتی میں گلاب جامنیں اور رس گلے یعنی ہماری موغوب ترین مٹھائیاں اس طرح موجود تھیں کہ خوان پوش اٹھاتے ہی ----- ہمارے معدے کی روح خوش ہوگئی تیسرے خوان میں بنگالی مٹھائی " راش گلہ " اور " شام شم " تازہ تازہ گرم گرم اور بہت سے ------ چوتھے خوان میں کچھ ہار اور کچھ پھول تھے - پانچویں میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ عطر قسم کی چاندی بچھی ہوئی ہے برفی کی کیوڑے میں بسی ہوئی لوازتیں ورق نقرو کے اس قدر دیدہ زیب اور اس قدر شامہ نواز اور اس قدر/ معدہ نواز تھیں کہ ان کو دیکھ کر خواہ مخواہ بھوک کی شکایت اچھے بھلے انسان کو پیدا ہوجائے اسی طرح باقی کشتیوں میں سے کسی میں بالو شاہی تھی تو کسی میں ملائی کے لڈو اور بالائی کی گلوریاں مختصر یہ کہ میر صاحب نے ہمارے سامنے حلوائی ایسی دکان لگادی تھی کہ ہم خوشبوئیں سونگھتے سونگھتے گویا ڈکاریں لینے لگے ۔ " [1]

شوکت تھانوی کے ناولوں میں شادی بیاہ کی محفلیں ، لکھنوی نوابوں کے ٹھاٹھ بھاٹ ، محفلِ مشاعرہ ، انگریزی تعلیم کے زیرِ اثر آزاد خیالی خواتین کا میک اپ اور یونیورسٹی میں پڑھنے والے طلبہ و طالبات کے اندازِ فکر کی ہر جگہ بہت خوبصورتی سے منظر کشی کی ہے ۔

---

[1] شوکت تھانوی : " بزبھس " صفحہ = 42 ، 43 ، طبع اول ، احمد برادرز ، کراچی ۔

ناول کی اہمیت یا حیثیت کا تعین ناول نگار کے نظریۂ حیات سے بھی ہوتا ہے ۔ نظریۂ حیات کے ذریعہ ناول نگار زندگی بسر کرنے کا نظریہ اور طرزِ فکر پیش کرتا ہے ۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نظریہ حیات کی وضاحت کرتے ہیں :

" عام ناولوں میں کوئی فلسفہ نہیں ہوتا کیونکہ اس میں کردار بھی نہیں ہوتے ، مگر پھر بھی واقعات کے سلسلے وار بیان ہی سے کچھ نہ کچھ اخلاقی معنی ضرور نکلتے ہیں چاہے یہ معنی اچھے ہوں یا برے ۔ دیکھا گیا ہے کہ پست درجہ ناولوں کے پڑھنے سے جوان لڑکوں کے اخلاق خراب ہوجاتے ہیں اور وہ لوگ اس قسم کی باتیں کرنے لگتے ہیں جو انہوں نے ناولوں میں پڑھی تھیں ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر ناول کا کچھ نہ کچھ اثر ہمارے اخلاق پر ہونا ضروری ہے ۔" [1]

ہر ناول نگار اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بعض چیزوں کو پسند کرتا ہے اور بعض کو ناپسند ۔ اسی پسند اور ناپسند سے اس کے نظریۂ حیات کا انکشاف ہوتا ہے ۔ ناول میں نظریۂ حیات کا اظہار ایک خاص فنی سلیقے سے ہوتا ہے ۔ نظریۂ حیات کے اظہار میں بے جا جوش و خروش سے کام لینا غیر مستحسن ہے اس لئے کہ اس کی وجہ سے کبھی خطابت کا رنگ پیدا ہوجاتا ہے ۔ اور کبھی ناصحانہ انداز ابھر آتا ہے ۔ شوکت تھانوی کے ناولوں میں نظریۂ حیات کا اظہار بالکل فطری رنگ میں ہوتا ہے وہ قاری کو یہ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ ناول نگار کو فنّی تقاضوں سے زیادہ اپنا نقطۂ نظر عزیز ہے ۔ ان کے ناولوں میں زندگی کی تخلیق کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ نظریۂ حیات خود بخود نمایاں ہو جاتا ہے ۔ ناول " سپنے " میں شوکت تھانوی صوفیائے کرام اور فلسفیوں کی طرح زندگی کو خواب اور سپنے سے تعبیر کرکے زندگی کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر

---

[1] محمد احسن فاروقی و نورالحسن ہاشمی : ناول کیا ہے ، صفحہ = 39 ، 38 ، 1960ء لکھنو ۔

اس طرح واضح کرتے ہیں -

> " قائل ہونا پڑا کہ زندگی ایک مسلسل خواب ہے جس میں ہم بیداری کا سپن دیکھ رہے ہیں - یہ ہونا یہ جینا یہ شادی بیاہ ، یہ عشق و محبت - یہ تمام آلامِ روزگار اور یہ زندگی کی تمام ہما ہمی سب سپنے ہیں -" [1]

شوکت تھانوی چھوٹی عمر کی شادیوں کو معیوب سمجھتے ہیں - شادی کے معاملہ میں والدین کی رائے کے ساتھ ساتھ فریقین کی رضا مندی کو بھی اہمیت دیتے ہیں - شادی کے لئے ہم خیالی کی کشش کو ہر کشش سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں عورت کی عظمت کے دل سے قائل ہیں - فرسودہ روایات اور فرسودہ رسم و رواج کے بجائے جدید تعلیم یافتہ معاشرے کو پسند کرتے ہیں - ناول "نیلوفر" میں برجیس کا ارجمند کے ساتھ نکاح ہوگیا تو اس زمانے کے رواج کے مطابق برجیس نے ارجمند سے پردہ کرلیا تو اس موقع پر نیلوفر کے والد ڈاکٹر لطیفی صاحب فرماتے ہیں "کیوں برجیس بیٹی یہ کیا حرکت ؟ یعنی تم میری تربیت پر دنیا کو ہنسواؤ گی - تم کو خود اعتمادی کے علاوہ ارجمند کی شرافت پر بھی اعتماد کرکے باہر آنا چاہئیے - مجھے یہ ڈھکوسلے بہت برے معلوم ہوتے ہیں کہ اس شخص سے تم پردہ کرو جس کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے تمہارا محرم بنا دیا گیا ہے اور بے پردہ رہو ان کے سامنے جو دراصل نامحرم ہیں-" [2]

---

[1] شوکت تھانوی : " سپنے " صفحہ = 11 ، بارِ سوم ، مطبوعہ استقلال پریس ، لاہور -

[2] شوکت تھانوی: " نیلوفر " صفحہ = 305 ، بار سوم ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور -

شوکت تھانوی کے عہد میں اچھے اور برے سینکڑوں ناول لکھے گئے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسوقت برصغیر میں علوم و فنون اور تہذیب و معاشرت کے اعتبار سے ایک نیا دور شروع ہو رہا تھا اس عہد کے ناولوں میں سے زیادہ تعداد ایسے ناولوں کی تھی جن کو معیاری ناول نہیں کہا جا سکتا ۔ شوکت تھانوی کے عہد میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوتا ہے اس تحریک کے زیر اثر جو ناول نگار ہمارے سامنے آتے ہیں ان کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے ۔ ان میں سے اکثر ناول نگاروں نے واقعات کے بجائے کرداروں کو اہمیت دی ہے اور ان کی ذہنی ، جسمانی اور نفسیاتی الجھنوں کو ابھار کر پیش کیا ہے جس میں ناول نگار کے مزاج نے انفرادی رنگ بھر دئیے ہیں ۔ یہ انتشار پذیر دور تھا جب جنگِ آزادی اپنے شباب پر تھی اور عالمی جنگ کے بادل دنیا پر منڈلا رہے تھے جس کی عکاسی کرتے ہوئے ناول نگار کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا تھا کہ وہ کون سی راہ اختیار کرے اس لئے وہ فرار کی راہ اختیار کرتے کرتے رومانیت کی آغوش میں پناہ لے لیتے ہیں ۔

شوکت تھانوی اپنے عہد کے عوام کا مزاج جانتے تھے وہ ریڈیو ڈراموں اور اخبارات میں فکاہی کالموں کی وجہ سے عوام میں مقبولیت حاصل کرچکے تھے اس لئے انہوں نے جب ناول لکھنے کا فیصلہ کیا تو کسی مخصوص گروہ کے لئے ناول لکھنے کے بجائے عوام کے لئے ناول لکھنے شروع کئے لیکن انہوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ اپنے عوام کو زندگی کے ایسے گوشوں سے بھی روشناس کروایا جائے جو بالعموم عوام کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں ۔ اس طرح انہوں نے اپنے قاری کی ذہنی صلاحیتوں کو بلند کرنے کی کوشش بھی کی ہے ۔ شوکت تھانوی کی ناول نگاری کے بارے میں ڈاکٹر ہارون ایوب لکھتے ہیں : " انہوں نے اپنے ہر ناول میں ایک ہی قسم کے کردار ، واقعات اور ماحول کو تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ

مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے جس سے کوئی ندرت یا تنوّع پیدا ہونے کےبجائے بندھا ٹکا انداز سامنے آتا ہے جو قاری پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں کرتا ۔ اتنا ضرور ہوتا ہے کہ قاری شوکت تھانوی کے چند مزاحیہ جملوں پر صرف زیرِ لب مسکرا کر رہ جاتا ہے یا کبھی کبھی بے ساختہ قہقہہ لگا دیتا ہے جب کہ ادبی ناول نگار ہمیشہ کوئی نئی چیز یا کسی نئے پہلو کو کسی نہ کسی اچھوتی تکنیک سے اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری چونک اٹھتا ہے "۔ [1]

ڈاکٹر ہارون ایوب کی اس رائے میں جہاں تک پلاٹ اور کردار کی یکسانیت کی بات ہے تو اس سے اتفاق کیا جاسکتا ہے ۔ ان کا یہ کہنا کہ شوکت تھانوی کے یہاں تنوّع نہیں ہے پوری طرح قابل قبول نہیں ۔ شوکت تھانوی کے کچھ ناول بالکل نئے موضوعات پر لکھے گئے ہیں مثال کے طور پر " خدا نخواستہ " ، بڑبھس " ، "کتیا " اور " بکواس" یہ اس قسم کے موضوعات ہیں جو اس سے پہلے ناول کا موضوع نہیں بنے اس طرح شوکت تھانوی نے اردو ناول کو کچھ نئے موضوعات بھی عطا کئے ہیں جس کی وجہ سے ان کے موضوعات میں تنوّع پیدا ہوجاتا ہے ۔ دوسری بات یہ کہ شوکت تھانوی صرف ادبی ناول لکھ کر اپنے قارئین کا دائرہ محدود نہیں کرنا چاہتے تھے وہ ایک عوامی ادیب تھے اس لئے انہوں نے ناول کے عناصرِ ترکیبی کا خیال رکھتے ہوئے عوام کے ذہنی ذوق کی تسکین کے لئے عوامی موضوعات پر ناول لکھے ہیں ۔ ڈاکٹر ہارون ایوب نے ایک جگہ شوکت تھانوی کی مقبولیت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں مقبول ناول نگاروں کی صف میں شامل کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

---

[1] ڈاکٹر ہارون ایوب : " اردو ناول پریم چند کے بعد " صفحہ 341 ، جون ، 1978ء اردو پبلشرز نمبر 8 ، تلک مارگ ، لکھنؤ ۔

> " مقبول ناول نگاروں میں رشید اختر ندوی ، اے ۔آر ۔ خاتون ، عادل رشید ، ایم اسلم ، قیسی رامپوری ، رئیس احمد جعفری، نسیم حجازی ، خان محبوب طرزی ، شوکت تھانوی ، دت بھارتی ، اور عارف مارہروی وغیرہ بہت مشہور ہیں ۔ اور ان کے ناولوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست ہے ۔" [1]

شوکت تھانوی نے اپنے ناولوں میں کبھی کسی فرد کی شخصیت کو ابھار کر پیش کیا ہے اور کبھی پورے معاشرہ کی تصویر کشی کی ہے انہوں نے مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں فرد اور معاشرہ کے اصلاح کرنے کی کوشش بھی کی ہے ۔ مزاحیہ ناول نگاری میں عظیم بیگ چغتائی کے بعد شوکت تھانوی کو سب سے بڑا ناول نگار کہا جا سکتا ہے ۔

---

[1] ڈاکٹر ہارون ایوب : " اردو ناول پریم چند کے بعد " صفحہ 337 ، جون 1978ء ، اردو پبلشرز نمبر 8 تلک مارگ لکھنؤ ۔

: ———— : : ———— :

چھٹا باب

ڈراما نگاری

شوکت تھانوی کے ڈرامے یک بابی ڈراموں کی ذیل میں آتے ہیں ، یک بابی ڈرامے کے بارے میں پرسیول وائلڈ لکھتے ہیں :

" یک بابی ڈرامہ اپنے دلفریب حسنِ اتحاد اور حسنِ تنظیم کی بنا پر مرکزِ توجہ بنتا ہے جسے ایک محدود و مقررہ میعادِ وقت میں پیش کیا جاسکتا ہے اور جس میں یہ صلاحیت پنہاں ہوتی ہے کہ وہ اپنا مجموعی تاثر ناظرین کے قلب و نظر اور فہم و ادراک میں سرایت کردے ۔" [1]

پروفیسر فصیح احمد صدیقی ، نے یک بابی ڈرامے پر تحقیقی کام کیا ہے ۔ انہوں نے یک بابی ڈرامے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے ۔

" یک بابی ڈرامے میں وحدتِ تاثر ، امکاناتِ تصادم اور وحدتِ مکان کو خاص اہمیت دی جاتی ہے ۔ ان تینوں عناصر میں سے کسی ایک کا فقدان اسے یک بابی ڈرامے کی تعریف سے خارج کردیتا ہے ۔" [2]

یک بابی ڈرامے کی متعدد صورتیں ہیں لیکن ایک خوبی ان سب میں مشترک ہے اور وہ ہے ان کا " اسٹیج پر اندازِ پیش کش" بالفاظِ دیگر عملی پیش کش کی خاطر ان سب کو ایک جیسے ہی میکانکی وسائل کی ضرورت پڑتی ہے اور نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہو یک بابی ڈراما ایک واحد متاثر کن ڈرامائی موقع سے تعلق رکھتا ہے ۔ چنانچہ یہ تاثر آفرینی بھی ان تمام نوعیتوں میں ایک حسنِ مشترک سمجھی جا سکتی ہے ۔

---

[1] دی ون ایکٹ پلے ٹوڈے ۔ مرتبہ ولیم کوزلنکو
بحوالہ اردو کا یک بابی ڈراما سیریز (1) صفحہ = 104 ۔

[2] پروفیسر فصیح احمد صدیقی : اردو کا پہلا یکبابی ڈراما سیریز (1)
مطبوعہ رحیمی پریس بمبئی ، جولائی 1972 ء ، صفحہ = 106 ۔

شوکت تھانوی کے ڈراموں کا تعلق نشری یک بابی ڈرامے سے ہے ۔ ریڈیو کی ایجاد سے یک بابی ڈرامے کے لئے ایک وسیع و عریض میدان کھل گیا۔ اسٹیج کے یک بابی ڈرامے کی تکنیک ریڈیائی ڈرامے پر منطبق نہیں کی جاسکتی مقصد یقیناً دونوں کا ایک ہوتا ہے لیکن ریڈیو میں اس مقصد کے حصول کے وسائل مختلف ہوتے ہیں ۔ نشری ڈرامے کے کردار سامنے ہوتے ہوئے بھی نظر نہیں آتے ۔ ان کی آواز ضرور آتی ہے لیکن جنبشِ لب نظروں سے اوجھل رہتی ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ ڈرامے کا اسلوب ایسا ہو کہ سامع کی قوتِ متخیّلہ ان کرداروں کو جسمانی طور پر اس کے پہلو میں بٹھا دے اور جہاں یہ کیفیت پیدا ہوجائے وہیں حقیقی تاثر کے قیام و استحکام کا یقین کیا جاسکتا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ ریڈیو ڈرامے کے کردار حقیقتاً مکالمہ سے زندہ ہوتے ہیں ان کے افعال و اعمال سامنے نظر نہیں آتے لیکن مکالمہ ان کا ایک ہیولیٰ تیار کر دیتا ہے اگر یہ ہیولیٰ اس قدر متعین اور واضح ہے کہ سامع اس کی شناخت کر سکے تو سمجھ لینا چاہئیے کہ ڈراما نگار اپنا مقصد سامع تک پہنچانے میں کامیاب ہوگیا ہے ۔ نشری ڈراما نگار کا امتحان بس یہی ہے کہ اس نے ان لوگوں کو جو ڈراما دیکھنے کے عادی ہیں ڈراما سننے پر کیسے راغب کیا ۔ شوکت تھانوی نے اس زمانے میں ڈراما نگاری شروع کی جب ملک میں تھیٹریکل کمپنیاں اپنے عروج پر تھیں اور لوگ ان تھیٹروں میں بہت دلچسپی لیتے تھے ۔ انیس سو اڑتیس عیسوی میں لکھنؤ ریڈیو سٹیشن قائم ہوا تو شوکت تھانوی نے تھیٹر کے انداز میں ڈراموں کا ایک سلسلہ مون شائن تھیٹریکل کمپنی آف کاٹھ گودام شروع کیا ۔ لکھنؤ کے ماحول کی وجہ سے بہت سے مکالمے اس میں شاعرانہ ہوتے تھے ۔ شوکت تھانوی "مابدولت" میں لکھتے ہیں : " دسمبر انیس سو اڑتیس عیسوی میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن نے ہم سے ڈراموں کا ایک سلسلہ مون شائن تھیٹریکل کمپنی آف کاٹھ گودام

کے نام سے لکھوایا ۔ یہ ڈراموں کا سلسلہ گویا اسٹیج ڈراموں پر ایک طنز تھا کہ اسٹیج ڈراموں میں کس طرح قافیہ پیمائی ہوتی ہے مثلاً اس سلسلہ کا ایک مکالمہ یاد آرہا ہے :- " وزیر اعظم اس کو چھوڑ دو ۔ اس کا منہ دربار کی طرف موڑ دو ۔ میرے پہلے حکم کو میرے دوسرے حکم کے پتھر سے توڑ دو ۔"[1]

شوکت تھانوی کے یہ ڈرامے اتنے مشہور ہوئے کہ ریڈیو کے ارباب حل و عقد نے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں ریڈیو پر باقاعدہ ملازم رکھ لیا جائے " مابدولت " میں شوکت تھانوی نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے :

" ایک دن جگل کشور صاحب مہرا نے ہم سے کہا کہ تم ریڈیو میں آخر باقاعدہ طور پر کیوں نہیں آجاتے ۔ ہم کو ان پر پورا اعتماد تھا ۔ لہٰذا ہم نے صرف یہی جواب دیا کہ آخر آپ کو مجھ سے کچھ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے ۔ جہاں چاہے بھیج دیجئے اور جو چاہے کیجئے ۔ اس گفتگو کے چند ہی دن بعد ایک روز جگل صاحب غریب خانہ پر آئے اور ہم سے کہا چلو ریڈیو سٹیشن ، یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی ۔ روز ہی وہ اس طرح گرفتار کرلیا کرتے تھے اور ان کا موٹر اس کثرت سے ہمارے یہاں نظر آتا تھا کہ بچے تک اس موٹر کو ہمارا موٹر کہنے لگے تھے ۔ مگر آج جگل صاحب نے کہا یوں نہیں بلکہ باقاعدہ طور پر چلو ۔ ہم نے پوچھا خیریت ؟ جواب ملا کہ ریڈیو میں ملازمت کا حکم آگیا ہے اور تم آج ہی سے اپنے کام کا چارج لے سکتے ہو ۔ یوں ہر روز ریڈیو ہی میں وقت گذرتا تھا اور اب تو گویا پابندی تھی ۔ جو تفریح تھی وہ روزی بن گئی ۔ اخبار نویس کی زندگی کو یہیں سے

---

[1] شوکت تھانوی : مابدولت ، نقوش پریس لاہور ، بار چہارم ، ص: 231 ، 232 ۔

خیر باد کہا اور زندگی کے اس نئے دور کی ابتدا گا بجا کر شروع کردی ۔" [1]

امین سلونوی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں : " لکھنؤ میں جب آل انڈیا ریڈیو کی بنیاد پڑی تو شوکت تھانوی مرحوم مستقل طور پر آل انڈیا ریڈیو میں شامل ہوگئے ۔ اس زمانہ میں جو لوگ ریڈیو کے عملے اور اسٹاف میں تھے سبھی ادیب ، سبھی اعلیٰ اخلاق و کردار کے مالک لوگ تھے ۔ انہوں نے اس اسٹیشن سے مزاح اور طنز کو کافی ترقی دی ۔ کبھی کبھی میرے اور شوکت کے درمیان آل انڈیا ریڈیو سے وقتی مزاحی مکالمے بھی نشر ہوتے تھے اور ہم دونوں مختلف نوع کی تخلیقات برابر پیش کرتے رہتے تھے ۔" [2]

لکھنو ریڈیو سٹیشن کے ماحول کے بارے میں عشرت رحمانی اپنے ایک مضمون میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ : " لکھنؤ ، رنگ و بو کا شہر شعر و ادب کا گہوارہ ، آل انڈیا ریڈیو کا اسٹیشن وہاں قائم ہوا فن و ادب کے رسیا اس اسٹیشن کے کارکن مقرر ہوئے ۔ لکھنو ریڈیو اچھا خاصا اہل ادب کا مرکز بن گیا ۔ ملک حسیب احمد پروگرام ڈائریکٹر تھے اور غلام قادر فرید سیّد انصار ناصری ، میاں لطیف الرحمن ، فیروز نظامی ، کرشن چندر اور یہ خاکسار پروگراموں کے مختلف شعبہ جات کے ناظم یعنی پروگرام اسسٹنٹ تھے ۔ شوکت تھانوی مصنف اور صدا کار مقرر ہوئے ۔ ہمہ وقت محفلِ فکر و فن آراستہ رہتی ۔ نئی نئی تجویزیں ، نئے پروگرام ، رات دن سب کو فکر تھی تو یہی کہ کوئی ایسی جدت پیش کی جائے جو سامعین کی حیرت میں ڈال دے اور ان کی دلچسپیوں میں اضافہ ہو ۔ سرکاری فرائض کی ادائیگی کا تو ہر ایک کو احساس تھا ہی لیکن اس

---

[1] شوکت تھانوی : ما بدولت ، مطبوعہ نقوش پریس لاہور ، بارِ چہارم ، ص: 239 ، 240 ۔

[2] امین سلونوی : " آہ شوکت تھانوی " : نقوش " شوکت نمبر " لاہور ص: 386 ۔

سے زیادہ ہر ایک کو اپنے ذوق کے مطابق ایک ہی دھن تھی جس میں مگن نظر آتے تھے۔ ریڈیو اسٹیشن کیا تھا ایک خاندان تھا اور یہ سب اراکین ایک ہی خاندان کے افراد معلوم ہوتے تھے۔" [1]

اسی مضمون میں آگے چل کر عشرت رحمانی نے مون شائن تھیٹریکل کمپنی آف کاٹھ گودام کا تذکرہ اس انداز میں کیا ہے : " ایک قابلِ ذکر سلسلہ " مون شائن تھیٹریکل کمپنی آف کاٹھ گودام " کا تھا۔ اس پروگرام میں قدیم تھیٹر کی گونج " پیروڈی " کے انداز میں پیش کی جاتی تھی۔ جس کے مصنف شوکت تھے۔ ہر ہفتہ ایک ڈرامہ نشر ہوتا جس میں کچھ اس طرح سے اعلان ہوتا :- " معزز شائقین ! مون شائن کمپنی آف کاٹھ گودام آج شب آپ کی خدمت میں اپنا مشہور و معروف کھیل " لال کوا " عرف سفید کبوتر پیش کررہی ہے جس میں کمپنی کے نامی گرامی ایکٹر اور ایکٹریس اپنے ذرق برق لباس میں آپ کے سامنے آئیں گی اور اپنی اپنی حیرت انگیز اداکاری کے جوہر دکھائیں گی " اور اس کے بعد قدیم طرز کے حاضرین کی تالیوں ، سیٹیوں اور قہقہوں کی گونج اور پٹاخہ کی آواز کے بعد سہیلیوں کا کورس شروع ہوتا اور دقیانوسی قسم کے شاہی پلاٹ پر لکھا ہوا ڈراما مقفیٰ و مسجع مکالموں اور شعلہ بار نغموں کے ساتھ پیش کیا جاتا۔ یہ پروگرام لکھنو اسٹیشن کی خصوصیت خاصہ اور مدتوں ملک گیر شہرت و قبولیتِ عامہ کا ضامن بنا رہا جو شوکت کی تخلیقی ظرافت اور ذہانت کا ادنیٰ نمونہ تھا۔ [2]

---

[1] عشرت رحمانی : شوکت تھانوی (چند یادیں) نقوش " شوکت نمبر " ص: 516 ۔

[2] ایضاً ، ص: 517 ۔

مون شائن تھیٹریکل کمپنی آف کاٹھ گودام کے تحت پیش کئے جانے والے ڈراموں میں سے ایک ڈرامے جس کا نام " دمشق کی بیٹی عرف زہرِ شبنم " ہے کا اقتباس شوکت تھانوی نے اپنی کتاب " مابدولت " کے صفحہ 232 سے صفحہ 238 تک درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: " اس طنز میں قافیہ پیمائی کی زبردستیاں تو مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوجائیں گی مگر اداکاری کی بوالعجبیاں ظاہر نہیں ہوسکتیں۔ عورتوں کا پارٹ کس طرح مرد کرتے تھے اور پارٹ کرنے والوں کو پرامپٹر کس طرح یاد دلاتا تھا۔ ایکٹر اس کے باوجود کس طرح بھولتے تھے وغیرہ یہ خاکہ ان ریڈیو ڈراموں میں پیش کیا گیا تھا اور یہ سلسلہ اس قدر مقبول ہوا کہ اس پہلے سلسلے کے چھ ڈراموں کے بعد ہم کو دوسرا اور پھر تیسرا سلسلہ بھی لکھنا پڑا۔ ہمارا نام منشی جھومک لال ڈرامہ نگار تھا اور اس تمثیل کے نامی گرامی ایکٹروں میں ملک حسیب احمد، مسٹر غلام قادر، مسٹر ہنسراج لوتھرا اور میاں لطیف الرحمان یہ سب ہی شامل تھے۔ اس سلسلے میں خود اسٹیشن ڈائریکٹر یعنی جگل کشور صاحب مہرا ایسی گہری دلچسپی لے رہے تھے گویا آپ ہی " مالک کمپنی ہٰذا ہیں"[1]

شوکت تھانوی نے اپنی کتاب میں اس بات کا اظہار کیا کہ ان کا ریڈیو کے لئے لکھا جانے والا سب سے پہلا ڈراما " خدا حافظ " ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> " سب سے پہلا ڈرامہ لکھنؤ ریڈیو کے لئے ہم نے لکھا۔ اس کا نام " خدا حافظ " تھا۔ اس ڈرامہ میں خود ہی ہیرو کا پارٹ بھی کیا تھا اور اس کے بعد تو اس قدر ڈرامے لکھے کہ اتنی گنتی آتی ہوتی تو اس وقت ریاضی کے بہت بڑے ماہر ہوتے۔ "[2]

---

[1] شوکت تھانوی: مابدولت۔ ادارۂ فروغ " اردو " لاہور بار چہارم، ص: 238۔

[2] ایضاً، ص: 231۔

" خدا حافظ " شوکت تھانوی کی کتاب " سنی سنائی " میں شامل ہے یہ کتاب 1943ء میں منظر عام پر آئی ۔ اس اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے ریڈیو پر نشر ہونے والے ابتدائی ڈرامے اس کتاب میں شامل ہیں۔ منشی جی سیریز کے گیارہ ڈرامے 1939ء میں شائع ہوچکے تھے اس لئے ہم پہلے " منشی جی " کا تذکرہ کرتے ہیں ۔ " منشی جی " کے بارے میں خود شوکت تھانوی لکھتے ہیں : " منشی جی کا سلسلہ کب ، کیونکر اور کیوں شروع ہوا اس کی تاریخ بیان کرنے میں ایک مزاح نگار کے مؤرّخ ہوجانے کا شدید خطرہ ہے البتہ اتنا کہے بغیر تو رہا بھی نہیں جا سکتا کہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے پروگرام ڈائریکٹر ملک حسیب احمد صاحب کو عرصہ سے کسی ایسے کیریکٹر کی جستجو تھی جو ہمارے ممدوح " منشی جی " کی قسم کا ہو ۔ منشی جی ملے تو کہاں ؟ خیر یہ بات راز کی ہے ۔ منشی جی سے عہد ہے کہ ان کی دریافت پر روشنی نہ ڈالی جائے گی مگر یہ بتانے میں عہد شکنی نہیں ہوتی کہ اس خاکسار ہی نے منشی جی کو دریافت کیا اور منشی جی کو بے نقاب کرنے کے بعد خود اپنے چہرہ پر " سکونی " کا پردہ ڈال کر ریڈیو سننے والوں اور لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے سامنے ان کو اس طرح پیش کیا کہ ہر ایک نے ان کو کانوں سے دیکھا یعنی اس بے پردگی کے بعد بھی منشی جی کا پردہ برقرار ہی رہا ۔"[1]

" منشی جی " کی گیارہ تمثیلیں بقول سیّد انصار ناصری 1939ء میں ریڈیو لکھنؤ سے نشر کی گئیں جبکہ امتیاز علی تاج نے 1930ء میں " چچا چھکن " کا کردار تخلیق کیا تھا اور چچا چھکن کے سلسلہ کے کئی مضامین تحریر کر چکے

---

[1] شوکت تھانوی : منشی جی ۔ صدیق بک ڈپو لکھنؤ ، 1939ء : ص : 5 ۔

تھے مثلاً چچا چھکن کی عینک ، چچا چھکن نے تصویر ٹانگی ، چچا چھکن نوچندی دیکھنے گئے ، چچا چھکن نے دھوبی کو کپڑے دئیے ، چچا چھکن نے ایک بات سنی ، چچا چھکن نے تیمارداری کی ، چچا چھکن نے ایک خط لکھا ، چچا چھکن نے جھگڑا چکایا ، چچا چھکن نے کیلے خریدے ، چچا چھکن نے ردی نکالی وغیرہ ۔ امتیاز علی تاج نے اعتراف کیا ہے کہ یہ کردار انہوں نے جیروم ۔ کے ۔ جیروم کی کتاب (THREE MAN IN A BOAT) سے لیا ہے وہاں انکل پوجر کا کردار اس قسم کی مضحکہ خیز حرکتیں کرتا ہے ۔

شوکت تھانوی ، امتیاز علی تاج کے چچا چھکن سے متاثر نظر آتے ہیں ۔ جس طرح چچا چھکن مضحکہ خیز حرکت کر کے ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح " منشی جی " بھی مضحکہ خیز حرکتوں سے لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ سیّد انصار ناصری نے راقم الحروف کو ایک ملاقات میں بتایا کہ منشی جی کا کردار رونق علی کرتے تھے ۔ کبھی کبھی رونق علی نہیں آئے تو شوکت تھانوی ایک خاص طریقہ سے منہ میں پان رکھ کر زبان گلے میں دبا کر آواز نکالتے تھے ۔ منشائن یا منشی جی کی بیوی سردار اختر بنتی تھی اور کچھ عرصے تک عرش منیز بھی یہ کردار ادا کرتی رہیں ۔ عام طور پر عرشِ منیز منشی جی کی بیوی کی سہیلی بنا کرتی تھیں ۔ اس زمانے میں ریڈیو کے باقاعدہ ملازمین اپنے اصلی ناموں کے بجائے ہندوانی ناموں سے پروگرام کرتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی جیسا کہ آج کل ہندوستان میں مسلمان اداکار اپنا ہندوانی نام رکھتے ہیں تاکہ وہ اقلیت کی بجائے اکثریت میں مقبول ہوں ۔ شوکت تھانوی کا نام تھا " سکونی " ملک حسیب احمد " نندی " چچا لطیف الرحمٰن کا نام تھا " ساگر چن " جے ۔ کے ۔ فرید کا نام " ہمایوں فر " سیّد انصار ناصری " مدھوکر " کے نام سے پروگرام پیش کرتے تھے ۔

خواجہ حسن نظامی نے " منشی جی " کا مقدمہ " پیرجی نے بسم اللہ پڑھائی " کے نام سے تحریر کیا ہے - وہ اپنے اس مقدمہ میں لکھتے ہیں:

" بہنو ! اور بھائیو ! ہم مولانا شوکت تھانوی صاحب کو جانتے ہیں اور ہم اس سے بھی آگاہ ہیں کہ انہوں نے لکھنُو ریڈیو میں گیارہ رات تک " سکونی " کے نام سے جو باتیں اپنی بیوی سے کی تھیں وہ ہم نے اور سب بھارت ماتا کے سپوتوں نے اپنے اپنے گھروں اور دکانوں اور ہوٹلوں میں سنی تھیں اور وہ باتیں ہم کو بحیثیت گھر سدھار کا کام کرنے کے گھر سدھار کے لئے بہت ہی اچھی معلوم ہوئی تھیں - ہم کو ان کے سننے سے ہنسی بھی آئی تھی اور ہمارا مع آل اولاد و اجداد کے جی خوش بھی ہوا تھا اور ہم نے ان سے سبق بھی لیا تھا -" [1]

خواجہ حسن نظامی نے اس مقدمہ میں گورنروں ، وزیروں اور اساتذہ کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ اگر گھر کا ماحول بہتر رکھنا چاہتے ہوں تو انہیں شوکت تھانوی کی یہ تمثیلیں جواب کتابی شکل میں " منشی جی " کے نام سے شائع ہو رہی ہیں ، ضرور پڑھیں - اس سے انہیں معلوم ہوگا کہ اپنے بچوں اور بیوی کو کس طرح خوش رکھا جا سکتا ہے - اس کتاب میں گیارہ تمثیلیں ہیں (1) منشی جی نے دوا پی (2) منشی جی نے صفائی کی (3) منشی جی نے کہانی کہی - (4) منشی جی نے چاہ بنائی (5) منشی جی نے خط لکھا (6) منشی جی نے تصویر کھنچوائی (7) منشی جی سودا لائے (8) منشی جی نے سبق پڑھا (9) منشی جی نے سفر کیا (10) منشی جی نوکر ہوگئے (11) منشی جی نے مکان بدلا - ان گیارہ تمثیلوں میں شوکت تھانوی نے ہر تمثیل میں منشی جی کے کردار کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے -

---

[1] شوکت تھانوی : منشی جی - صدیق بک ڈپو لکھنو ، 1939ء ، ص: 15-

ان ڈراموں کے حوالہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ منشی جی کا کردار تخلیق کر کے شوکت تھانوی نے عام لوگوں کے لئے ہنسی مذاق کا سامان فراہم کیا ہے ۔ منشی جی مخبوط الحواس قسم کے انسان ہیں وہ جو کام بھی کرنا چاہتے ہیں بھول جانے کی وجہ سے نہیں کرسکتے اور اپنے بھولنے کی ذمہ داری اپنی بیوی یا کسی اور شخصیت پر ڈال دیتے ہیں اس طرح وہ اپنی خامی کو بہت آسانی سے کسی دوسرے شخص کی خامی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ ان ڈراموں میں مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کی چاشنی بھی نظر آتی ہے ۔ لیکن ان کا طنز کسی کا دل دکھانے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اپنے معاشرے کی اصلاح کے لئے وہ طنز کرتے ہیں ۔ ان کے خاکوں میں طنز کہیں کہیں نظر آتا ہے لیکن زیادہ تر مزاح ملتا ہے اسی لئے یہ کردار قارئین کو بہت دیر تک یاد رہتا ہے ۔ سیّد انصار ناصری اور عشرت رحمانی کا کہنا ہے کہ جب یہ ڈرامے پیش کئے جاتے تھے تو لکھنؤ کے گلی کوچوں میں ان کی بازگشت سنائی دیتی تھی اور ہر عمر کے لوگوں میں یہ ڈرامے مقبول تھے ، بچے ، جوان اور بوڑھے سب ہی ان سے لطف اندوز ہوتے تھے اور کچھ لوگوں کی زبان پر اس کے مکالمے ہوتے تھے! ۔ شوکت تھانوی کی پرورش لکھنؤ کے ماحول میں ہوئی تھی اس لئے زبان و بیان پر قدرت ہونا ایک فطری امر تھا ۔ لکھنوی بیگمات کی زبان اور لکھنؤ کا روزمرہ اس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں کہ قاری یا سامع ان سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور بہت سے مکالموں پر بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے ۔ وہ سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع کو اتنے شگفتہ انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ہر بات قاری کے دل میں اترتی چلی جاتی ہے ۔ یہ ڈرامے کرداری مزاح کی بہت اچھی مثالیں ہیں ۔ مصنف کے تیز مشاہدے کی بدولت منشی جی کا کردار ہمیں اپنے ارد گرد چلتا پھرتا نظر آتا ہے ۔ عام زندگی میں سے

منتخب کئے گئے اس کے کارنامے ہر شخص کے لئے دلچسپی کا سامان فراہم کرتے ہیں ان سب ڈراموں میں پلاٹ ، کردار اور مکالمہ کے علاوہ کشمکش ، عروج اور اختتام پر بھی شوکت تھانوی خاص طور سے توجہ دیتے ہیں - ہر ڈرامے کا اختتام ایسے خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے کہ سامع بہت دیر تک منشی جی کے کارناموں پر ہنستا رہتا ہے -

شوکت تھانوی کی ایک دوسری کتاب " سنی سنائی " بارہ ریڈیائی تمثیلوں پر مشتمل ہے - اس کی سنِ اشاعت کا تعین شوکت تھانوی کے دیباچہ سے ہوتا ہے - جس پر 21- دسمبر 1943ء کی تاریخ درج ہے - یہ دیباچہ عذر گناہ کے عنوان سے لکھا گیا ہے - اس مجموعے کو لاہور میں مرتب کیا گیا اور پریم چند اگروال پرنٹر و پبلشر نے مرکنسٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر الائیڈ ٹریڈرز لمیٹڈ لاہور سے شائع کیا - شوکت تھانوی نے "عذرِ گناہ" کے تحت ریڈیو ڈرامے کی فنی حیثیت کے بارے میں دو ٹوک اظہار خیال کیا ہے جس سے ریڈیو ڈرامے کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر واضح ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں : " ڈرامے کے اصناف میں شاید ریڈیو ڈرامے سے زیادہ مشکل اور کوئی صنف نہیں ہے - اسٹیج یا اسکرین پر آپ کے کان سنتے ہیں اور آنکھیں دیکھتی ہیں - کان آنکھوں کی اور آنکھیں کانوں کی مدد کرکے آپ کو کچھ سمجھاتے ہیں - مناظر آپ کے سامنے ہوتے ہیں - ماحول آپ تلاش نہیں کرتے نہ آپ کو ٹٹولنا پڑتا ہے بلکہ یہ سب کچھ آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے مگر ریڈیو میں سوائے آواز کے ڈرامے کی نمائندگی کسی اور صورت سے نہیں ہوسکتی - اسی آواز کے اتار چڑھاؤ - مکالموں کی ترتیب دور اور نزدیک کی آوازوں کی ترکیب سے آپ کا ذہن ایک اسٹیج تیار کرتا ہے اور اس پر آپ کی

سماعت آپ کو وہ کھیل دکھاتی ہے جو آپ کی آنکھوں کے سامنے نہیں ہوتا ۔ بھی آوازیں کردار پیش کرتی ہیں اور اسی " اداکاری " سے آپ کو " اداکاری" کا لطف حاصل ہوتا ہے ۔ ریڈیو ڈراموں کی اس بے مائیگی کے باوجود روز افزوں کامیابی کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا ڈرامائی ذوق تسکین حاصل کر رہا ہے اور ڈرامے کی یہ غیر مرئی صورت بھی جو تمثیل کو تشکیل سے بے نیاز بنائے ہوئے ہے کامیاب ہے ۔"[1]

" سنی سنائی میں بارہ تمثیلیں شامل ہیں (1) نہیں مگر ہاں ، (2) برلن کا اسپتال ، (3) لاٹری کا ٹکٹ ، (4) سچ ، (5) لاڈلا بیٹا تھا اک ماں باپ کا ، (6) زندگی بنام زندہ دلی ، (7) خدا حافظ ، (8) جھوٹا خواب ، (9) بارش کے بعد ، (10) ملازمہ کی تلاش ، (11) انتیس کا چاند ، (12) سالگرہ ۔ خود شوکت تھانوی کے بقول : " یہ بارہ اڑنے والے طیور اس کتاب کے قفس میں بند ہیں پہلے یہ چہچہا چکے ہیں مگر اب فردوسِ گوش تو خیر نہ بن سکیں گے البتہ خدا کرے جنہم نظر ثابت نہ ہوں ۔ میں نے ریڈیو کے لئے جس قدر بھی تمثیلیں لکھی ہیں ان سب میں اپنے مزاج کا رنگ غالب رکھنے کی کوشش کی ہے مگر مجھے اعتراف ہے کہ کہیں ڈرامائی ضرورتوں نے مجھے بجھا دیا ہے اور کہیں ریڈیو کے حدود نے مجھ کو کھل کھیلنے سے باز رکھا ہے ۔ مختصر یہ کہ مزاح تو خیر آپ کو ضرور ملے گا مگر کہیں کہیں بے ساختگی کو آپ محتاط پائیں گے اس کے باوجود اگر ان تمثیلوں میں آپ کو میں زندہ نظر آؤں تو داد دیجئے گا ۔"[2]

---

[1] شوکت تھانوی : سنی سنائی ، مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور ، ص: 8 ، 9 ۔

[2] ایضاً ، ص: 9 ، 10 ۔

شوکت تھانوی کے ڈراموں کی ایک کتاب کا نام ہے " غالب کے ڈرامے " اس کے ٹائیٹل پر لکھا ہوا ہے " غالب کے ڈرامے جنہیں شوکت تھانوی نے لکھا " اس کتاب کو محمد طفیل پرنٹر و پبلشر نے سویرا آرٹ پریس لاہور سے چھپوا کر 1951ء میں شائع کیا ۔ اس کتاب کو ریڈیو پاکستان کی اجازت سے چھاپا گیا چونکہ اس کتاب میں شامل تمام ڈرامے ریڈیو پاکستان لاہور سے وقتاً فوقتاً پیش کئے جاتے رہے ۔ شوکت تھانوی نے اپنی تمثیلوں کے لئے مرزا غالب کے اشعار کا انتخاب کیوں کیا ؟ اس کا جواب وہ اس کتاب کے " عذر گناہ " میں اس طرح دیتے ہیں : " میں نے مرزا کے اشعار سے مختلف تمثیلی موضوع نچوڑنے کی ایک کوشش کی ہے جو اس مجموعے کی صورت میں پیش کی جارہی ہے میں یہ نہیں کہتا کہ مرزا کے زیر بحث اشعار کا صحیح نچوڑ وہی ہے ہے جو میرے ہاتھ آیا ہے مگر اس بہانے چند تمثیلوں کا مل جانا ہی کیا کم ہے اور ان تمثیلچوں کی طرف اگر غالب کے نام کی آڑ لے کر میں لوگوں کو چونکا کر متوجہ کرسکوں تو آخر اس بہانہ سے فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں ۔ غالب کے بے شمار اشعار میں اس قسم کے موضوع موجود ہیں بلکہ غالب ہی پر کیا منحصر ہے ہر شاعر کا ہر شعر کوئی نہ کوئی پلاٹ تو رکھتا ہی ہے مگر بے چارے غالب کو جہاں اور لوگوں نے تختۂ مشق بنایا ہے وہاں ایک میں بھی سہی ۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا کہ قیامت کے دن ان کا ہاتھ اور میرا گریبان ہوگا اور میں کہوں گا کہ مرزا صاحب آپ کے شارحین سے زیادہ تو میرا جرم نہیں اور غالباً اسی ایک بات پر مرزا صاحب معاف فرما دیں گے ۔ " [1]

---

[1] شوکت تھانوی : غالب کے ڈرامے مطبوعہ سویرا آرٹ پریس لاہور ، بار اول ، ص: 4 ۔

شوکت تھانوی کی یہ کتاب دو سو چوبیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں چودہ ڈرامے شامل کئے گئے ہیں یہ ڈرامے غالب کے جن اشعار پر مبنی ہیں ، وہ یہ ہیں :

1- میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

2- رہئیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زبان کوئی نہ ہو

3- بہرا ہوں میں تو چاہئیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

4- تاب لاتے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

5- آہ کو چاہئیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

6- بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

7- بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

8- دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

9- بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے

10- تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

11- کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کو لانا ہے جوئے شیر کا

12- ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

13- لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

14- یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

شوکت تھانوی نے غالب کے اشعار کے حوالے سے ان ڈراموں کا پلاٹ تیار کیا ہے ۔ پہلے ڈرامے میں طلعت اپنی تعلیم کے سلسلہ میں اپنے چچا کے یہاں قیام پذیر ہے جن کا بیٹا شکیل زیادہ تعلیم یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے ہر وقت بے تکی باتیں کرتا رہتا ہے طلعت کو اس کی یہ باتیں پسند نہیں ہیں ۔ ایک روز تنگ آ کر وہ اپنی خالہ زاد بہن نجمہ کے یہاں اس ارادے سے چلی جاتی ہے کہ اب کبھی اس گھر میں واپس نہیں آئے گی ۔ شکیل کی سالگرہ کے دن طلعت کے نام دعوت نامہ آتا ہے لیکن طلعت نے معذرت کرلی ہے اچانک طلعت کے والد صاحب تشریف لاتے ہیں اور اسے مجبوراً اپنے چچا کے گھر جانا پڑتا ہے جس پر شکیل ، طلعت کے پاس آکر چپکے سے یہ شعر پڑھتا ہے ۔

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بَن جائے کچھ ایسی کہ بِن آئے نہ بنے

ایک اور ڈرامے میں نزہت کے شوہر شفقت تعلیم حاصل کرنے ولایت جاتے ہیں تو نزہت نے نہ صرف انگریزی پڑھنا شروع کر دی بلکہ اپنے آپ کو انگریز بنانے کی کوشش بھی کرنی شروع کر دی تا کہ شوہر جب ولایت سے واپس آئے تو اس میں یہ تبدیلیاں دیکھ کر خوش ہو ۔ شفقت ، ولایت سے واپس آئے تو انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ نزہت نے اپنے لمبے اور گھنیرے بال کٹوا کر گھونگریالے بال بنوالیے ہیں ۔ شفقت نے نزہت کی اس حرکت کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا ۔ نزہت نے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ چند دن کے بعد یہ بال خود بخود بڑے ہوجائیں گے جس پر شفقت نے کہا کہ وہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ بڑھ جائیں گے مگر

آہ کو چاہئیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

یہ اس کتاب کا پانچواں ڈراما ہے ۔ تمام ڈراموں میں اشعار کے مفاہیم کے اعتبار سے ایک کہانی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جسے ایک کامیاب کوشش قرار دیا جا سکتا ہے ۔ [1]

" پاکستان ہمارا " ایک مقبول ریڈیائی پروگرام تھا ، جس سے شوکت تھانوی کی وابستگی کسی قدر تفصیل چاہتی ہے ۔ 1947ء میں تقسیم ہند کے فوراً بعد مغربی پنجاب میں اخلاقی و معاشرتی حالات بہت المناک صورت اختیار کر چکے تھے ۔ مسلمانوں پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا ۔ دہشت کے مختلف حربے استعمال کر کے انہیں مشرقی پنجاب سے نکالا جا رہا تھا ۔ ہر روز ان کے قافلوں پر سفاکانہ حملے کئے جاتے تھے ۔ ریل گاڑیوں سے ہزاروں کی تعداد میں زخمی یہاں پہنچتے تھے جس کی وجہ سے افراتفری کا دور دورہ معلوم ہوتا تھا اور ہر شخص اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتا تھا ۔ ان حالات

کے پیش نظر ضرورت اس امر کی تھی کہ ہندوستان سے آئے ہوئے مسلمانوں کی حالتِ زار پر ہمدردی سے غور کیا جائے اور ان کا "مورال" بلند کرنے کی کوشش کی جائے۔

ظفر الاحسن نے جو اس زمانے میں لاہور کے ڈپٹی کمشنر تھے ، سیّد امتیاز علی تاج سے فرمایا کہ : " مہاجر طرح طرح کی مصیبتیں سر کر کے برے حالوں پاکستان پہنچ رہے ہیں اور ان کا مورال مجھے کچھ اونچا نظر نہیں آتا ۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ روزانہ اخباروں کے پہلے صفحے پر کچھ جگہ اس غرض کے لئے مخصوص کرانے کی کوشش کروں کہ اس میں لوگوں کا مورال اونچا کرنے کے لئے آپ روزانہ مناسب مضامین لکھنے کی ذمہ داری سنبھال لیں ۔" [1]

سیّد امتیاز علی تاج نے ظفر الاحسن کی اس بات پر کچھ روز غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ کئی اخباروں کے لئے مضامین لکھنا نہ صرف محنت طلب کام ہے بلکہ اس سے بعض پیچیدگیاں پیدا ہونے کا بھی اندیشہ ہے اس لئے انہوں نے ظفر الاحسن کو بتایا کہ یہ خدمت ریڈیو پاکستان کے ذریعے انجام دینے کی کوشش کی جائے ۔ ظفر الاحسن نے اس تجویز سے اتفاق فرمایا چنانچہ سیّد امتیاز علی تاج نے لاہور سے نشر کرنے کے لئے ایک مرکب پروگرام کا منصوبہ تیار کیا ، ریڈیو کے افسروں سے تفصیلی بحث ہوئی ۔ انہوں نے اس تجویز کو پسند کیا ۔ پروگرام کا نام " پاکستان ہمارا " تجویز ہوا ۔ ریڈیو پاکستان کے افسروں نے سیّد امتیاز علی تاج کی معاونت کے لئے شوکت تھانوی کو مقرّر کیا ۔ سیّد امتیاز علی تاج نے اپنے ایک مضمون میں یہ بتایا ہے کہ وہ یہ پروگرام کس طرح تیار کرتے تھے وہ لکھتے ہیں :۔ " ہم دونوں ایک ہی کمرے میں اور ایک ہی میز پر آمنے سامنے بیٹھ کر کام کرتے تھے ۔ کام کرنے کا طریق یہ تھا کہ

---

[1] سیّد امتیاز علی تاج : نقوش لاہور شوکت نمبر ستمبر 1963ء ، ص : 504

صبح کو دفتر پہنچتے ہی طے کرتے کہ اس دن کے پروگرام کا موضوع کیا ہوگا ۔ موضوع کے انتخاب میں اخباروں کی خبریں اور رپورٹروں کی رپورٹیں ہماری رہنمائی کرتیں ۔ ان دونوں ذریعوں سے امداد نہ ملتی تو عام حالات کا خیال کرکے ایک دوسرے کے مشورے سے کوئی مناسب موضوع خود طے کرلیتے ۔ جو موضوع بھی طے ہوتا اس پر کلام پاک ، حدیث ، اور تاریخ میں سے ایسی چیزیں نکالتے جن سے اسلامی نقطۂ نظر واضح ہوتا ۔ اس کے بعد ہنگامی حالات پر توجہ کی جاتی ۔ کیمپوں کے واقعات پر مکالمے ، اسکٹ ، نظمیں وغیرہ لکھنا تجویز ہوتا ۔ یوں بہت سی اہم اور مفید مطلب چیزوں کی ایک فہرست دوپہر سے پہلے تیار ہوجاتی ۔ اس کے بعد ہم کام تقسیم کرتے کہ فہرست کی کون کون سی چیزیں شوکت لکھیں گے اور کون کون سی میں ۔ کھانا کھانے کے بعد دونوں لکھنے میں مصروف ہوجاتے اور سہ پہر تک اپنے اپنے حصے کی تحریریں تیار کرلیتے اور ایک دوسرے کو سناتے ۔ دونوں ایک دوسرے کی چیزوں پر بے تکلفی سے اظہارِ رائے کرتے اور جو قائل ہوجاتا وہ اپنی چیز دوبارہ لکھتا یا اس میں مناسب ترمیم کردیتا ۔ نقلیں تیار ہونے کے لئے مسوّدہ کئی لوگوں کو دے دیا جاتا ۔ نقلیں تیار ہوکر آتیں تو جلدی جلدی ہم انہیں پڑھتے اور کتابت کی غلطیاں درست کرتے ۔ پھر مختلف حصے مختلف آوازوں کے سپرد کرکے ان کی ریہرسل کراتے ۔ اتنے میں براڈ کاسٹ کا وقت ہوجاتا ۔ اس میں حسب ضرورت حصہ لیتے ۔ راوی کے جملے میں بولتا ۔ شوکت عموماً کسی اسکٹ میں حصہ لیا کرتے تھے ۔" [1]

" پاکستان ہمارا " کے سلسلہ کے یہ پروگرام حیرت انگیز حد تک پسند کئے گئے ۔ ریڈیو کی تاریخ میں اس پروگرام کی غیر معمولی مقبولیت ایک بے مثال

---

[1] سید امتیاز علی تاج : شوکت نمبر نقوش ستمبر 1963ء ، ص: 505 ، 504 ۔

واقعہ قرار دی جا سکتی ہے۔ اس کی مقبولیت کا ایک واقعہ سید امتیاز علی تاج نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے: "مجھے یاد ہے کہ ایک روز صبح صبح ہمیں اطلاع ملی کہ کئی مہاجر جو ٹھکانہ میسر نہ آنے کے باعث کہیں ریلوے لائن کے قریب سردیوں کے آسمان تلے پڑے رہے تھے رات میں ٹھٹھر کر جاں بحق ہوگئے۔ یہ اطلاع پا کر سبھی بے حد متاثر ہوئے چنانچہ اس روز کا پروگرام ہم نے شدید احساسِ درد کے ساتھ لکھا۔ اس پروگرام کے لئے شوکت نے ایک نظم "بعد از وقت" کہی جس کا مضمون یہ تھا کہ کوئی سوشل ورکر کسی مہاجر عورت کی بچی کے لئے کمبل لے کر پہنچتا ہے تو بچی سردی سے ٹھٹھر کر ختم ہوچکی ہے۔ نظم مؤثر تھی اور بہت خوبی سے پڑھی گئی سارا پروگرام ہی ایسا تھا کہ سننے والوں پر اس کا بے حد اثر ہوا۔ چنانچہ اگلے روز بیت المال سے اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان کے نام فون آیا کہ پچھلی شام کا پروگرام سن کر لوگ گرم کپڑے اور لحاف اور توشکیں لے لے اتنی زیادہ تعداد میں بیت المال پہنچ رہے ہیں۔ کہ ان سب کی لائی ہوئی چیزوں کو سنبھالنا ہمارے سٹاف کے لئے ناممکن ہو رہا ہے اور اس سے بھی زیادہ مشکل اس بات سے پیدا ہو رہی ہے کہ عورتیں اپنی طلائی چوڑیاں اور انگوٹھیاں اور بالیاں لے لے کر آ رہی ہیں۔ ان زیوروں کو وصول کرنے میں کئی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ زیوروں کو تولنے یا ان کی صحیح قیمت جانچنے کا ہمارے پاس کوئی انتظام نہیں ------ براہِ کرم ریڈیو کے ذریعے خواتین کو ہدایت دیجئیے کہ وہ بیت المال کو اپنے زیور فی الحال نہ دیں۔"[1]

"پاکستان ہمارا" کے نام سے یہ پروگرام ہر روز شام کو آٹھ بجے سے ساڑھے آٹھ بجے تک ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوتا تھا۔ اس پروگرام میں

---

[1] سیّد امتیاز علی تاج: نقوش شوکت نمبر ستمبر 1963ء، ص: 506۔

دلچسپی پیدا کرنے کے لئے ایک مزاحیہ کردار تخلیق کیا گیا جس کا نام شوکت تھانوی نے " قاضی جی " تجویز کیا ۔

مزاحیہ کردار ایک ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں کسی ایک معاشرے کے تمام انسانوں کی خامیوں اور ناہمواریوں کا عکس نظر آتا ہے یہ کسی ایک فرد کا چربہ نہیں ہوتا بلکہ ایک مخصوص معاشرے کے تمام افراد کی مجموعی خامیوں اور کمزوریوں کا آئینہ ہوتا ہے ۔ مزاحیہ کردار کا یہی پہلو اس کا جواز بھی ہے اور اس کے قبول عام کی ضمانت بھی کیونکہ اس میں جو عکس نظر آتے ہیں انہیں دیکھنے والا دوسروں کی خامیاں سمجھتا ہے ، اپنی نہیں ۔ حالانکہ اس کا عمل اور فکر غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر اس سے متاثر ضرور ہوتی ہے ۔ مزاحیہ کردار کے پرتو میں ہم دوسروں کی خامیوں پر ہنستے ہیں ، قہقہے لگاتے ہیں اور خود کو ان خامیوں اور کمزوریوں سے بلند تصور کرتے ہیں ۔

مزاحیہ کردار کا چونکہ اپنا ایک فلسفۂ حیات ہوتا ہے اس لئے اس کی تمام حرکات و سکنات کے پس پشت ایک منطق اور طرز استدلال بھی ہوتا ہے ۔ اپنے نقطۂ نظر کی صحت پر ضرورت سے زیادہ اعتماد اس کے کردار کو بے لچک بنا دیتا ہے جہاں ہم اسے مزاحیہ کردار تصور کرتے ہیں وہاں وہ خود بھی ان تمام لوگوں کو جو اس سے متفق نہیں ہوتے مزاحیہ کردار ہی سمجھتا ہے ان پر اور ان کی کم عقل پر مسکراتا ہے اور اگر بالکل منطقی طریقہ سے دیکھا جائے تو ہمارے پاس کوئی ایسا طریقہ نہیں کہ ہم اسے غلط اور خود کو صحیح ثابت کرسکیں ۔

مزاحیہ کردار کی یہ تمام خصوصیات ہمیں " قاضی جی " میں نظر آتی ہیں ۔ اس لئے اردو ادب کا ہر ناقد " قاضی جی " کو اردو کے مزاحیہ کرداروں کی مختصر فہرست میں ایک قابل قدر اضافہ سمجھتا ہے ۔ " قاضی جی "

کی تین جلدیں ادارۂ فروغ اردو " لاہور نے نقوش پریس سے چھپوا کر شائع کیں۔ سیّد امتیازعلی تاج نے " قاضی جی " حصہ اوّل کے دیباچہ میں "قاضی جی" کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔ : " ایک برخود غلط قسم کے بزرگ ، لکیر کے فقیر ، پاکستان سے اس لئے نالاں کہ اس نے آپ کو بعض ادنیٰ آسائشوں سے محروم کردیا ہے۔ لیکن ان تمام جائز و ناجائز مواقع سے فائدہ اٹھانے کےلئے کمربستہ جو پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے پیدا ہوگئے ہیں۔ غرض پرستی اور تن آسانی کے گئے گذرے عہد کی یادگار۔ ان تمام صفات سے کورے جو قومی واخلاقی استحکام کی جان سمجھی جاسکتی ہیں۔ دخل در معقولات میں انتخاب۔ کج بخشی میں لاجواب۔ غرض چھوٹی بڑی کمزوریوں کی ایک طرفہ معجون۔ بحیثیتِ مجموعی ایک ایسی شخصیت جس کے کھوکھلے پن کو بازار کا ایک عام شخص بھی پورے طور سے محسوس کرکے اپنی برتری کی لذت سے بہرہ اندوز ہوسکے۔ ان بزرگوار کو " قاضی صاحب " کے نام سے یاد کرنے میں غالباً شہر کے اندیشے " نے شوکت صاحب کی رہنمائی کی ہوگی۔" [1]

سیّد امتیازعلی تاج نے شوکت تھانوی کے "قاضی جی " کی سچی تصویر ہمارے سامنے پیش کی ہے۔ " قاضی جی " کی تینوں جلدیں پڑھنے سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ یہ کردار متعدد مقامات پر ابھرتا اور ڈوبتا ہے یہ ایک مکمل مزاحیہ کردار کی شکل وہاں اختیار کرتے ہیں جہاں ان کے بندھے ٹکے نظریات اور خیالات معاشرہ کے حالات اور بحران سے متصادم ہوتے ہیں۔ یہ تصادم ان کے ذہن میں ایک عجیب قسم کی کشمکش کو جگہ دیتا ہے اور ہر شخص کو اپنے نظریات اور عمل سے غیر متفق پا کر حیران و ششدر رہ جاتے

---

[1] سیّد امتیازعلی تاج : دیباچہ ، قاضی جی ، حصہ اوّل ، مطبوعہ نقوش پریس ، لاہور ، ص : 4 ، 5۔

ہیں چونکہ ان کو اپنی صلاحیتوں پر مکمل یقین ہے اس لئے اپنی خامیاں ان کی نظروں سے پوشیدہ رہتی ہیں اور وہ دوسروں کو تفریحِ طبع کا سامان بہم پہنچاتے رہتے ہیں ۔

شوکت تھانوی نے 1947ء عیسوی میں یہ پروگرام لکھنا شروع کیا اور 1963ء عیسوی تک لکھتے رہے ۔ یہ پروگرام لاہور ، کراچی اور راولپنڈی ریڈیو اسٹیشنوں سے پیش کیا جاتا رہا ۔ اس پروگرام میں بیگم خورشید حفیظ جالندھری بھی حصہ لیا کرتی تھیں ۔ وہ اپنے ایک مضمون میں " قاضی جی " کے بارے میں چند اہم معلومات فراہم کرتی ہیں ۔ وہ لکھتی ہیں : " شوکت بھائی نے ایک فیچر پروگرام خود لکھنا اور پیش کرنا شروع کیا ۔ جس کا عنوان تھا " قاضی جی " — عوام نے شوکت بھائی کے قاضی جی کو بہت پسند کیا ۔ گھر گھر قاضی جی کی شہرت کا چرچا تھا غرض قاضی جی بہت مقبول ہوا ۔ شوکت بھائی قاضی جی کا رول خود کرتے تھے اور ان کی لاڈلی اکلوتی زبیدہ بہن کا کردار میں ادا کرتی ۔ ان کی بیوی موہنی داس بنتی اور بیوی کے بھائی کا پارٹ عقیل احمد ادا کرتے ۔ لاہور سے قاضی جی سات سال تک برابر ہر پیر کی شام سوا آٹھ بجے سے ساڑھے آٹھ بجے تک نشر ہوتا رہا ۔ " [1]

بیگم خورشید حفیظ جالندھری کے اس بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قاضی جی ہفتہ میں صرف ایک بار یعنی سوموار کو نشر ہوا کرتا تھا جبکہ " پاکستان ہمارا " روزانہ نشر ہوتا تھا ۔

" قاضی جی " حصہ اوّل میں چوبیس (24) حصہ دوم میں بیس (20) اور حصہ سوم میں انیس (19) ڈرامے شامل کئے گئے ہیں ۔ اس طرح

---

[1] بیگم خورشید حفیظ جالندھری: مضمون " میں اور شوکت بھائی " نقوش شوکت نمبر ص : 562 ۔

ان ڈراموں کی کل تعداد تریسٹھ بنتی ہے ۔ جبکہ ریڈیو پاکستان سے نشر ہونے والے ڈراموں کی تعداد سید انصار ناصری کے بقول کم از کم چھ سو ہے ۔ یہ ڈرامے پہلے لاہور سے پھر کراچی سے اور پھر راولپنڈی سے نشر ہوتے رہے ۔ سیّد انصار ناصری کی اس بات کی تائید سیّد امتیاز علی تاج کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے ۔ وہ ایک مضمون میں لکھتے ہیں : " کوئی ایک سو پروگرام لکھنے اور پیش کرنے کے بعد تھک کر میں نے تو ریڈیو پاکستان سے رخصت کی اجازت چاہی ۔ شوکت کا تعلق چونکہ اس محکمہ سے مستقل تھا ، وہ اس کام میں برابر مصروف رہے ۔ تین چار مہینے کی اس یکجائی سے میرے اور شوکت کے تعلقات بہت بڑھ گئے ۔ "[1]

سیّد امتیاز علی تاج کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف تین چار مہینے اکٹھے رہے اور اس عرصہ میں انہوں نے تقریباً ایک سو پروگرام تحریر کئے ۔ شوکت تھانوی کی ریڈیو سے وابستگی 1947ء سے 1963ء تک رہی ۔ اس اعتبار سے اگر ان کے ڈراموں کی تعداد کا اندازہ لگایا جائے تو وہ یقیناً ہزاروں تک پہنچتی ہے ۔ لاہور سے تقریباً سات سال یہ پروگرام متواتر چلتا رہا جس کی تصدیق سیّد امتیاز علی تاج ، سید انصار ناصری ، عشرت رحمانی اور بیگم خورشید حفیظ جالندھری کے متعدد مضامین سے ہوتا ہے راقم الحروف نے ریڈیو پاکستان کے متعلقہ افسران سے اس سلسلہ میں گفتگو کی تو وہ ان ڈراموں کی صحیح تعداد نہیں بتا سکے ۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر تین سال کے بعد اسکرپٹ ضائع کردئیے جاتے ہیں ۔ چند اسکرپٹ اور کیسٹ سنٹرل پروڈکشن آفس راولپنڈی میں نمونے کے طور پر محفوظ کرلئے جاتے ہیں ۔ چنانچہ راقم الحروف 31 ، اگست 1978ء کو پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کے سنٹرل پروڈکشن آفس گیا ۔ اس وقت یہ 56 ۔ اے سٹیلائٹ ٹاون راولپنڈی میں واقع تھا اور پروگرام مینجر سنٹرل پروڈکشن کے عہدے پر ایس ۔ ایم ۔ سعید نقشبندی فائز تھے ۔ اس دفتر میں خواجہ اعجاز احمد

---

[1] سید امتیاز علی تاج : نقوش شوکت نمبر ستمبر 1963ء ص 506 ، 507 خ

اور حامد جیلانی سے بھی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ شوکت تھانوی کی سرگذشت، ایک مشاعرہ اور چند ڈرامے ان کے پاس محفوظ ہیں۔ نقشبندی صاحب کی اجازت سے انہوں نے ان ڈراموں کے کیسٹ سنائے اور چند اسکرپٹ دکھائے۔ ان چند چیزوں کے علاوہ باقی تمام مسودے ضائع کردیئے گئے ہیں۔

اختر جہاں نومبر 1961ء میں "قاضی جی" کے فنکاروں میں شامل ہوئیں۔ انہیں نسوانی کردار کے لئے بلایا گیا تھا۔ وہ لکھتی ہیں۔ "پہلے پروگرام میں، میں گھبرا گئی مارے رعب کے زبان لڑکھڑائے جاتی تھی۔ دوسرے ہفتے مسوّدہ کی ریڈنگ کے بعد شوکت صاحب نے خود بھی کہا "پچھلی مرتبہ آپ کی آواز میں تکلف تھا۔ گھبرائیے بالکل نہیں اگر غلطی ہوگئی تو میں سنبھال لوں گا بالکل نڈر ہوکر بولئے" شوکت صاحب کا یہ فقرہ مجھے اس طرح یاد ہے کہ اس وقت بھی جیسے میں اپنے کانوں سے ان کی آواز سن رہی ہوں۔ دوسرا پروگرام پہلے سے بہتر ہوا۔ شوکت صاحب نے اطمینان کا اظہار کیا۔ میری جھجک اور ڈر رفتہ رفتہ دور ہوتا گیا۔"[1]

اختر جہاں کے اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ شوکت تھانوی اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی کس طرح حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اختر جہاں سے راقم الحروف نے 29، اگست 1978ء کو ان کے گھر 408-ڈی-سٹیلائیٹ ٹاؤن راولپنڈی میں ملاقات کی اور شوکت تھانوی کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کیں۔ انہوں نے انٹرویو کے دوران اپنی گفتگو میں بھی اور اپنے ایک مضمون میں بھی یہ بتایا کہ شوکت تھانوی نے "قاضی جی" کا آخری پروگرام 16، مارچ 1963ء کو ریکارڈ کروایا۔ کئی پروگرام اکٹھے ریکارڈ کروالئے گئے تھے۔ وہ لکھتی ہیں:

---

[1] اختر جہاں: نقوش شوکت نمبر "شوکت تھانوی جب قاضی جی ہوتے"، ص: 566، 567۔

" سوا سال میں تقریباً ساٹھ ہفتے ہوتے ہیں۔ ساٹھ ہفتوں کا یہ خیالی البم جس میں شوکت صاحب کی ہنستی ، چہکتی ، مسکراتی تصویریں ہیں۔ زندگی سے بھرپور ، زندگی کی تلخیوں کا مضحکہ اڑاتی ہوئی۔ اس البم کی آخری تصویر 16 ، مارچ 1963ء کی ہے۔ اس روز شوکت صاحب مضمحل اور خاموش سے تھے۔ میں نے مزاج پرسی کی ، بہت مختصر سا جواب دیا۔ میں ڈر گئی۔ کبھی کبھی شوکت صاحب کراہ کر پہلو بدلتے تھے اور بار بار کھانستے تھے لیکن پیشانی پر کوئی ناگواری کے آثار نہیں تھے۔ پروگرام اکٹھے ریکارڈ کئے گئے۔ 16 ، مارچ کو ریڈیو اسٹیشن سے شوکت صاحب کے آخری قدم گئے۔ اس کے بعد میں شوکت صاحب کو نہ دیکھ سکی۔" [1]

اختر جہاں کے اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شوکت تھانوی نے قاضی جی کے سلسلہ کا آخری پروگرام 16 ، مارچ 1963ء کو ریکارڈ کروایا۔ اس طرح نومبر 1947ء سے مارچ 1963ء تک شوکت تھانوی کا تعلق سے رہا۔ اس طویل عرصے میں انہوں نے نہ صرف ریڈیو پاکستان ریڈیو پاکستان/ کے لئے ڈرامے تحریر کئے بلکہ بچوں کا پروگرام اور عورتوں کے پروگرام کے لئے بھی بہت کچھ لکھتے رہے۔ بیگم خورشید حفیظ جالندھری اپنے ایک مضمون میں عورتوں کے پروگرام کے بارے میں تحریر کرتی ہیں کہ : " ان ہی دنوں شوکت بھائی نے عورتوں کے پروگرام میں خالہ جان کے نام سے ایک فیچر پروگرام لکھنا اور پیش کرنا شروع کیا جس میں فلم ایکٹرس ببّو خالہ جان بنتی تھیں اور ان کی بھانجی کا کردار میں کرتی اور خود شوکت بھائی ایک بیکار نا اہل امیدوار لڑکے کا رول کرتے تھے جو خالہ جان کی چہیتی بھانجی سے شادی کرنے

---

[1] اختر جہاں : نقوش شوکت نمبر " شوکت تھانوی جب قاضی جی ہوتے " ، ص : 568۔

کا خواہشمند تھا۔ لڑکا جب بر دکھاوے کے لئے پیش کیا گیا تو اس کی بہن نے اس کی ہزاروں خوبیاں کیں مگر برعکس اس کے لڑکا توتلا اور ہکلا تھا۔ کانوں سے اونچا سنتا تھا۔ ان پڑھ تھا اور بہت سی ایسی ہی قسم کی خوبیوں کے باوجود اشاروں میں بات کرنے کا ماہر تھا۔ لڑکی کو اس کی شکل سے ہی سخت چڑ تھی شادی کیا خاک ہوتی۔ یہ پروگرام بھی بہت ہی دلچسپ تھا۔" [1]

شوکت تھانوی جس زمانے میں لکھنؤ ریڈیو سے منسلک رہے اس زمانے میں ہر ریڈیو اسٹیشن کی کوئی نہ کوئی خصوصیت ہوتی تھی۔ مثلاً لاہور ریڈیو اسٹیشن ڈراموں کے لئے مشہور تھا۔ دہلی ریڈیو اسٹیشن تقاریر کے لئے مخصوص تھا۔ بمبئی میں کلاسیکی موسیقی کے اعلیٰ فنکار اور موسیقار جمع تھے اس لئے وہاں موسیقی کے پروگرام نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ لکھنؤ اور اس کے قرب و جوار میں فنکاروں، ادیبوں اور شاعروں کا مجمع تھا اور لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر چند اہل ذوق موجود تھے اور یہ سب فن کے میدان میں مجاہدانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس اسٹیشن کی خصوصیتِ خاصہ غنائیہ فیچر اور اوپیرا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ نشری اوپیرا برِصغیر میں سب سے پہلے لکھنؤ ریڈیو سے شروع کیا گیا چونکہ سر زمینِ اودھ میں ماہر خوش گلو موسیقار اور صدا کار معقول تعداد میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ انہیں نشری ضروریات کے لئے آسانی سے تربیت دی جا سکتی تھی۔

پہلا اوپیرا لکھنے کے لئے جگر مراد آبادی سے گذارش کی گئی۔ شوکت تھانوی اور عشرت رحمانی نے کہانی کا خلاصہ دے کر مثنوی لکھنے کی فرمائش

---

[1] بیگم خورشید حفیظ جالندھری: نقوش شوکت نمبر " میں اور شوکت بھائی " ص: 562 - 563۔

کی اور اصرار و تقاضے کے بعد مثنوی لکھوانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس مثنوی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جگر صاحب نے اس میں مثنوی کے انداز میں اپنے مخصوص تغزل کی دلکش و رنگین کیفیت پیدا کردی تھی لیکن اسے نثری ڈراما بنانا ممکن نہ تھا کیونکہ اس میں ڈرامائی عناصر نہ ہونے کے برابر تھے، سیّد انصار ناصری نے اپنے ایک انٹرویو میں راقم الحروف کو بتایا کہ یہ 1941ء کا واقعہ ہے اس وقت لکھنو کے اسٹیشن ڈائریکٹر مسٹر کندن سروپ ملک تھے جو کے۔ ایس۔ ملک کے نام سے مشہور تھے اور ایک با ذوق فنکار تھے۔ اور "پرویز" کے نام سے نثری ڈرامے اور خاکے لکھا کرتے تھے — مثنوی میں ڈرامائی ضرورتیں پورا کرنے کے لئے ملک صاحب، سیّد انصار ناصری، شوکت تھانوی اور عشرت رحمانی ایک کمرے میں بیٹھ جاتے اور باہمی صلاح مشورے سے اوپیرا کے لئے مثنوی تیار کی جاتی۔ عشرت رحمانی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔ "یہ مثنوی جس کا نام خاص کردار (ہیروئین) دردانہ کے نام پر "دردانہ" رکھا گیا، کی مہورت کی گئی۔ تین چار گھنٹے ہم سب سر جوڑ کر کے وہاں بیٹھتے۔ میں اور شوکت شعر پر شعر کہتے جاتے انصار ناصری لکھتے جاتے اور ملک صاحب اظہار رائے کرتے۔ چائے، کیک، پیسٹری، سگریٹ پان غرض شاندار تواضع جاری رہتی ملک صاحب کی حالت یہ تھی کہ جہاں کہیں انہیں کوئی مصرع یا شعر پسند نہ آتا تو صاف گوئی سے کام لینے کے بدلے صرف آہستہ سے اتنا کہنے پر اکتفا کرتے کہ "اسے کسی اور طرح کہہ کر دیکھئیے"۔ [1]

یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دفتری کاموں میں گڑبڑ ہونے لگی۔ شوکت تھانوی کو اور بھی پروگرام لکھنے اور پیش کرنے ہوتے

---

[1] عشرت رحمانی: نقوش شوکت نمبر (شوکت تھانوی۔ چند یادیں) ص: 520۔

تھے اس لئے فیصلہ یہ ہوا کہ سیّد انصار ناصری کے مکان پر یہ سب اصحاب رات کو جمع ہوا کریں - چنانچہ اب یہ محفل رات کو آٹھ بجے سے بارہ بجے تک سیّد انصار ناصری کے مکان پر جمنے لگی - کچھ عرصہ کے بعد عشرت رحمانی کے یہاں یہ مجلس آرائی شروع ہوئی - اس محفل کے دوران روٹھنے اور منانے کا سلسلہ بھی جاری رہا - کبھی شوکت تھانوی اپنی تنگ مزاجی کی وجہ سے روٹھ کر جانے لگتے تو عشرت رحمانی اور سیّد انصار ناصری انہیں منانے کی کوشش کرتے اور جب عشرت رحمانی بگڑ جاتے تو شوکت تھانوی انہیں مناتے - کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رہا اور بالآخر یہ مثنوی " وردانہ " تیار ہوئی - عشرت رحمانی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں : " بزمِ شعر گوئی کے نتیجہ میں ہم نے مل جل کر نہایت دلکش اور کامیاب مسوّدہ تیار کیا - جگر صاحب کے اشعار استعمال کرنے کی اجازت بھی ان سے حاصل ہوگئی - انصار صاحب کے ذمہ اس پروگرام کی ہدایت کاری تھی - فنکاروں میں کلکتہ سے فلم اور تھیٹر کی مشہور و مقبول ادا کارہ جہاں آرا کجن مرحومہ ہیروئن کے لئے بلائی گئیں اور لکھنؤ سے آج کل کے محبوب گلوکار طلعت محمود ہیرو کی حیثیت سے منتخب ہوئے - دوسرے صدا کاروں میں منّا بائی مرحومہ (الہ آبادی) اختری بائی فیض آبادی (جو اب اختر اشتیاق ہیں) ستارہ بائی کانپوری اور دو درجن دوسرے اعلی فنکار بُک کئے گئے - تقریباً دو ہفتے دن دن بھر ریہرسلیں ہوتی رہیں - اسٹیشن بھر کا عملہ تمام فنکار اور دیگر اہلکار افسران وغیرہ سب ہی کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے - آخر یہ جدید انداز کا اوپیرا بڑی دھوم دھام سے مقررہ تاریخ کو نشر ہوا اور اپنی دلکشی و جاذبیت کے لحاظ سے سامعین کے کانوں میں اس کی طرزیں گونجتی رہیں - "[1]

---

[1] عشرت رحمانی: نقوش شوکت نمبر (شوکت تھانوی - چند یادیں) ص: 521 ، 522 -

" دردانہ " کے نام سے ریڈیو لکھنو پر نشر ہونے والے اوپیرا کی فوٹو سٹیٹ کاپی سیّد انصار ناصری نے راقم الحروف کو مہیّا کی ۔ مدیر نقوش محمد طفیل نے نقوش کے شوکت نمبر میں بھی اسے شائع کیا ہے ۔ صفحہ 151 سے 164 تک یعنی چودہ صفحات پر مشتمل ہے ۔ مدیر نقوش محمد طفیل نے اپنی طرف سے اس پر جو نوٹ لکھا ہے وہ یہ ہے : " یہ اوپیرا آل انڈیا ریڈیو لکھنُو کے لئے 1941ء میں لکھا گیا تھا ۔ حضرت جگر مراد آبادی سے ایک مثنوی لکھوائی گئی ۔ اس کی
، ریڈیائی اوپیرا مرتب کیا ۔ گیت اور غزلیں عشرت رحمانی نے
اساس پر شوکت تھانوی مرحوم اور عشرت رحمانی نے/لکھیں ۔ حضرت جگر کے بعض اشعار اس میں استعمال ہوئے ہیں باقی تدوین شوکت تھانوی اور عشرت رحمانی کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہے اور سیّد انصار ناصری حال ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان نے ہدایت کاری کے فرائض انجام دئے تھے ۔ جہاں آرا کجن مرحومہ مشہور فلم و اسٹیج اداکارہ اور گلوکار طلعت محمود نے ہیروئن اور ہیرو کے کردار انجام دئے تھے ۔ " سہ[1]

شوکت تھانوی کی ریڈیو سے وابستگی کا آغاز 1938ء میں ہوتا ہے اور یہ سلسلہ ان کے سال وفات 1963ء تک کسی نہ کسی صورت میں جاری رہتا ہے ۔ اس عرصہ میں شوکت تھانوی نے نہ صرف بہت سے پروگرام تحریر کئے بلکہ صداکار کی حیثیت سے بھی اپنا لوہا منوایا ۔۔ " قاضی جی " اس کا منہ بولتا ثبوت ہے ۔ سیّد انصار ناصری نے راقم الحروف کو ایک ملاقات میں بتایا کہ جب لکھنُو ریڈیو سے " منشی جی " پیش کیا جانا تھا تو اس وقت شوکت تھانوی کی آواز کو " منشی جی " کے لئے مناسب نہیں سمجھا گیا اور رونق علی کا انتخاب " منشی جی " کے لئے کیا گیا جب کبھی رونق علی اپنی مصروفیات کی وجہ سے

سہ[1] محمد طفیل ۔ مدیر نقوش : " نقوش شوکت نمبر "
ستمبر 1963ء ، ص : 151 ۔

دستیاب نہ ہوتے تو شوکت تھانوی اپنے گلے میں پان دبا کر اسی طرح کی آواز نکالنے کی کوشش کرتے اور رفتہ رفتہ وہ اس فن میں ماہر ہوتے چلے گئے ۔

پاکستان بننے کے بعد جب قاضی جی کا سلسلہ ریڈیو پاکستان لاہور سے شروع کیا گیا تو شوکت تھانوی نے " منشی جی " کے انداز میں " قاضی جی " کا کردار ادا کرنا شروع کیا ۔ شاہد احمد دہلوی اپنے ایک مضمون میں شوکت تھانوی کی اداکاری اور نقالی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ : " ان کی ایک اور صلاحیت کا بھی انکشاف ہوا کہ ریڈیائی اداکاری اچھی کرسکتے تھے ۔ نقالی کا مادہ تو ان میں شروع ہی سے تھا ، کئی طرح کی آوازیں بنانے پر بھی قادر ہوگئے ، لکھنے میں انہیں کوئی تکلف نہ ہوتا تھا ، قلم برداشتہ لکھتے تھے ، اچھا لکھتے تھے اور خوش خط تھے ۔ میں نے ان کے مسودے دیکھے ہیں ۔ ایک لفظ بھی نہیں کاٹتے تھے اور سطریں موتی کی لڑیاں دکھائی دیتی تھیں ۔ لکھنُو سے انہوں نے اپنا ایک ہفتہ وار فیچر " منشی جی " شروع کیا جس میں کسی معاشرتی خرابی یا وقت کے کسی اہم موضوع پر بڑی دلچسپ بحث ہوتی تھی کئی سال یہ سلسلہ چلتا رہا اور نہایت کامیابی کے ساتھ جب پاکستان بن گیا تو " منشی جی " نے " قاضی جی " کا روپ دھار لیا ۔ یہ فیچر لاہور سے شروع ہوا ۔ پھر شوکت صاحب کراچی آگئے تو یہاں سے نشر ہونے لگا اور جب وہ راولپنڈی چلے گئے تو راولپنڈی سے ۔ اس ہفتہ وار فیچر کی روحِ رواں " قاضی جی " تھے جن کا پارٹ خود شوکت صاحب ادا کرتے تھے ۔ مدّتوں تک اکثر سننے والوں کو نہیں معلوم ہوا کہ قاضی جی کی صداکاری کون کرتا ہے ۔ قاضی جی ایک کھوسٹ بڑے میاں تھے جو احمقوں کی جنّت میں رہتے تھے ۔ مگر ہر معاملہ میں اپنے رائے ضرور دیتے تھے ۔ ان کے بھولے منہ سے جو باتیں نکلتی تھیں بھولی بھولی اور مضحکہ خیز ہوتی تھیں ۔ شوکت صاحب کو قاضی جی کی آواز بنانے میں کمال حاصل تھا ۔ اس کمال کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے نقالی پیدا ہوگئے تھے اور محفلوں میں جو

مسخرے نقلیں پیش کرتے تھے ۔ وہ قاضی جی کی نقلیں بھی بنانے اور سنانے لگے تھے ۔ شوکت صاحب نے منشی جی اور قاضی جی کے سینکڑوں مسودے لکھے اور میں نے بھی ان کے بیسیوں براڈ کاسٹ سنے ۔ میں نے ان میں سے کسی ایک کو بھی بھرتی کا فیچر نہیں پایا سب میں ایک ہی جیسی شگفتگی اور تازگی پائی ۔" [1]

شاہد احمد دہلوی کے اس اقتباس سے قاضی جی کی مقبولیت واضح ہوتی ہے ۔ اس کی مقبولیت کی اصل وجہ یہی تھی کہ انہوں نے شروع سے آخر تک اس کا معیار برقرار رکھنے کی کوشش کی اور جو شگفتگی اور تازگی ان کے اولین پروگراموں میں پائی جاتی تھی وہی شگفتگی اور تازگی آخر تک برقرار رہی اس لئے یہ پروگرام عوام اور خواص دونوں میں یکساں مقبول رہا ۔

سیّد انصار ناصری صاحب نے ایک ملاقات میں بتایا کہ لکھنؤ ریڈیو کے آغاز سے ہی شوکت تھانوی نے بچوں کا پروگرام شروع کیا تھا جس میں وہ "چاچا" بنتے تھے وہ اسی طرح بولتے تھے جس طرح قاضی جی بولتے ہیں اس پروگرام میں ہمایوں فر " بدھو میاں " بنتے تھے جو ایک توتلا سا لڑکا ہوتا تھا ۔ جب تک شوکت تھانوی لکھنؤ رہے یہ پروگرام باقاعدگی سے لکھتے بھی رہے اور کرتے بھی رہے اس کی مدت 1939ء سے 1943ء تک بنتی ہے ۔ اس کے علاوہ خطوط کے جوابات بھی لکھا کرتے تھے ۔ مشاعرے کے اعلان کیا کرتے تھے ، اسٹیج سیکرٹری کے فرائض شوکت تھانوی سے بہتر کوئی انجام نہیں دے سکتا تھا ۔ منظوم اعلان کیا کرتے تھے مثلاً جس مصرعِ طرح میں مشاعرہ ہورہا ہے

---

[1] شاہد احمد دہلوی : نقوش شوکت نمبر (شوکت تھانوی) ص: 362 ، 363 ۔

اسی زمین اور اسی بحر میں وہ یہ کہا کرتے تھے کہ ابھی فلاں صاحب اپنے شعر سنا رہے تھے ان کا حاصل غزل شعر یہ تھا اور اب فلاں صاحب تشریف لا رہے ہیں ۔ یہ سب باتیں وہ منظوم کرتے تھے ۔

عورتوں کا پروگرام لکھتے وقت وہ عورتوں کی زبان اور بیگماتی محاورے لکھنے کے ماہر تصور کئے جاتے تھے ۔ اس لئے زیادہ تر پروگرام وہ ہی لکھا کرتے تھے ۔ ضرورت پڑنے پر وہ نسوانی آواز بھی بنالیا کرتے تھے ۔ شوکت تھانوی کے تمام ہم عصر عام طور پر اور سیّد انصار ناصری ، عشرت رحمانی اور سیّد امتیاز علی تاج خاص طور پر متعدّد مضامین میں ان کی صدا کاری کی تعریف کرچکے ہیں ۔ راقم سے انٹرویو کے دوران سیّد انصار ناصری اور عشرت رحمانی نے شوکت تھانوی کی ان صلاحیتوں کا برملا اعتراف کیا ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنی ذہانت سے ہر کام میں کوئی نہ کوئی خوبی پیدا کردیا کرتے تھے ۔

1939ء میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو شوکت تھانوی نے وہاں ملازمت اختیار کرلی ۔ اس ملازمت کے دوران انہوں نے ایک تو سینکڑوں ڈرامے فیچر تحریر کئے دوسرے انہوں نے اداکاری اور صدا کاری کے جوہر بھی دکھائے یہ سلسلہ قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہا اور لاہور ریڈیو اسٹیشن سے " قاضی جی " پیش کرکے اپنی بیش بہا صلاحیتوں کا لوہا منوایا ۔

ریڈیو کے علاوہ شوکت تھانوی فلم سے بھی وابستہ رہے سب سے پہلے وہ 1943ء میں لاہور کی پنچولی آرٹ پکچرز میں بحیثیت مصنّف شامل ہوئے لیکن جلد ہی یہاں کے ماحول سے گھبرا کر ملازمت ترک کردی اور سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن میں ملازمت اختیار کرکے یو ۔ پی چلے گئے ۔ لیکن جب یہ محکمہ ختم ہوگیا تو 1946ء میں پھر پنچولی آرٹ پکچرز میں آ گئے ۔

دل سکھ ایم پنچولی اس کے مالک تھے مسلم ٹاون میں ان کا سٹوڈیو تھا ۔ جہاں آج کل پاسپورٹ آفس بنا ہوا ہے ۔ ایک اسٹوڈیو نہر کے پل پر تھا جسے ملکہ اسٹوڈیو کہا جاتا تھا ۔ ریڈیو کی طرح فلم میں بھی سیّد امتیاز علی تاج کے ساتھ مل کر فلموں کی کہانیاں اور مکالمے لکھتے رہے سیّد امتیاز علی تاج نے اپنے ایک مضمون میں تحریر کہا ہے کہ :

> " ایک فلم کمپنی نے مجھ سے اسکرین پلے لکھنے اور ڈائریکٹ کرنے کی فرمائش کی تو اس کی مکالمہ نویسی میں نے شوکت کے سپرد کردی ۔"[1]

فلم میں شوکت بحیثیت مصنف ہی شامل نہ رہے بلکہ ایک فلم میں اداکاری کر کے لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ۔ " گلنار " فلم میں انہوں نے " نواب دلشاد " کا پارٹ ادا کیا ۔ اس پارٹ کے ذریعے شوکت اسکرین پر پہلی بار آئے ۔ پرانے ایکٹر جب انہیں مکالمہ بولتے ہوئے سنتے تو ان کے لہجہ کی تازگی اور اچھوتے پن کو دیکھ کر جلتے تھے اور انہیں یہ کہہ کر ڈرانے کی کوشش کرتے تھے کہ کمرے میں بیٹھ کر مکالمے بولنا اور بات ہے اور اسٹوڈیو کی چکا چوند روشنی اور کیمرے کے آواز کے سامنے مکالمے بولنا دوسری بات ہے وہاں سب جدّتیں اور نفاستیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں ۔ شوکت تھانوی خاموشی سے ان سب کی باتیں سنتے رہتے تھے سیّد امتیاز علی تاج نے شوکت کے اسکرین پر آنے کی تصویر بہت اچھے الفاظ میں ہمارے سامنے پیش کی ہے :- " سیٹ پر شوکت کا پہلا شاٹ مجھے بخوبی یاد ہے ۔ نہ جانے کہاں سے وہ کس لکھنوی نواب کی تصویر لے آئے تھے ۔ مجھے دکھا

---

[1] سیّد امتیاز علی تاج : نقوش شوکت نمبر ، ستمبر 1963ء ، ص : 507 ۔

کر اپنا میک اپ اس کے مطابق کرایا ۔ مناسب کپڑے کا انگرکھا اپنی نگرانی میں سلوایا ۔ اس کے ساتھ چوڑی دار پاجامہ اور دہلی کی جوتی پہن کر اور سر پر دوپلی ٹوپی رکھ کر سیٹ پر آئے تو جس نے دیکھا یہی کہا کہ عین مین لکھنؤ کے نواب معلوم ہوتے ہیں ۔ سین یہ تھا کہ نواب دلشاد صولت کے ہاں اپنے مصاحبوں سمیت مشاعرے میں آئے ہیں ۔ ڈیوڑھی میں صولت ان کا استقبال کرتا ہے اور اپنے ساتھ دیوان خانے میں لے جاتا ہے جہاں محفل مشاعرہ کا اہتمام ہے ۔ شوکت بڑے اعتماد سے سیٹ پر آئے ۔ روشنیاں ٹھیک جمالی گئیں ۔ ایک دو ریہرسلیں بھی خاطر خواہ ہوگئیں اور اس کے بعد " ٹیک " کا مرحلہ آیا ۔ ریہرسل میں شوکت کی خود اعتمادی دیکھ کر ایک پرانے ایکٹر نے ان کا پہلا شاٹ/ خواب کرنے کے لئے ایک نامناسب حرکت کی شاٹ لینے کے لئے جب میں بلند آواز سے " خاموش رہئیے " کہہ چکا تھا اور شوکت شاٹ دینے کے لئے موڈ میں تیار کھڑے تھے تو وہ صاحب لپک کر ان کے قریب پہنچے اور ان کا دھیان ہٹانے کے لئے ان کے انگرکھے کا دامن ہاتھ میں پکڑ کر کہنے لگے " خوب کپڑا ہے ، کے روپے گز کا ہے " ؟ لیکن ان حضرت کی اس کوشش کے باوجود شوکت نے اپنے پہلے شاٹ میں ایسی ساختہ بے ساختگی سے کام لیا اور تمام تفاصیل کو ایسے مکمل طور پر صحیح ادا کیا کہ شاٹ ختم ہونے پر " کٹ " کی آواز کے ساتھ ہر طرف سے واہ وا اور سبحان اللہ کی آوازیں آنے لگیں ۔ میں نے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے شوکت سے مصافحہ کیا ۔ شوکت اپنی کامیابی سے بے حد خوش ہوئے ۔ پھر تو انہوں نے ایسے بے دھڑک طریقے سے شاٹ دئے گویا انہیں احساس ہی نہ تھا کہ سیٹ پر کیمرہ بھی کام کر رہا ہے ۔"[1]

---

[1] سیّد امتیاز علی تاج : نقوش شوکت نمبر . ستمبر 1963ء ، ص: 508 ۔

بہت سے پرانے لوگوں نے یہ فلم دیکھی ھے ان کا کہنا ھے کہ شوکت تھانوی نے نواب دلشاد کا کردار ایسے کمال سے پیش کیا کہ لکھنوی نوابوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ھے ۔ چال ڈھال ، نشست و برخاست حرکات و سکنات ھر اعتبار سے وہ لکھنوی نواب لگتے تھے ۔ شوکت تھانوی نے اس فلم کے مکالمے بھی تحریر کئے تھے ۔

شوکت تھانوی کے ڈراموں کا فنی تجزیہ :-

عمرانیات کا مسلّمہ اصول ھے کہ نظامِ کہنہ ، نظامِ نو کے لئے ھر حالت میں جگہ خالی کرتا ھے ۔ بعض پرانے معاشرتی و تمدنی قوانین اپنی افادیت کی بنا پر اس فطری تغیّر و تبدّل میں بھی زندہ رھتے ھیں ۔ لیکن اکثر قوانین اس انقلابِ نو کے مطالبات کے پیش نظر اپنی مقصدیت زائل کر دیتے ھیں اور وقت انہیں طاقِ نسیاں پر رکھ دیتا ھے ۔ عہدِ قدیم سے ایسا ھوتا آ رھا ھے اور جب تک معاشرے کا تصور زندہ ھے ایسا ھوتا رھے گا ۔ اس تاریخی "تقدیر" سے زندگی کا کوئی شعبہ اور اس کی کوئی قدر مبرا نہیں ۔ کوئی فن ، کوئی تحریک کوئی رجحان اور کوئی صنعت ایسی نہیں جو متاثر نہ ھوتی ھو ۔ نئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ادب کو نئے نئے تجربات کرنے پڑتے ھیں ۔ اصنافِ سخن بھی اسی تمدنی عمل کی بناء پر مروّج یا متروک ھوتی ھیں ۔ اردو کے معروف ڈراما نگاروں، امانت لکھنوی اور آغا حشر کاشمیری نے اپنے پیش رَو ڈراما نگاروں کے نقشِ پا کو نشانِ منزل نہ سمجھا اور نہ ان کی کورانہ تقلید کی اسی لئے آج ھم بھی ان کی روایات کو توڑنے پر مجبور ھیں ۔ لیکن اتنا ضرور ھے کہ روایاتِ دیرینہ کی شکستگی لاکھ سہل و لازمی سہی مگر ان کے آثار

پر ہی عمارت نو استوار کی جاتی ہے ۔

جدید دور کے یک بابی ڈرامے نے بھی قدیم روایات کے زیرِ اثر اپنی مخصوص شکل اختیار کی ہے ۔ اور آج تقریباً درجن بھر صورتوں میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہے ۔ شوکت تھانوی کا تعلق نشری یک بابی ڈرامے سے رہا ہے۔ انہوں نے 1939 ء میں ریڈیو سے بحیثیت مصنّف اپنا رشتہ قائم کیا تھا اور 1963 ء تک کسی نہ کسی صورت میں یہ رشتہ قائم رکھا ۔ اس لئے شوکت تھانوی کی ڈراما نگاری کا فنی تجزیہ کرتے ہوئے اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کہ ریڈیو ڈراما لکھنے والے کے لئے کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے اور شوکت تھانوی ان باتوں یا اصولوں کا خیال رکھنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ریڈیو ڈراما ، اسٹیج ڈراما ٹیلی ویژن ڈراما اور فلمی ڈراما سے کافی حد تک مختلف ہے ۔ ان سب کا مقصد یقیناً ایک ہی ہوتا ہے ۔ لیکن ریڈیو میں اس مقصد کے حصول کے لئے وسائل قطعی مختلف ہوتے ہیں ۔ ریڈیو ڈراما درحقیقت کانوں سے دیکھا جاتا ہے لیکن یہ ڈراما نگار کی فنی مشاقی ، ژرف نگاہی ، پرواز تخیل کی بلندی اور میکانکی وسائل کے استعمال پر موقوف ہوتا ہے کہ وہ " غائب متکلم " کو " حاضر متکلم " بنا دیتا ہے ۔ ریڈیو ڈرامے کے کردار سامنے ہوتے ہوئے بھی نظر نہیں آتے ان کی صرف آواز ہم تک پہنچتی ہے اور جنبشِ لب نظروں سے اوجھل رہتی ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ ڈرامے کا اسلوب ہی ایسا ہو کہ سامع کی قوت متخیلہ ان کرداروں کو اپنے پہلو میں بیٹھا ہوا محسوس کرے اور جہاں یہ کیفیت پیدا ہوجائے وہیں حقیقی تاثر کے قیام و استحکام کا یقین کہا جا سکتا ہے ۔ ریڈیو کے ڈراما نگار کا امتحان بس یہی ہے کہ اس نے لوگوں کو جو ڈراما دیکھنے کے عادی ہیں انہیں ڈراما سننے پر کیسے راغب کیا اور وہ کس حد تک اس میں کامیاب رہا ۔

شوکت تھانوی کو بحیثیت مصنف ایک کامیاب ڈراما نگار قرار دیا جا سکتا ہے چونکہ انہوں نے ایسے دور میں ڈراما نگاری شروع کی جب تھیٹریکل کمپنیوں کا رواج تھا۔ اس رواج کی وجہ سے انہوں نے ریڈیو پر بھی تھیٹریکل کمپنیوں کا انداز اختیار کیا۔ مون شائن تھیٹریکل کمپنی آف کاٹھ گودام کے سلسلہ کے ڈرامے مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اس قسم کے ڈراموں کی وجہ سے لوگوں نے ریڈیو کے پروگراموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی اور آہستہ آہستہ ریڈیو ڈرامے عوام میں مقبول ہونے لگے۔ " منشی جی " اور " قاضی جی " کے سلسلہ کے جو ڈرامے شوکت تھانوی نے لکھے ہیں ان کی مقبولیت تو کسی سے پوشیدہ نہیں۔ شوکت تھانوی کے تمام ہم عصر ان کی تعریف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مکالمہ ریڈیو ڈرامے کا سب سے زیادہ اہم جزو ہے۔ حسنِ گفتار اور قوتِ ناطقہ انسان کو دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ اس کی معاشرتی زندگی کا انحصار اس رابطۂ تکلم سے ہے جو وہ اپنے دوسرے ہم جنسوں سے استوار کرتا ہے۔ یہ حقیقت بھی ذہن نشین رکھنی چاہئیے کہ مکالمہ باتیں بنانے کا نام نہیں ہے بلکہ بات میں سے بات پیدا کرنا دراصل مکالمہ نگاری ہے جس طرح شعر کہنا ایک آسان کام ہے لیکن ایک عمدہ شعر کہنا کہیں مشکل ہے بعینہٖ مکالمہ گھسیٹنا بہت آسان کام ہے مگر اچھا مکالمہ لکھنا کہیں زیادہ مشکل۔ ڈراما نگاری کی اہم ترین منزل مکالمہ نویسی ہے جہاں ڈراما نگار کو اپنی قوتِ متخیلہ کے ساتھ ساتھ اپنی معلومات اور اکتسابی قابلیت کا مظاہرہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ شوکت تھانوی نے مکالمہ نگاری کرتے وقت مختلف کرداروں میں ہمیشہ حفظِ مراتب کا خیال رکھا ہے۔ ان کے ہر کردار کی زبان اس کے معاشرتی رتبے کو ظاہر کرتی ہے اور اس کی ذہنی سطح کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

شوکت تھانوی کی مکالمہ نویسی میں دو کرداروں کے مابین مکالمے کا تسلسل بہت عمدگی سے نبھانے کی کوشش کی جاتی ہے اس تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے وہ ایک کردار کے مکالمہ کے آخری الفاظ دوسرے کردار کے مکالمہ کے ابتدائی الفاظ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کے مکالموں میں انتقالِ خیال اچانک اور ناگہانی نہیں ہوتا بلکہ وہ تدریجاً نئے خیال کی طرف رجوع کرتے ہیں —— " قاضی جی " حصہ سوم کے ایک ڈرامے سے مختصر اقتباس یہاں پیش کیا جا رہا ہے تا کہ شوکت تھانوی کی اس خصوصیت کا اندازہ ہو سکے۔ موقع یہ ہے کہ قاضی جی سخت برہم اور پریشان گھر میں داخل ہوتے ہیں۔

قاضی جی:- " آنکھ کے اندھے ، نام نین سکھ ۔ اللّٰہ تعالٰی نے بچایا اس
وقت ورنہ کسر ہی کیا رہ گئی تھی آدمی کے بلبلا ہونے میں "۔

بیوی :- آدمی کے بلبلا ہونے میں ؟ بات کیا ہوئی "۔

قاضی جی :- " ارے بھئی وہ ہے نا

آدمی بلبلا ہے پانی کا

تو وہ بات آج پوری ہونے ہی والی تھی ۔ خدا کا شکر ادا کرو ورنہ
آج روانہ ہو گئے تھے تمہارے سہاگ کے ٹھیکیدار صاحب جانبِ ملکِ عدم ۔
اور کل بجائے بقرعید ہونے کے اس گھر میں کہرام مچا ہوتا ۔
یہ سہاگ کی چوڑیاں ٹھنڈی ہو رہی ہوتیں ۔ اس لہریئے دوپٹہ
کی جگہ سفید چادر سر پر ہوتی ۔ ان سرمگیں آنکھوں میں آنسو
ہوتے اور لبِ لعلیں پر آہیں ۔"

اجمل :- " لاحول ولا قوۃ ۔ اس قسم کی باتیں خدا جانے آپ کیونکر کرلیتے ہیں۔"

زبیدہ :- بھائی جان کی ہمیشہ کی عادت ہے اس قسم کی منحوس باتیں کرنے کی "

بیوی :- جلانے کے لئے جان بوجھ کر ایسی باتیں کرتے ہیں اور میں نے کہا وہ بکرا کہاں ہے جو بڑے دعوے سے لینے گئے تھے -" [1]

شوکت تھانوی شاعرانہ ذوق رکھتے ہیں اس لئے وہ جب مکالمہ لکھتے ہیں تو کہیں کہیں اشعار بھی چسپاں کرتے چلے جاتے ہیں - وہ اشعار کو ایسی مناسب جگہ پر استعمال کرتے ہیں کہ ان کا ایک شعر یا ایک مصرع طویل سے طویل تر مکالمے پر بھاری ہوتا ہے - بعض اوقات وہ ان اشعار سے اختصار پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض اوقات بات شروع کرنے کے لئے وہ اشعار کا سہارا لیتے ہیں - جیسے " ملازمہ کی تلاش " میں وہ شعر سے آغاز کرتے ہیں - موقع یہ ہے کہ باورچی خانہ میں کچھ برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ اور چولہا پھونکنے کی مسلسل آوازیں آ رہی ہیں کہ ریاض دور سے گنگناتا ہوا آتا ہے -

ریاض :- (آتے ہوئے) ؎

اس باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

بیوی :- اچھا آپ کی بلا سے ، چلئیے یہی سہی کہ میں نے ہی سب ماماؤں کو نکالا ہے - واہ آپ نے تو جیسے میری چڑھ مقرر کرلی ہے - ایک تو میں اپنا منہ جھلس رہی ہوں یہاں

ریاض :- (بات کاٹ کر) دوسرے یہ کہ آپ ہمدردی سے باز نہیں آتے یہی مطلب ہے نا -

بیوی :- اے میں خوب سمجھتی ہوں آپ کی ہمدردی کو - اللہ نہ کرے کسی کا ایسا ہمدرد ہو ، جیسے آپ میرے ہیں - میری یہ مصیت دیکھ

---

[1] شوکت تھانوی : قاضی جی حصہ سوم مطبوعہ نقوش پریس لاہور ص : 58 ، 59 -

کر مارے ہمدردی کے گانا آپ گا لیتے ہیں - اس وقت میرا ہاتھ جل گیا تھا تو مارے ہمدردی کے ہنسی میں لوٹے جارہے تھے - نوکرانی کا ذکر آیا اور مارے ہمدردی کے طعن طنز شروع کردئیے-" [1]

شوکت تھانوی کے ڈراموں کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کے کردار بہت محدود ہوتے ہیں - وہ کم سے کم کرداروں کے ذریعے اپنی کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں - ان کے کردار مخصوص صفات کے حامل ہوتے ہیں مثال کے طور پر منشی جی اور قاضی جی کے کردار یا پھر قاضی جی میں قاضی جی کی بیوی کا کردار ـــــ ان مخصوص صفات کی بناء پر سامع ان میں دلچسپی لیتا ہے - کرداروں میں نوک جھونک اور اختلافات کی بناء پر تصادم پیدا ہوتا ہے اور اسی تصادم کی وجہ سے ڈراما ارتقائی مراحل طے کرتا ہے - " قاضی جی " میں میاں بیوی کی نوک جھونک اس لئے قابل ستائش ہے کہ یہ ہمارے معاشرے کی ایک سچی تصویر ہوتی ہے -

شوکت تھانوی اپنے کرداروں کی آوازوں میں بھی نمایاں فرق پیدا کرتے ہیں تاکہ آوازوں کے تنوّع سے انہیں شناخت کرنے میں سہولت ہو - وہ اپنے ڈراموں میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ مرد کی آواز کے ساتھ ساتھ نسوانی آواز کو بھی اس میں شامل کیا جائے - ان کے ڈراموں کو دیکھنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ وہ جتنے مرد کردار اپنے ڈرامے میں شامل کرتے ہیں اتنے ہی کردار عورتوں کے بھی ہوتے ہیں اور شاید یہ اسی لئے ہوتے ہیں کہ ان کی آوازوں میں تنوّع پیدا ہو اور انہیں آسانی سے شناخت کیا جاسکے - قاضی جی اور منشی جی کے سلسلہ کے تمام ڈراموں میں زیادہ سے زیادہ چار کردار

---

[1] شوکت تھانوی : " سنی سنائی " (ملازمہ کی تلاش) ، مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور ص: 167 ، 169 -

پیش کئے جاتے ہیں اور ان چاروں کرداروں کی مخصوص صفات ہیں ۔

ریڈیو کے لئے بالعموم مختصر ڈرامے کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے شوکت تھانوی ہمیشہ اختصار پسندی سے کام لیتے ہیں ۔ مقررہ وقت میں تمام واقعات کو سمیٹنا اچھا خاصا مشکل کام ہے ۔ ڈراما نگار کو یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کے ڈرامے کو ہر قسم کے لوگ اور ہر ذہنی معیار کے آدمی پسند کریں ۔ اس لئے وہ نہ صرف اسے دلچسپ بلکہ ہر آدمی کے لئے دلچسپ بنانے کی کوشش سے کبھی غافل نہیں ہوئے ۔ شوکت تھانوی کے ڈرامے ہر مکتبۂ فکر اور ہر عمر کے لوگوں میں مقبول ہیں ۔ شوکت تھانوی کے زیادہ تر ریڈیائی ڈرامے تیس منٹ یعنی آدھ گھنٹے کے ہوتے ہیں ۔ اس آدھ گھنٹے میں ہر شخص کے لئے خوشی کا سامان فراہم کرنا اور اسے زندگی سے قریب تر بنا کر زندگی کے مسائل بیان کرنے میں شوکت تھانوی نے گویا مہارت حاصل کرلی تھی ۔

شوکت تھانوی کے بیشتر ڈرامے کسی ایک بنیادی خیال کے گرد گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ ان کا یہ خیال چند الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے مگر اس کی گہرائی اور گیرائی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اپنی ڈرامائی پیش کش کے لئے سینکڑوں ممکنہ واقعات کو اپنے حلقے میں سمیٹ سکتا ہے ۔ شوکت تھانوی کے ڈراموں کی کامیابی کا راز اس کے بنیادی خیال کی نفاست ، رفعت ، جامعیت اور کشش میں پوشیدہ ہوتا ہے ۔ اس خیال کو تحریک مشاہدے سے بھی ملتی ہے اور مطالعے سے بھی ۔ کوئی حیرت افزا منظر ، کوئی دل خوش کن جذبہ کوئی ہیبت ناک حادثہ ، کوئی تلخ تجربہ ، کوئی خیال افروز رجحان ، کوئی پرکشش روایت ، غرض ہر وہ ذہنی کیفیت جو سوچنے ، سمجھنے اور محسوس کرنے پر انسان کو مجبور کرے ، ڈرامائی مواد سے لبریز ہوتی ہے ۔ اس زاویے سے دیکھا

جائے تو ایک حساس ڈراما نگار کو قدم قدم پر ایسی ترغیبات ملتی ہیں جنہیں ڈرامے کا قالب دیا جاسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ شوکت تھانوی کے بیشتر ڈرامے زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔

بنیادی خیال متعین کرنے کے بعد ڈراما نگار اس کی فنّی صراحت کے لئے ایک کہانی تراشتا ہے۔ مختلف کرداروں کی آمد و شد سے اس میں حرکت پیدا کرتا ہے۔ کہانی کو متحرک کرنے کے لئے مفروضی امکانات پر غور کرتا ہے اور ایک مبصر کی نظرِ انتخاب سے زیادہ منطقی ، نفسیاتی اور ممکنہ امکانات کو ایک دوسرے سے اس خوبی سے منسلک کرتا ہے کہ کہانی کا تسلسل قائم ہوجاتا ہے۔ شوکت تھانوی صراحتِ خیال اور مفروضی امکانات کے لئے اپنی قوتِ متخیلہ سے کام لے کر بات میں سے بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور واقعات میں سے واقعات نکال کر تسلسل برقرار رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں واقعات کچھ اس مناسبت سے سلسلہ وار سامنے آتے ہیں کہ ڈراما خود پخود تدریجاً تعمیر ہوتا جاتا ہے۔ شوکت تھانوی وقت کے عنصر کو مناسب اہمیت دیتے ہوئے واقعات کی روانی پر خاص توجہ دیتے ہیں ان کے یہاں تسلسلِ واقعات غیر معمولی طور پر "وحدتِ مکان" کی پابند ہے۔ بقول پروفیسر فصیح احمد صدیقی "اسی صراحت خیال یا ڈرامے کے عملِ تعمیر کو "پلاٹ کہا جاتا ہے۔"[1]

شوکت تھانوی کے بیشتر ڈراموں میں مزاحیہ انداز نظر آتا ہے۔ وہ سنجیدہ مسائل کو بھی ایسے شگفتہ انداز میں بیان کرتے ہیں کہ سامع بہت دیر تک ان کے جملوں کو دہراتا رہتا ہے اور ان سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔

---

[1] پروفیسر فصیح احمد صدیقی : اردو یک بابی ڈراما سیریز ، 4 - مطبوعہ رحیمی پریس - بمبئی ، ص: 17 -

انہوں نے دو کردار "منشی جی" اور "قاضی جی" تخلیق کئے ہیں جو صرف ہنسی پیدا کرنے کے لئے ایک خاص انداز اختیار کرتے ہیں۔ "منشی جی" لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے زیادہ دیر تک نشر نہیں ہو سکا۔ چونکہ شوکت تھانوی لکھنؤ چھوڑ کر لاہور آ گئے تھے لیکن "قاضی جی" کا سلسلہ 1947ء سے 1963ء تک کبھی لاہور ریڈیو اسٹیشن سے، کبھی کراچی سے اور کبھی راولپنڈی سے متواتر نشر ہوتا رہا۔ یہ کردار دوسروں کی ہنسی اور مذاق اڑا کر مزاح پیدا نہیں کرتا بلکہ خود اپنی ظرافت کا نشانہ بنتا ہے۔ مضحکہ خیز حرکتوں اور اپنی بات کی تردید کر کے لوگوں کو ہنسنے کا موقع فراہم کرتا ہے یہاں بطور مثال ایک ڈرامے کا اقتباس بے محل نہیں ہوگا: جمیل دروازے پر قاضی جی کو آواز دیتا ہے تو قاضی جی فرماتے ہیں۔

قاضی جی: "لاحول ولا قوۃ" کس نامناسب وقت تشریف لائے ہیں جبکہ میں خضاب لگا رہا ہوں اور کہیں یہ کمبخت خیراتن کہہ نہ دے کہ میں خضاب لگا رہا ہوں۔"

زبیدہ:- تو اس میں نقصان ہی کیا ہے۔ لگا رہے ہیں خضاب تو پھر؟!

خیراتن:- (آتے ہوئے) "وہ آئے ہیں۔ اے کیا نام ہے ان کا۔ تو یہ ہے بھلا سا نام ہے۔ اے وہی پڑوس والے جمیل میاں۔"

قاضی جی:- "تو کیا کہہ دیا تم نے۔ کہیں یہ تو نہیں کہہ دیا کہ میں بیٹھا ہوا خضاب لگا رہا ہوں"

خیراتن:- "اے تو اور کیا کہتی سرکار۔ مجھ سے پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ میاں خضاب لگا رہے ہیں۔"

قاضی جی:- "مجھ کو پہلے ہی سے معلوم تھا، مجھ کو آپ کی عقل مندی سے یہی امید تھی۔ تمام دنیا میں یہ کہاوت مشہور ہے کہ قاضی کے

گھر کے چوہے بھی سیانے اور ہمارے یہاں کی اس چوہیا کا حال یہ ہے کہ جا کے آپ فرما آئیں کہ میں خضاب لگا رہا ہوں ۔ برسوں کی بنی ہوئی بات پر پانی پھیر دیا ۔"

بیوی :۔ " تو کیا اب وہ باہر کھڑے ہوئے سوکھتے رہیں گے "

قاضی جی :۔ " (آواز دے کر) آجاؤ بھئی جمیل میاں ۔ اب سینکڑوں بہانے کرنا پڑیں گے اس خضاب کے متعلق ۔ اخاہ ۔ یعنی آج بجائے کھڑکی کے صدر دروازے سے تشریف آوری ہو رہی ہے "

جمیل :۔ " آج تو آپ خضاب لگا رہے ہیں ۔ خیریت تو ہے کیا کہیں جانا ہے "

قاضی جی :۔ " جانا کہاں ہوتا ۔ خضاب تو میں بچپن سے لگاتا چلا آ رہا ہوں ۔ اب کچھ عادت سی پڑ گئی ہے ۔ بھئی یہ ہمارے خاندان کی خصوصیات میں سے ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے خضاب لگاتے ہیں ۔ بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں پیدائشی طور پر بچوں کے بال سفید ہوتے ہیں ۔ اس پوری نسل پر کچھ ایسا نزلہ گرا ہے کہ بچہ پیدا ہوا اور دائی نے اس کے خضاب لگانا شروع کیا ۔ آپ سمجھ رہے ہوں گے کم میں گویا عمر کی وجہ سے خضاب لگا رہا ہوں ۔ جی نہیں ۔ اس کا کوئی تعلق گویا عمر یعنی بڑھاپے وغیرہ سے نہیں ہے ۔ یعنی جب میں چھوٹا سا تھا تو میرے لئے دودھ کی شیشی اور خضاب کی شیشی ساتھ ساتھ آیا کرتی تھی ۔"

جمیل :۔ " حیرت ہے صاحب ۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ یہ زبیدہ بہن بھی گویا خضاب لگاتی ہیں "

قاضی جی :۔ کون زبیدہ ۔ یہ تو ۔ یہ تو ۔ اوہو ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گویا آپ بالکل نہیں سمجھے یہ تو میری بہن ہیں نا ۔ گویا عورت ہیں یہ — ہمارے خاندان کی عورتیں اس مرض سے محفوظ ہیں ۔ لڑکی

پیدا ہوگی تو اچھی خاصی ۔ نہ بال سفید ہوں گے نہ کچھ اور ، لڑکا پیدا ہوگا تو معلوم ہوگا بگلے کا بچہ سن کی طرح سفید ۔ اب آپ سے کیا کہوں جمیل میاں کہ کیا عالم تھا میرے ان بالوں کا ۔ اس قدر گھن تھا ان بالوں میں اور اس قدر موٹا تھا میرا بال کہ جس وقت میں سو کر اٹھتا تھا معلوم ہوتا تھا کہ میرے جسم پر کسی نے راتوں رات کسی سیاہ بھیڑ کا سر لگا دیا ہے ۔ یہ تو خضاب نے چوپٹ کر کے رکھ دیا میرے بالوں کو ورنہ اس قدر سیاہ تھا میرا بال کہ ۔"

جمیل :۔ " سیاہ تھا بال ؟ مگر آپ تو کہہ رہے تھے پیدائشی طور پر سفید تھے بال "

(بیوی اور زبیدہ ہنستی ہیں) [1]

قاضی جی پہلے کہتے ہیں کہ ان کے بال پیدائشی طور پر سفید تھے اس لئے وہ بچپن سے ہی خضاب لگا رہے ہیں ۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ خود ہی کہنے لگے کہ میرے بال نہایت سیاہ تھے ۔ خضاب نے انہیں خراب کردیا ۔ سننے والا اس قسم کی شخصیت پر کہ جسے چند لمحے کہی ہوئی بات بھی یاد نہیں رہتی ، سوائے ہنسنے کے اور کیا کرسکتا ہے ۔

شوکت تھانوی نے اپنے ڈراموں میں فرسودہ روایات ، ہوس پرستی ، بے دردی و بے رحمی اور نادانی و جہالت پر موقع و محل کی مناسبت سے طنز کرنے کی کوشش کی ہے ۔ ان کا طنز اتنا ثقیل اور گراں بار نہیں ہوتا کہ اس

---

[1] شوکت تھانوی : قاضی جی حصہ دوم ، مطبوعہ ادارہ فروغ اردو لاہور ، ص: 111 تا 114 ۔

میں کوئی اخلاقی قدر باقی نہ رہے بلکہ وہ اتنے شگفتہ انداز میں طنز کرتے ہیں کہ سننے والا مسکرانے پر مجبور ہوجاتا ہے ۔ ان کا طنز کسی ایک شخص پر نہیں ہوتا بلکہ پورے معاشرے اور تہذیب کو وہ اپنے طنز کا شکار بناتے ہیں اور اس طنز سے اس تہذیب یا معاشرے کی تکذیب کرنا مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس کی اصلاح مقصود ہوتی ہے ۔" **برلن کا اسپتال** " میں وہ بظاہر ڈاکٹروں پر طنز کر رہے ہیں لیکن باطن میں وہ وہاں کے حکمرانوں اور حکمران پارٹی کے افراد پر طنز کر رہے ہیں کہ وہ کس طرح لوگوں کے ذہن بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں اور جس شخص کا ذہن ان کی سوچ کو قبول نہیں کرتا اسے کس قسم کی اذیتیں پہنچائی جا رہی ہیں :

ڈاکٹر :- اس کو کیا ہوا ہے ؟

بوائے :- حضور اس کی آنکھیں خراب ہیں ۔

دوسرا مریض: میری آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں ۔ میں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں ۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ اسپتال ہے ۔ یہ گھڑی لگی ہے ۔ اس میں آٹھ بج کر 3 منٹ ہوئے ہیں ۔ یہ ڈاکٹر ہیں ۔ ان کا یہ چشمہ ہے ۔

ڈاکٹر : پھر تمہاری آنکھ میں اور کیا خرابی ہے ؟

دوسرا مریض: کوئی خرابی نہیں میری آنکھوں میں اچھی خاصی روشنی ہے ۔ مجھے کبھی چشمہ تک کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ میں فاصلے کی چیزیں بھی دیکھ سکتا ہوں اور نزدیک کی بھی ۔ مہین سے مہین چھاپے کی عبارت پڑھ سکتا ہوں ۔

ڈاکٹر : یہ تو سب ٹھیک ہے مگر پھر کیا بات ہے ؟

بوائے : حضور رپورٹ یہ ہے کہ اس نے دشمنوں کے فوجی افسر کی تصویر دیکھ کر کہا تھا کہ یہ صورت سے شریف اور راہِ راست پر معلوم ہوتا

اور ہمارے کمانڈر کی تصویر دیکھ کر کہا صورت سے ظلم برستا ہے ۔

ڈاکٹر : او ہو ۔ یہ تو بہت بڑی آنکھوں کی بیماری ہے ۔ آنکھوں کی پتلیوں نے غلط چیزیں دیکھنا شروع کردی ہیں اور یہ اندھے ہوجانے کی علامت ہے ۔ تمہاری آنکھیں کبھی دکھنے آئی تھیں ۔

دوسرا مریض: بچپن کے علاوہ کبھی نہیں ۔

ڈاکٹر : کسی غیر ملکی کوئلہ کی کان کا کوئلہ ریل وغیرہ میں تمہاری آنکھ کے اندر کبھی پڑا ۔

دوسرا مریض: کبھی نہیں — اور اگر کبھی پڑا ہو تو یاد نہیں ۔

ڈاکٹر : تمہارے سر میں بھی درد ہوتا ہے ؟

دوسرا مریض: عام طور پر نہیں ۔

ڈاکٹر : اچھا اپنی زبان دکھاؤ ۔ اور ۔ اور ۔ ٹھیک ہے ۔
کیا تم نے اپنے افسر کی تصویر دیکھ کر ظالم سمجھا ؟

دوسرا مریض: میں اس کو ظالم سمجھتا ہوں ۔ وہ قوم کو تباہی کی طرف لے جانے والوں میں سے ایک ہے ۔ وہ امن و امان کے دشمنوں کا ساتھی ہے اس کی تصویر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے ۔

ڈاکٹر : اس کا مطلب یہ ہوا کہ جیل کی رپورٹ غلط ہے ۔ تمہاری صرف آنکھیں ہی نہیں دل و دماغ بھی خراب ہے ۔ آنکھوں کا صرف ایکسس (AXIS) بدل گیا ہے ۔ مگر دماغ الٹی بات سمجھتا ہے اور دل بھی کمزور ہے ۔

(نرس دوڑی ہوئی آئی ہے)

نرس : وہ مریض جو ابھی پولیس لائی تھی ۔ لیٹنے سے انکار کرتا ہے اور وارڈ کے دوسرے مریضوں کو لیکچر دے کر اپنے جراثیم پھیلا رہا ہے ۔

ڈاکٹر : لیکچر دیتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی زبان پر بھی زہر پھیل گیا ہے اس کو آپریشن تھیٹر میں لے چلو ۔ میں اس مریض

کو دیکھ کر ابھی آتا ہوں ۔

دوسرا مریض: کیا اس کی زبان کاٹی جائے گی ۔

ڈاکٹر : اس کی جان بچانے کے لئے جسم کے بیکار اور زہریلے حصہ کو کاٹ ہی ڈالنا پڑے گا ۔

دوسرا مریض: بیچارے کی زبان ۔ اس کی زبان میں کیا خرابی ہے ؟

ڈاکٹر: نازی پارٹی کے خلاف لیکچر دیتا ہے اس سے پڑھ کر اور کیا خرابی ہوگی اگر اس کی زبان فوراً نہ کاٹی گئی تو نہ صرف وہ تباہ ہوجائے گا بلکہ اس کی چھوت بہت سے تندرستوں کی صحت خراب کردے گی ۔ اگر کسی مریض کا ہاتھ سڑجائے تو باقی جسم کو بچانے کے لئے ہاتھ کاٹ ڈالنا چاہئیے اسی طرح اس کی زبان کاٹنا پڑے گی ۔

دوسرا مریض: تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری یہ ظالمانہ چارہ گری سچ بولنے والوں کو سچائی سے انصاف پسندی کے حامیوں کو انصاف سے اور امن پسندی کے طرفداروں کو امن سے باز رکھ سکے گی ۔

ڈاکٹر : یہ سب بہت خطرناک بیماریاں ہیں ۔ ہم نے ان بیماریوں کی روک تھام کے لئے نئے نئے آپریشن اور عجیب و غریب انجکشن اور دوائیں ایجاد کرلی ہیں جن کا بہت جلد اور بہت اچھا اثر مریض پر ہوتا ہے ۔ سچ بولنے والے بہت سے مریض جھوٹ کے عادی ہوگئے ۔ ایک معمولی انجکشن نے بہت سے امیدواروں کو ایمانداری کا دشمن بنا دیا ۔ بہت سے انصاف پسندی کے مریض ہماری دوا کی دو تین خوراکوں کے بعد انصاف کے نام کو بھول گئے اور سب سے برا اور عام مرض انسانیت تو ہم نے اینٹی ہیومن ویکسی نیشن (ANTI HUMAN VACINATION) یعنی انسانیت کش ٹیکہ سے ایسا کھویا ہے کہ

ہماری نازی فوج میں یہ مرض نام کو بھی نہیں۔"[1]

شوکت تھانوی اپنے ڈراموں میں معاشرتی مسائل زیر بحث لا کر ان مسائل کو ختم کرنے کے آرزو مند نظر آتے ہیں۔ لکھنؤ ریڈیو سے انہوں نے جتنے ڈرامے پیش کئے ان میں جہاں تہاں ان مسائل کی جھلک نظر آتی ہے اصل مقصد تفریح طبع تھا لیکن جب لاہور ریڈیو سے "پاکستان ہمارا" اور "قاضی جی" کے سلسلہ کے ڈرامے پیش کئے تو ان کے مقاصد واضح تھے۔ مہاجرین کا مورال بلند کیا جائے، ان کی مدد کی جائے، ان کی قربانیوں کا احساس کیا جائے اور اپنے نوزائیدہ ملک کی ترقی و ترویج کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ قاضی جی میں رفتہ رفتہ مسائل نے ایک پھیلاؤ اختیار کرلیا۔ چور بازاری، رشوت، اقربا پروری اور سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی کے اہم مسائل کو بھی قابل توجہ سمجھا جانے لگا۔ غرض شوکت تھانوی نے اس ڈرامے سے قوم کی اصلاح کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ایک ڈرامے میں "قاضی جی" کی بیوی اور بہن گرل گائیڈ کی تحریک میں شامل ہونے کے لئے "قاضی جی" سے اجازت طلب کرتی ہیں تو قاضی جی اسے ناگوار باتیں کہہ کر ٹالنا چاہتے ہیں۔

نجمہ : "سراج صاحب آپ سمجھائیے نا کہ یہ ناگوار ہونے کی بات نہیں ہے"۔

سراج : قصہ دراصل یہی ہے کہ بھائی صاحب آپ کو معلوم نہیں ہے کہ یہ کتنی مفید تحریک ہے۔

زبیدہ : "ابھی پچھلے فسادات میں عورتوں کو جو مصیبتیں اٹھانا پڑی ہیں ان کے بعد بھی اگر آنکھ نہ کھلے تو تعجب ہے۔"

قاضی جی : "تم نہیں مانوگی۔ تمہارا بولنا نہایت ضروری ہے"

---

[1] شوکت تھانوی : "سنی سنائی" (برلن کا اسپتال) مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور، ص: 32 تا 34۔

بیوی : " کیوں نہ بولیں وہ ۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے ۔ ٹھیک تو کہہ رہی ہیں ۔ آخر کب تک عورتوں کو چھوٹی موٹی بنا کر رکھا جائے گا ۔"

سراج : " چھوٹی موٹی کا سوال نہیں بلکہ غور تو یہ کرنا ہے کہ ان ہی عورتوں کی آغوش میں ہماری وہ نسل پرورش پائے گی جس کو پاکستان کی ذمہ داریاں سنبھالنا ہیں اور جس کو اس آزاد مملکت کی آزادی کو برقرار رکھنا ہے ۔"

قاضی جی: " صاحب یہ نہایت غلط بات ہے کہ جہاں میں نے کسی بات پر کوئی اعتراض کیا آپ لوگ پاکستان کا نام لے کر گویا زبان پر قفل لگانے کی کوشش شروع کردیتے ہیں ۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ چونکہ عورتوں کی گود میں ان بچوں کو پلنا ہے جو آئندہ چل کر پاکستان کے محافظ ہوں گے ۔ لہٰذا عورتوں کو چاہئیے کہ وہ کندھے پر بندوق رکھے اور ڈبل مارچ کرتی پھریں ۔ نہ گھر داری سے مطلب رکھیں ، نہ چولہے ہانڈی سے ، نہ سینے پرونے سے بلکہ وہ تو بن جائیں سپاہی اور مرد بیٹھ کر چولہا پھونکیں اور روٹیاں ٹھونکیں ۔"[1]

اس ڈرامے میں شوکت تھانوی عورتوں کی توجہ اس جانب مبذول کروانا چاہتے ہیں کہ انہیں گھر داری کا خیال رکھنا چاہئیے ۔ ہماری عورتوں کو ہنڈیا روٹی اور سینے پرونے کے کام آنے چاہئیں اس کے بعد اگر وقت ملے تو وہ گرل گائیڈ یا اس قسم کی دوسری تحریکوں میں شمولیت اختیار کرسکتی ہیں ۔ وہ خواتین جو ان تحریکوں کی وجہ سے اپنے گھر کو بھول جاتی ہیں ، اچھا نہیں کرتیں ۔

---

[1] شوکت تھانوی : قاضی جی حصہ سوم مطبوعہ نقوش پریس لاہور ، ص: 133 ، 134 ۔

مختصر یہ کہ قیام پاکستان کے بعد " قاضی جی " کا جو سلسلہ ریڈیو پاکستان کے مختلف اسٹیشنوں سے پیش کیا وہ ہر لحاظ سے ان کے فن کی پختگی کا مظہر ہے - اس سلسلہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے اس میں کئی سال تک پاکستان کے اہم مسائل پر بڑے واضح انداز میں اظہارِ خیال کیا گیا - اس مسئلہ کے اچھے اور برے دونوں پہلو سامنے آئے اور بالآخر غلبہ اچھے پہلوؤں کا ہوا -

ان ڈراموں کی ایک اور خصوصیت فقرے بازی بھی ہے اس فقرے بازی سے شوکت تھانوی نے بیک وقت اصلاح اور تفریح دونوں کے کام لئے ہیں - انہوں نے ڈرامے اتنے زیادہ لکھے ہیں کہ بہت سے فقرے اتنے زیادہ دہرائے گئے ہیں کہ یہ ان کا تکیۂ کلام معلوم ہونے لگتے ہیں -

شوکت تھانوی کے عہد میں اور بھی بہت سے لوگ ڈرامے لکھ رہے تھے مثلاً عشرت رحمانی ، انصار ناصری ، سیّد امتیاز علی تاج ، مرزا ادیب ، اشفاق احمد وغیرہ - ان میں امتیاز علی تاج کی عظمت کے تو شوکت تھانوی خود بھی قائل تھے اس لئے بعض مواقع پر انہوں نے سیّد امتیاز علی تاج کے معاون کی حیثیت سے بھی کام کیا - سیّد امتیاز علی تاج کے بعد شوکت تھانوی کا نمبر آتا ہے - ریڈیو ڈرامے کی دنیا میں برسوں ان کی ہر دلعزیزی قائم رہی اور ریڈیو ڈرامے کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ محفوظ اور تابندہ رہے گا -

ساتواں باب

(i) خاکہ نگاری

(ii) آپ بیتی

خاکہ انگریزی اِصطلاح " سکیچ (SKETCH) کا متبادل ہے - لفظی مفہوم میں " خاکہ " کسی موضوع کے ابتدائی یا بنیادی نقوش کو کہتے ہیں جس کی مدد سے کسی شے کی مکمل تصویر کشی ممکن ہو لیکن ادب اور فن میں یہ اِصطلاح مختلف مفہوم رکھتی ہے - خاکہ کی اِصطلاح مصوّری میں بھی رائج ہے - مصوّر اگر کسی شخص کی مکمل اور بعینہٖ تصویر پیش کرے تو اسے پورٹریٹ کہتے ہیں اس کے برخلاف اگر چند آڑے ترچھے خطوط کی مدد سے اس شخص کے خط و خال کی جھلک دکھا دے تو وہ اسکیچ کہلائے گا - ادب میں یہی فرق سوانح اور خاکہ میں پایا جاتا ہے - بقول ڈاکٹر صابرہ سعید " سوانح نگار کی شخص کے حالاتِ زندگی کے جزئیات تفصیل کے ساتھ پیش کرتا ہے جب کہ خاکہ نگار کسی فرد کی زندگی اور کردار کی چند جھلکیاں پیش کر دیتا ہے - ادبی خاکے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کسی حقیقی شخصیت ہی کو اپنا موضوع بنائے - خیالی شخصیت بھی خاکے کا موضوع ہوسکتی ہے -" [1]

شوکت تھانوی نے صرف شخصی خاکے ہی تحریر کئے ہیں اس لئے خیالی خاکے ہماری بحث کے دائرے سے خارج ہیں - خاکے کی پہلی خصوصیت اس کا اختصار ہے - اختصار سے مراد ایسی کفایتِ الفاظ ہے جس میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کا عمل ہو - خاکہ نگاری کرتے وقت واقعات اس قدر اختصار کے ساتھ اور شخصیت اس قدر جامع پیش کرنی چاہئیے کہ قاری کا ذہن اس کا بھرپور تاثر قبول کرے اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو - نورالحسن ہاشمی

---

[1] ڈاکٹر صابرہ سعید : اردو ادب میں خاکہ نگاری صفحہ 59 - 60 ، دسمبر 1978ء ، مکتبۂ شعر و حکمت ، حیدر آباد -

لکھتے ہیں : " کسی زندگی کا ایسا خاکہ یا موقع پیش کرنا جو مختصر بھی ہو اور جامع بھی یعنی مختصر اتنا ہو کہ ہم اسے ایک نشست میں پڑھ ڈالیں اور جامع ایسا ہو کہ اس کی شخصیت کا کوئی پہلو نظر انداز بھی نہ ہونے پائے ۔ اگر اس پر انداز بھی دلچسپ ہو تو یہ خاکہ نگاری بہت کامیاب ہوجاتی ہے ۔" [1]

خاکہ نگاری میں کردار نگاری کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے ۔ جس شخصیت کو خاکہ نگاری کے لئے منتخب کیا جاتا ہے وہ انفرادی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اس لئے خاکہ نگار کا اہم منصب ان خصوصیات کو اجاگر کرنا ہوتا ہے ۔ اس اعتبار سے کردار ، خاکے کا ایسا بنیادی جزو ہوتا ہے جس کے بغیر خاکہ کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا ۔ عمدہ کردار نگاری کے لئے خاکہ نگار کا نفسیات داں ہونا ضروری ہے تا کہ وہ شخصیت کی حرکات و سکنات اور عادات و اطوار کو کوئی مفہوم دے سکے اور اپنے موضوع کی ایک ایسی تصویر پیش کرے جو زندگی سے قریب تر ہو ۔

خاکہ نگار کے لئے ایک اچھا واقعہ نگار ہونا ضروری ہے ۔ خاکہ کی دلچسپی کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہوتا ہے کہ واقعات کو کس ڈھنگ سے بیان کیا گیا ہے ۔ بیان ایسا ہونا چاہئیے کہ پڑھنے والے کو واقعہ اپنی نظروں کے سامنے ہوتا ہوا دکھائی دے ۔

دیگر اصنافِ ادب کی طرح خاکہ نگار کے اظہار کا ذریعہ بھی زبان ہوتی ہے اور اس کے سہارے کے بغیر خاکہ نگاری ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ

---

[1] بحوالہ اردو ادب میں خاکہ نگاری ،
صفحہ 43 ـ 44 ، 1979 ء ، مکتبۂ شعر و حکمت ، حیدرآباد ۔

سکتی چونکہ یہ بیانیہ تحریر کا نمونہ ہے اس لئے اس میں بیان کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے ۔ بیان کی صناعی کے ذریعے ہی خاکہ نگار کسی شخصیت کو اس کے معائب و محاسن کے ساتھ لفظوں میں اسیر کر سکتا ہے ۔ شوکت تھانوی کی خاکہ نگاری میں زبان و بیان کو بہت اہمیت حاصل ہے وہ حالات و واقعات اور کردار کو حقیقت سے قریب بلکہ عین حقیقت کے مماثل بنانے کے لئے زبان و بیان سے کام لیتے ہیں ۔

شوکت تھانوی کی دو کتابیں " قاعدہ بے قاعدہ " اور " شیش محل " شخصیتوں کے خاکوں کے مجموعے ہیں ۔ " شیش محل " کے خاکوں کے بارے میں شوکت تھانوی کی اپنی رائے یہ ہے کہ :

> " یہ تذکرہ کسی مورخ کے کام آنے والی چیز نہیں ہے ۔ اس لئے کہ ادبی حالات سے زیادہ نجی حالات پیش کئے گئے ہیں اور وہ بھی ایسے کہ ان کے غلط ہونے کا احتمال صحیح ہونے سے کہیں زیادہ ہے اس لئے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ میرا ذاتی مطالعہ ہے اور مجھ کو اعتراف ہے کہ میں نے اپنے مطالعہ کو ہمیشہ غیر مستند سمجھا ہے ۔" [1]

شوکت تھانوی نے انکساری سے کام لیتے ہوئے اپنے ذاتی مطالعہ کو غیر مستند قرار دیا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ شوکت تھانوی کو صحافت ، ریڈیو اور شعر و شاعری کی وجہ سے تقریباً نصف صدی تک بھارت اور پاکستان کے

---

[1] شوکت تھانوی: شیش محل صفحہ 9 ، بارِ اول اردو بکسٹال ، لوہاری دروازہ ، لاہور ۔

بے شمار ادیبوں اور شاعروں کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اس بے تکلفی کی بنا پر شخصیت کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں سے واقف ہوئے ۔ دراصل " شیش محل " اور " قاعدہ بے قاعدہ " کے تقریباً ڈیڑھ سو خاکے مراسم اور روابط کی مختلف شکلوں کے دلکش مرقعے ہیں ۔ شوکت تھانوی نے ادیبوں ، شاعروں ، صحافیوں ، ریڈیو آرٹسٹوں اور پبلشروں ، غرض اپنے ہر طرح کے ملنے والے اشخاص کا خاکہ لکھنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے مولانا عبد الماجد دریا بادی کو لکھنا پڑا کہ:

> " یہ قلمی نگار خانہ ، یوں کہئیے کہ ایک عجائب خانہ ہے ، بعض ان مشاہیر میں اتنے مشہور کہ ان کا تعارف بھی ان کی توہین ۔ بعض ایسے گمنام کہ اتنی تعریف و تعارف کے بعد بھی مجہول کے مجہول ۔ ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی ، بوڑھے بھی ہیں اور جوان بھی ، بعض ایسے ہیں جو سب کچھ ہیں ۔ بعض ایسے ہیں جو کچھ بھی نہیں ۔ ایسے بھی جن کا پیچھا شہرت نہیں چھوڑتی ، ایسے بھی جو شہرت کی تلاش میں دوڑتے دوڑتے تھک چکے ہیں ۔ "[1]

شوکت تھانوی کے حلقۂ احباب میں معروف اور غیر معروف ہر طرح کے لوگ شامل تھے اس لئے ان کے خاکوں کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے خاکہ ایک طرف تو ادیبوں اور شاعروں کی نجی زندگی اور ادبی حیثیت کا تعارف ہیں اور دوسری طرف بہ حیثیتِ مجموعی خود شوکت تھانوی کی پسند اور ناپسند کے معیاروں کے آئینے ہیں ۔ ان خاکوں اور مرقعوں میں جا بجا محبت شفقت اور ہمدردی کا رنگ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے ۔ شوکت تھانوی کی محبت

---

[1] ماخوذ از نقوش لاہور شوکت نمبر ، صفحہ 38 ۔

کے یہ رنگ ان کے خاکوں میں دیکھئیے ۔ ایک خاکہ میں سیّد امتیاز علی تاج کے بارے میں لکھتے ہیں : " امتیاز صاحب ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں ۔ بڑی میٹھی زبان ہے اور بڑا دل آویز اندازِ گفتگو ۔ ہر چند کہ خالص تجارتی آدمی ہیں مگر صورت سے بالکل ساہوکار نظر نہیں آتے اور نہ ایک خرانٹ قسم کے سرمایہ دار بلکہ تجارت بھی تاجر بن کر نہیں ادیب ہی بن کر کرتے ہیں البتہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ خوش قسمت ادیبوں میں ہیں جو ادب کی گود میں پل کر ادبی فضاؤں میں پروان چڑھے ہیں اور ان کو ہوش کی آنکھیں کھول کر اپنے لئے میدانِ عمل سجا سجایا ۔ بنا بنایا مل گیا تھا ۔ دوسرے ادیب خود کنواں کھود کر پانی پیتے تھے یہ پانی پی کر اگر دل چاہتا ہے تو کنواں کھود لیتے ہیں ورنہ ایسے پیاسے نہیں ہیں کہ کنواں ضرور ہی کھودیں ۔" [1]

علامہ اقبال کے خاکہ میں محبّت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ " ان سے ملنے کے بعد ان کی وہ عظمت جو کتابوں سے حاصل ہوئی تھی میرے دل میں دوگنی ہوگئی ۔ لکھنؤ جا کر اپنی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ گہرستان میں نے بھیجا ۔ اس کو پڑھ کر جو خط مجھے لکھا ہے اس سے اس عظیم المرتبت شخصیت کی رفعتوں کا اندازہ ہوتا ہے ۔ پھر کچھ دن خط و کتابت رہی مگر افسوس کہ ان کا وقت آچکا تھا اور میں نے ملنے میں بہت دیر کی تھی ۔ پھر دوبارہ نہ مل سکا ۔" [2]

---

[1] شوکت تھانوی : شیش محل صفحہ 72 ، اردو بک اسٹال لوہاری دروازہ لاہور ۔

[2] ایضاً ، صفحہ 49 ۔

شوکت تھانوی کے خاکوں کی بنیاد سر تا سر ذاتی تاثرات پر ہے ۔ اس لئے ان میں مختلف کیفیتوں اور ان کیفیتوں کے اُتار چڑھاؤ کا گہرا اثر ہے ۔ وہ مختصر خاکہ لکھتے وقت شخصیت کی اہم اور نمایاں خصوصیات کا انتخاب کرتے ہیں اور یہ خصوصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جس سے شخصیت کا ایک واضح نقش پڑھنے والے کے سامنے آجاتا ہے ۔ مثال کے طور پر " قاعدہ بے قاعدہ " کے بیشتر خاکے دیکھے جا سکتے ہیں ۔ صوفی تبسّم کے خاکہ کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے :-

> " یہ کالج میں پروفیسر ہیں اور طالب علموں سے سر کھپانے کے بعد بھی اتنا دماغ اپنے لئے بچا لیتے ہیں کہ اکٹھی تین زبانوں کے شاعر ہیں ۔ اردو ، فارسی اور پنجابی تینوں زبانوں میں بہت عمدہ شعر کہتے ہیں اور تین زبانوں کا شاعر ہونے کے باوجود بہت اچھے آدمی ہیں ۔ زندگی بھر صرف ایک شوق رہا دوست بنانا اور پھر ان سے دوستی نبھانا ۔ اگر کوئی ان کا دشمن ہے تو اس کا کوئی دوست نہیں ہو سکتا ۔" [1]

اسی طرح کا ایک اقتباس پطرس بخاری کے خاکے سے دیکھئیے : " بخاری صاحب ان چند ذہینوں میں سے ایک ہیں جن کو ہر فن مولا کہا جا سکتا ہے ۔ ذہین آدمی کی ہر بات میں اُپج ہوتی ہے اور بخاری اپنی ہر اُپج سے مقدّم اپنی انفرادیت کو سمجھتے ہیں ۔ وہ براڈ کاسٹر ہیں اور ایسے کہ مائیکرو فون کو دیکھ کر ان کی حالت اس پہلوان کی سی ہو جاتی ہے جو اکھاڑے کی مٹی سے پھولنا شروع کرتا ہے ۔ وہ اداکار ہیں اور ایسے کہ ہمارا اسٹیج زندہ

---

[1] شوکت تھانوی : " قاعدہ بے قاعدہ " صفحہ 29 ـ 30 ، بارِ اوّل ، ادارہ فروغِ اردو ، لاہور ۔

ہو سکتا ہے اگر اس قسم کے فنکار اسٹیج پر آجائیں ۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن کی کیفیت رکھتے ہیں ۔ وہ ایک چلتی پھرتی دنیا ہیں ۔ ایک طوفانی دنیا ۔ سعی و عمل کا ایک نہ تھکنے والا حشرِ مجسّم ۔" [1]

شوکت تھانوی کے تمام خاکے مزاحیہ انداز میں ہیں اس لئے ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ آدمی شخصیت کا مجموعی تاثر قبول کرنے کے علاوہ بات کہنے کے انداز سے محظوظ ہوتا ہے ۔ یہ بات شوکت تھانوی کے اکثر خاکوں میں جا بجا موجود ہے ۔ بات عام طور سے بے تکلف مزاحیہ انداز میں بیان کی گئی ہے اور شگفتگی اور مزاح جو ان کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے ان خاکوں میں بھی کم نہیں ہوئی ۔ یہ شگفتگی کبھی واقعات کے بیان کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے کبھی اشخاص کے اوصاف کے ذکر میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے کبھی بے ساختہ کوئی دل کی کلی کو کھلا دینے والا فقرہ زبان پر آتا ہے ۔ ڈاکٹر صابرہ سعید کا خیال ہے کہ :

> " شوکت تھانوی کی تحریریں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کا اولین مقصد قارئین کو ہنسانا ہے وہ ہنسانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ۔ الفاظ سے مزاح پیدا کرنے کے جتنے پیرائے ہوسکتے ہیں وہ سب شوکت تھانوی کے پاس مل جائیں گے ۔" [2]

---

[1] شوکت تھانوی : "قاعدہ بے قاعدہ" صفحہ 53 ـ 54 ، بارِ اوّل ، ادارہ فروغِ اردو ، لاہور ۔

[2] ڈاکٹر صابرہ سعید : " اردو ادب میں خاکہ نگاری ، صفحہ 237 ، مکتبۂ شعر و حکمت ، حیدر آباد ۔

شوکت تھانوی نے مزاح پیدا کرنے کے لئے لفظی بازگیری ، فقرے بازی اور پھبتی سے کام لیا ہے ۔ ذیل کی عبارتوں میں شوکت تھانوی کے اسلوب کی یہ خصوصیات دیکھی جا سکتی ہیں ۔ سیّد امتیاز علی تاج کے بارے میں لکھتے ہیں :

> " امتیاز علی ان کا نام ہے اور تاج تخلّص ۔ مگر شعر نہیں کہتے تاکہ تخلص خرچ نہ ہوجائے اور تخلّص اس لئے رکھ چھوڑا ہے کہ دنیا کا کیا بھروسہ جانے کب شعر کہنا پڑجائیں ۔" ــہ[1]

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے بارے میں لکھتے ہیں :

> " بچو ! چونکہ یہ تبسّم ہیں لہٰذا کبھی قہقہہ نہیں لگاتے ۔ زور کی ہنسی آجائے تو ہاتھ کے جھٹکوں سے تھرمامیٹر کا پارہ اتارنے کے انداز سے قہقہہ بلند نہیں کرتے بلکہ قہقہے کا مفہوم پورا کردیتے ہیں یا قہقہے کو جھٹک دیتے ہیں کہ مجھ تبسّم کے پاس کیوں آیا ۔" ــہ[2]

عظیم بیگ چغتائی کے بارے میں لکھتے ہیں :

> " نام تو عظیم بیگ تھا مگر اس قدر کمزور اور دبلے پتلے تھے کہ یہ نام پھبتی معلوم ہوتا تھا ۔" ــہ[3]

ــہ[1] شوکت تھانوی : " قاعدہ بے قاعدہ " صفحہ 19 ، بارِ اوّل ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور ۔

ــہ[2] ایضاً ، صفحہ 29 ۔

ــہ[3] شوکت تھانوی : " شیش محل " صفحہ 190 ، بارِ اوّل ، اردو بک اسٹال لوہاری دروازہ ، لاہور ۔

شوکت تھانوی بعض اوقات ایک ہی جملے میں اتنی بڑی بات کہہ جاتے ہیں کہ پوری شخصیت کا پھیلاؤ اس میں سما جاتا ہے اس طرح کے چند جملے آپ بھی دیکھئیے ۔ ساغر نظامی کے بارے میں لکھتے ہیں :

> " طبعاً نیشنلسٹ اور وضع قطع میں پیرس کا دھلا ہوا کھدر واقع ہوئے ہیں ۔" [1]

بابائے اردو مولوی عبد الحق کے بارے میں لکھتے ہیں :

> " یہ بابائے اردو مولانا عبدالحق ہیں ۔ یہ ڈاکٹر بھی ہیں مگر علاج صرف اردو کا کرتے ہیں ۔" [2]

الفاظ کے مزاح میں تخیل کی کار فرمائی اس وقت اور بھی لطف دیتی ہے جب بعض اوقات کئی بے تعلق چیزیں اس طرح یکجا کرلی جاتی ہے جیسے وہ ہمیشہ اس طرح ساتھ رہنے کے لئے بنائی گئی تھیں ۔ ایسے چند اقتباسات آپ بھی دیکھئیے ۔ بہزاد لکھنوی کے بارے میں لکھتے ہیں :

> " آپ کی شہرت میں آپ کے کلام کے علاوہ آپ کے گریبان اور اختری بائی فیض آبادی کو بھی کافی دخل ہے ۔" [3]

---

[1] شوکت تھانوی : " شیش محل " صفحہ 143 ، بارِ اوّل ،
اردو بک اسٹال لوہاری دروازہ ، لاہور ۔

[2] شوکت تھانوی : " قاعدہ بے قاعدہ " صفحہ 81 ، بارِ اوّل ،
ادارۂ فروغ اردو ، لاہور ۔

[3] شوکت تھانوی : " شیش محل " صفحہ 63 ، بارِ اوّل ،
اردو بک اسٹال ، لوہاری دروازہ ، لاہور ۔

جوش ملیح آبادی کے بارے میں لکھتے ہیں :

" جوش صاحب کا پٹھان ہونا شاعر ہونے سے بھی زیادہ یقینی ہے چنانچہ ان کے کلام میں بھی لٹھ بازی ، مردانگی ، جنگجوئی ، خونخواریت اور غیظ و غضب نظر آتا ہے جس کو لوگ انقلاب پسندی کہتے ہیں اور یہی جوش - جوش کی شاعری کی روح ہے -"[1]

فراق گورکھپوری کے بارے میں لکھتے ہیں :

" فراق گورکھپوری پروفیسر ہیں مگر مشاعروں میں جس انداز سے اپنا کلام سناتے ہیں ، شبہ یہی ہوتا ہے کہ یہ کسی کالج کے پروفیسر نہیں بلکہ شعبدہ باز پروفیسر ہیں - اور ابھی اپنے شعر کے دوسرے مصرعے سے کبوتر نکال کر اڑا دیں گے - گول گول آنکھیں اسی انداز سے گھما پھرا کر اپنے ہر مصرعے کے ہر لفظ کو باقاعدہ جمناسٹک کراکے جس وقت وہ پڑھتے ہیں سننے والوں کو درپردہ ایک صدمہ سا ہوتا ہے کہ اتنا اچھا شعر ان پر کیوں نازل ہوگیا تھا -"[2]

شوکت تھانوی کے خاکوں کے بارے میں پروفیسر سیّد وقار عظیم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ : " شوکت تھانوی کے لکھے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کے یہ خاکے شوکت تھانوی کے اسلوب مزاح کی جملہ خصوصیتوں کے حامل ہونے
کے بے شمار سامان مہیا کرتے ہیں تفریح اور انبساط کا سرمایہ
کی وجہ سے پڑھنے والے کی تفریح اور انبساط/ ایک طرف تو سیدھی سادی با محاورہ سلیس اور صاف و شستہ نثر کی وجہ سے مہیا ہوتا ہے ، دوسرے

---

[1] شوکت تھانوی : " شیش محل " صفحہ 91 ، بارِ اوّل ، اردو بک اسٹال لوہاری دروازہ ، لاہور -

[2] شوکت تھانوی : " قاعدہ بے قاعدہ " صفحہ 87 - 88 ، بارِ اوّل ، ادارۂ فروغ اردو ، لاہور -

الفاظ کی اس بازی گری سے جس میں شوکت کو حد درجے کی مہارت حاصل ہے ۔"[1]

شوکت تھانوی نے مزاح کے ساتھ ساتھ طنزیہ انداز بھی اختیار کیا ہے وہ کسی کی شخصیت بیان کرتے ہوئے شگفتگی کے پردے میں اصلاحی طنز یا زندہ رہنے والی تنقید کرتے ہیں ۔ ان کے اس طرح کے جملے ہر نقاد کے لئے قابل رشک ہیں ۔ اصغر گونڈوی کے متعلق لکھتے ہیں :

> " جس شعر کے اعمال خدا وند کریم کے نزدیک صالح ہوتے ہیں اس کو اصغر سے کہلوا دیتا ہے ۔ تمام نشاطِ روح اسی قسم کے خوش اعمال اشعار کی جنت ہے ۔" [2]

مختصر تاریخ ادب اردو کے مصنف سیّد اعجاز حسین کے بارے میں لکھتے ہیں :

> " شعر کہتے ہیں خوب کہتے ہیں ۔ مگر بہت کم اور شاید کبھی کبھی جب غصہ اتارنے کو کوئی نہیں ملتا ہے تو شاعری پر غصہ اتارا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک غزل ہوجاتی ہے ۔ پڑھتے کبھی نہیں سنا اور صورت سے اندازہ بھی یہی ہوتا ہے کہ آپ کا پڑھنا نہ سن کر ہم کسی نقصان میں نہیں رہے ہیں ۔" [3]

---

[1] ماخوذ از نقوش لاہور ، شوکت نمبر ، صفحہ 48 ۔

[2] شوکت تھانوی : " شیش محل " صفحہ 44 ، بار اول ، اردو بک اسٹال لوہاری دروازہ ، لاہور ۔

[3] شوکت تھانوی : ایضاً ، صفحہ 45 ۔

امیر امیٹھوی کے متعلق لکھتے ہیں :

" پہلے تھانیدار تھے اب سخنور ہیں ۔ کلام استادانہ ہوتا ہے ۔ فن کے ماہر ہیں مگر گفتگو کریں تو سمجھ میں نہ آئے ۔ شعر خواہ کسی بحر کا ہو پڑھتے مثنوی کے انداز سے ہیں ۔" [1]

صفدر مرزا پوری کے متعلق لکھتے ہیں :

" مشاعروں میں اس طرح پڑھتے تھے کہ ہم نے کبھی ان کے کسی شعر کے مصرعہ ثانی کا قافیہ اور ردیف نہیں سنا ۔ شعر کے آخر تک پہنچتے پہنچتے دونوں ہاتھ پھیلا کر داد مانگتے تھے ۔ لوگ ہنستے تھے اور اسی ہنسی میں شعر کی خوبی بھی گم ہوجاتی تھی ۔" [2]

شوکت تھانوی نے جہاں دوسروں کی خامیوں کی نشاندہی کی وہاں اپنی ذات کو بھی معاف نہیں کیا ۔ اپنے بارے میں لکھتے ہیں :

"بچو ! خدا کے لئے ان کو سمجھاؤ کہ یہ ترنم سے کلام سنانا چھوڑ دیں اور اگر شاعری ہی ترک کردیں تو تم سب مل کر جشنِ نجات مناو ۔ یہ بہت بد آواز ہیں مگر گا کر شعر سنانے سے باز نہیں آتے ۔ دُعا کرو ان کی آواز خود ان کے کان میں بھی پہنچ جایا کرے بلکہ اگر صرف ان ہی کے کان میں پہنچا کرے تو بہت اچھا ہے ۔" [3]

---

[1] شوکت تھانوی : " شیش محل " صفحہ 51 ، بارِ اوّل ،

[2] شوکت تھانوی : ایضاً صفحہ 169 ، بارِ اوّل ، اردو بک اسٹال لوہاری دروازہ ، لاہور ۔

[3] شوکت تھانوی: " قاعدہ بے قاعدہ " صفحہ 65 ، بارِ اوّل ، ادارۂ فروغ اردو ، لاہور ۔

محمد طفیل مدیر نقوش کے بارے میں لکھتے ہیں :

> " بچو ! یہ وہی نازک اندام ایڈیٹر ہے جس کا رسالہ نقوش ہمیشہ موٹا تازہ تم نے دیکھا ہوگا ۔ عام رسالے اپنا ایک آدھ خاص نمبر نکالا کرتے ہیں مگر طفیل کا نقوش خاص طور پر کبھی عام نمبر کی صورت سے نہیں نکلتا ۔ اس کا ہر عام نمبر خاص ہوتا ہے اور یہی طفیل کی خاص ادا اور عام بیساختگی ہے ۔" [1]

شوکت تھانوی کے طنزیہ انداز کے بارے میں ڈاکٹر صابرہ سعید لکھتی ہیں کہ:

> " ان کے خاکوں میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ جس کردار کے بارے میں وہ لکھتے ہیں اس پر تھوڑا سا طنز بھی کر جاتے ہیں اس اعتبار سے ان کے خاکوں میں گو ہلکی سی دل شکنی ہوتی ہے لیکن ایک قسم کی رائے ضرور دیتے ہیں ۔" [2]

الفاظ کو پر معنی تبصرے اور تنقید کا ذریعہ بنانا شوکت تھانوی کی مزاح نگاری اور شخصیت نگاری کی مشترک خصوصیت ہے ۔ یہ خصوصیت اس وقت اور بھی زیادہ مؤثر صورت اختیار کرتی ہے جب شوکت تھانوی کسی شاعر یا ادیب کے کسی عمل کی ایسی توجیہہ پیش کرتے ہیں جو عام خیال سے بالکل
ہوتی ہے پڑھنے والے کے لئے اس توجیہہ ، تاویل یا تعلیل میں غیرمتوقع
مختلف اور غیر متوقع/ استعجاب کی بڑی سرور انگیز کیفیت ہوتی ہے ۔ احسان دانش کے متعلق لکھتے ہیں :

---

[1] شوکت تھانوی : قاعدہ بے قاعدہ صفحہ 73 ، بارِ اوّل ، ادارہ فروغِ اردو ، لاہور ۔

[2] ڈاکٹر صابرہ سعید : " اردو ادب میں خاکہ نگاری " صفحہ 234 ، دسمبر 1978ء ، مکتبۂ شعر و حکمت ، حیدر آباد ۔

"احسان پہلے مزدور تھے اور اب شاعر ہیں ۔ سوتے تو خیر اب تک زمین پر ہیں مگر اب لحاف ریشمی ہوتا ہے اور جیب میں گھڑی بھی نظر آتی ہے تا کہ تضیعِ اوقات کی گواہی دیتی رہے ۔" [1]

کرشن چندر کے بارے میں لکھتے ہیں :

"بچو ! یہ کرشن چندر ہیں ۔ تم ہنس کیوں رہے ہو ، واقعی یہ کرشن چندر ہیں ۔ تم ہنسی اس بات پر آتی ہوگی کہ جس کرشن چندر کا نام اتنا ہو ، وہ بھلا صرف اتنا سا کیسے ہوسکتا ہے ۔ تم نے کرشن چندر کا تصوّر بہت بھاری بھرکم قائم کیا ہوگا ، مگر وہ تو واجبی سے آدمی نکلے ۔ وجہ یہ کہ لکھتے زیادہ ہیں ، ورزش کم کرتے ہیں ۔" [2]

حفیظ جالندھری کے بارے میں لکھتے ہیں :

"کہنے لگے کہ دیکھتے نہیں ہو ولایت سے بیوی لایا ہوں ۔ میں نے کہا انگلستان بھر کی ایک غریب عورت اگر تمہارے نکاح میں آکر چلی آئی ہے تو اس کو سند سمجھتے ہو ۔ حالانکہ معلوم نہیں اس اجتماع کی کتنی خواتین یہ سوچ رہی ہوں گی کہ اس مرد سے شادی پہلے کی جائے یا طلاق پہلے حاصل کیا جائے ۔ چلتے چلتے کھڑے ہو کر اکڑ گئے ۔ معلوم ہوا کہ ہنس رہے ہیں ۔" [3]

---

[1] شوکت تھانوی : " شیش محل " صفحہ 30 ، بارِ اوّل
اردو بک اسٹال ، لاہور ۔

[2] شوکت تھانوی: " قاعدہ بے قاعدہ " صفحہ 95 ، بار اوّل ،
ادارۂ فروغ اردو ، لاہور ۔

[3] شوکت تھانوی: " شیش محل " صفحہ 103 ، بارِ اوّل ، ارد بکسٹال ، لاہور ۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بارے میں لکھتے ہیں :

> " عمر کافی ہے ۔ مگر ابھی تک "کرارے" ہیں ممکن ہے یہ خصوصیت "ہاپوڑ" کے ہونے کی وجہ سے ہو ۔ بہرحال ہاپوڑ کی دو ہی چیزیں اب تک مشہور ہوئی ہیں ۔ پاپڑ اور مولوی عبدالحق ۔" [1]

اکبر حیدری کے ذکر میں لکھتے ہیں :

> " سیماب صاحب اور اکبر حیدری صاحب میں ذرا تیز قسم کا تبادلۂ خیال ہوگیا تھا ------ عشرت اور شوکت دونوں خاموش تماشائی تھے اس لئے کہ کھانا مزیدار تھا ۔" [2]

شوکت تھانوی کے خاکوں میں بعض کمزوریاں بھی ہیں مثال کے طور پر کہیں کہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے شخصیت کے بیان کرنے میں اپنے ذاتی مراسم کو بہت دخل دیا ہے اور ایسے موقعوں پر مبالغہ آرائی کی وجہ سے تعریف کا پہلو نمایاں ہوگیا ہے ۔ ملک حسیب احمد ریڈیو کے ایک افسر تھے ان کے متعلق شوکت تھانوی لکھتے ہیں :

> " ان کو شاید اپنے ادیب ہونے کی خبر نہ ہو لیکن ہمارا مطالعہ یہی ہے کہ وہ اگر ریڈیو میں نہ ہوتے تو کسی رسالہ کے ایڈیٹر ۔ کئی کتابوں کے مصنّف ۔ کسی پبلشنگ ہاؤس کے مالک یا مالک کے شریک یا کسی ایسی ہی قسم کے آدمی ہوتے ۔ ان میں افسانہ نگاری کی صلاحیت اور ڈرامہ کا پورا سلیقہ موجود ہے ۔" [1]

---

[1] شوکت تھانوی : "شیش محل" صفحہ 177 ، بارِ اوّل ، اردو بکسٹال ، لاہور ۔

[2] ایضاً ، صفحہ 50 ۔

[3] ایضاً ، صفحہ 227 ۔ 228 ۔

رفیع احمد خاں کے بارے میں لکھتے ہیں :

> " میں نے بہت سے ذہین آدمی دیکھے ہیں - بہت سے پڑھے لکھے جاہلوں اور عالموں سے سابقہ رہا ہے - بڑے بڑے حاضر جوابوں کے کمالات دیکھ چکا ہوں مگر رفیع احمد خاں اپنا جواب خود ہیں - انگریزی میں ایک متبحر صاحبِ قلم - اردو میں ایک جادو بیان شاعر - جادو یہ ہے کہ کلام نظر نہیں آتا مگر خدا کی قسم بے پناہ کہتے ہیں -" [1]

بعض خاکوں میں شوکت تھانوی نے کمزوریوں کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ اس میں ایک طرح کی تلخی سی پیدا ہوگئی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے دل میں اس شخص کے لئے وہ گنجائش نہیں جو دوسروں کے لئے ہے - مجنوں گورکھپوری کے خاکہ میں یہ بات بہت واضح طور پر محسوس ہوتی ہے :

> " نہایت " المختصر " قسم کے پورٹ ایبل انسان ہیں - مگر فطرت کی شارٹ ہینڈ میں مشاقی کا جیتا جاگتا نمونہ - قد و قامت میں فتنہ مگر باقی تمام حیثیتوں سے قیامت ، ادیب ، نقاد ، شاعر ، افسانہ نگار ، طالب علم ، معلم سب ہی کچھ تو ہیں یہ اور بات ہے کہ مجنوں کو شہرت بحیثیت افسانہ نگار کے حاصل ہوئی -------- --- مجنوں میں دوستوں کے لئے خلوص بھی ہے مگر بہت سپاٹ قسم کا - شروع شروع میں لوگ ان کو سنکی سمجھتے ہیں مگر بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنکی تو نہیں البتہ تصنع سے بری ہو کر تہذیب

---

[1] شوکت تھانوی : " شیش محل " صفحہ 130 - 131 ، بارِ اول ، اردو بک اسٹال ، لاہور -

کے اس معیار پر پورے نہیں اترتے جو منافقانہ اخلاق اور دروغ با خانہ علم مجلس سکھاتا ہے ۔"[1]

بسمل الہ آبادی کے بارے میں لکھتے ہیں:

" پڑھنے کا انداز عدم تشدّد کے منافی ہے آواز بلند ہے مگر اس کو بھی انتہائی بلندی پر پہنچانے کی کوشش فرماتے ہیں ۔ بیٹھ کر پڑھ رہے ہوں تو ہر وقت کھڑے ہو جانے کا امکان رہتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی اسپرنگ پر تشریف فرما ہیں ۔ پڑھتے ترنم سے ہیں مگر کچھ الفاظ دانتوں میں اور کچھ ناک میں آکر اپنی ساخت بدل دیتے ہیں ۔"[2]

ملا رموزی کے متعلق لکھتے ہیں :

"حضرت ملا رموزی ۔ مشہور مزاح نگار ہیں ۔ گلابی اردو آپ کا خاص رنگ پیش کرتی رہی اس کے بعد کچھ سیاسی مزاح نگاری شروع فرمائی اور آخر کار شاعری بھی فرمانے لگے ۔ ذہین آدمی کیا کچھ نہیں کر سکتا مگر سب باتیں کرنے کی نہیں ہوتیں ۔"[3]

---

[1] شوکت تھانوی : " شیش محل " صفحہ 214 ۔ 215 ، بارِ اوّل ، اردو بک اسٹال ، لاہور ۔

[2] شوکت تھانوی : " شیش محل " صفحہ 60 ۔ 61 ، بارِ اوّل ، اردو بک اسٹال ، لاہور ۔

[3] شوکت تھانوی : " شیش محل " ، صفحہ 226 ، بارِ اوّل ، اردو بک اسٹال ، لاہور ۔

طویل خاکے کی نسبت مختصر خاکہ کو بہتر اور اچھا سمجھا جاتا ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ قاری اسے ایک ہی نشست میں ختم کر سکتا ہے ۔ اور اس طرح اس کے مکمل تاثر کو پوری طرح جذب کر سکتا ہے ۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مختصر خاکہ میں واقعات اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی وجہ سے شخصیت جامع نظر آتی ہے اور قاری اس کے تاثر سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے ۔ شوکت تھانوی کے بیشتر خاکے بہت مختصر ہیں انہوں نے ان مختصر خاکوں کے ذریعے سے کسی اہم شخصیت کو متعارف کرانے کی کوشش کی ہے اس لئے ہم شوکت تھانوی کے خاکوں کو " تعارفی خاکے " کہہ سکتے ہیں ۔ تعارفی خاکہ کی وضاحت ڈاکٹر صابرہ سعید نے اس طرح کی ہے :

> " ایسی شخصیتیں جو زندگی کے کسی نہ کسی شعبے میں متعارف و مشہور ہوتی ہیں لیکن ان کی نجی زندگی اور سیرت سے لوگ واقف نہیں ہوتے ہیں خاکہ نگار اپنی ذاتی معلومات کی بناء پر ان شخصیتوں کی زندگی کے چھپے ہوئے پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے ۔ ساتھ ساتھ ان کے بارے میں ضروری سوانحی معلومات بھی پیش کر دیتا ہے ۔ شوکت تھانوی کی " شیش محل " --------! کے بیشتر خاکے تعارفی ہیں ۔" [1]

شوکت تھانوی نے چھوٹے چھوٹے واقعات سے نہ صرف اپنے خاکوں کو سجایا ہے بلکہ معمولی سے معمولی واقعہ کو پر اثر الفاظ میں خاص ترتیب سے اس طرح بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ مخصوص فرد کی شخصیت کا پر تو قاری کے سامنے آجاتا ہے ۔ مولانا تاجور نجیب آبادی کا خاکہ دیکھئیے :

---

[1] ڈاکٹر صابرہ سعید : اردو ادب میں خاکہ نگاری ، صفحہ 103 ، دسمبر 1978 ء ، مکتبۂ شعر و حکمت ، حیدر آباد ۔

" مولانا تاجور نجیب آبادی ایک مرتبہ لکھنؤ تشریف لے گئے تھے ۔ حکیم آشفتہ صاحب نے آپ کو دعوت دی تھی اور یہ خاکسار بھی اس دعوت میں شریک تھا اب تک وہی ایک ملاقات ہے جو مولانا سے ہوئی نہایت بھاری بھرکم شاعر ہیں ۔ کلام بھی ٹھوس اور خود بھی ٹھوس تحت اللفظ پڑھتے ہیں اور پڑھنے میں ہانپتے جاتے ہیں ۔ دوسری مرتبہ جب آپ سے ملنے گیا تو باہر ہی سے بھاگ آیا ۔ کمرہ سے نہایت خوفناک آوازیں آرہی تھیں بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا سو رہے تھے اور یہ آوازیں خراٹوں کی تھیں ۔" [1]

شوکت تھانوی کے خاکوں کی ایک تہذیبی ، معاشرتی اور اخلاقی اہمیت بھی ہے بقول پروفیسر سیّد وقار عظیم " ان خاکوں سے بہ حیثیتِ مجموعی ہمارے معاشرے کے ایک خاص دور کا تہذیبی کردار ابھرتا ہے اور ادیبوں اور شاعروں کے متعلق ہم جو کچھ پڑھتے ہیں اس میں ایسی بہت سی اخلاقی اور معاشرتی قدروں کا رچاو نظر آتا ہے جو رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہو رہی ہیں ۔" [2]

مولانا عبد الماجد دریا بادی " شیش محل " کے خاکوں کے بارے میں لکھتے ہیں : " مزاح و شوخی ہر چیز پر مقدم ہے لیکن حقیقت و صداقت عموماً دوش بدوش " عموماً " کا لفظ خیال میں رہے ۔ ظرافت کی گلکاریاں ، شوخ نگاری کی رنگ آمیزیاں ، مورّخ کے کیمرے

---

[1] شوکت تھانوی: " شیش محل " صفحہ 73 ، بار اوّل ، اردو بک اسٹال ، لاہور۔

[2] ماخوذ از نقوش لاہور شوکت نمبر ، صفحہ 48 ۔

اور فوٹو گرافی کی قائم مقام نہیں ہو سکتیں ۔ چہرے یقیناً دلچسپ و دلکش سب کے ہیں اور یہی فنکار کا کمال ہے ۔"[1]

شوکت تھانوی کی شخصیت نگاری پر پروفیسر سیّد وقار عظیم کی رائے صائب معلوم ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں :

" میرے نزدیک ان خاکوں کی ایک اہم خصوصیت ان کا وہ خلوص اور دیانتداری ہے جس کی بناء پر انہیں ترتیب دیا گیا ہے ، اس لئے ان میں کہیں کہیں قصیدے اور ہجو کا جو رنگ پیدا ہوگیا ہے اس سے قطع نظر ان کے مطالعے سے ادیبوں اور شاعروں کی عظمت کے پہلو بھی سامنے آتے ہیں اور ان کی بعض کمزوریوں کا اظہار بھی ہوتا ہے اور اچھائیوں اور برائیوں کا یہ امتزاج انہیں مافوق الفطرت ہونے سے بچا لیتا ہے ۔"[2]

شوکت تھانوی کی خاکہ نگاری کا جائزہ لینے کے بعد اور معروف نقادوں کی رائے کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہ حیثیت خاکہ نگار شوکت تھانوی نے اردو ادب کی روایتی ، تنقیدی یا جذباتی شخصیت نگاری کی عام روش سے ہٹ کر معیاری خاکے تحریر کئے ہیں ۔ " شیش محل " اور " قاعدہ بے قاعدہ " کے خاکوں نے خاکے کی صنف کو نئے آب و رنگ کی منفرد حیثیت عطا کی ہے ۔ ڈاکٹر صابرہ سعید نے خاکہ نگاری کے موضوع

---

[1] ماخوذ از نقوش لاہور ، شوکت نمبر ، صفحہ 38 ۔

[2] ایضاً ، صفحہ 48 ۔

پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ہے انہوں نے شوکت تھانوی کو صفِ اوّل کا خاکہ نگار قرار دیتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ شوکت تھانوی نے اس صنف کو نکھارنے اور ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے ۔ وہ بجا لکھتی ہیں :

> " اس صنف میں اردو ادب کے صفِ اوّل کے ادیبوں اور مزاح نگاروں نے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں ۔ محمد حسین آزاد ، مرزا فرحت اللہ بیگ ، مولوی عبدالحق ، رشید احمد صدیقی ، شاہد احمد دہلوی ، ابوالکلام آزاد ، عبدالماجد دریا بادی ، محمد طفیل ، اشرف صبوحی ، شوکت تھانوی اور سعادت حسن منٹو ، جیسے انشا پردازوں نے اپنے زورِ قلم سے اس صنف کو اس درجہ نکھارا ہے کہ وہ موجودہ دور میں اردو ادب کی ایک دلکش اور مقبولِ عام صنف بن گئی ہے ۔" [1]

---

[1] ڈاکٹر صابرہ سعید: " اردو ادب میں خاکہ نگاری "، صفحہ 336 ، دسمبر 1978ء ، مکتبۂ شعر و حکمت 865 ـ 6 ـ 11 ، لکڑی کا پل حیدر آباد ۔

:————————:————————:

آپ بیتی سے مراد کسی شخص کے اپنی زندگی سے متعلق خود لکھے ہوئے حالات ہوتے ہیں ۔ ڈاکٹر صبیحہ انور نے اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ : " آپ بیتی کے فن کے لئے ضروری نہیں کہ تعداد صفحات کی کوئی قید ہو یا کوئی خاص طریقہ کار ہو جس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہو ۔ آپ بیتی خواہ چند سطروں پر مشتمل ہو یا سینکڑوں صفحات پر محیط ہو بہر حال آپ بیتی ہوتی ہے ۔ خود نوشت سوانح حیات جو معنوی اعتبار سے آپ بیتی کہلاتی ہے ۔ عموماً ایک مفصل کتاب ہوتی ہے جس میں مختلف باب ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے اس کا پھیلاؤ خاصا ہوتا ہے ۔ البتہ آپ بیتی عام طور پر نثر میں اپنے حالات کا لکھنا ہے یعنی بنیادی طور پر مصنّف کے خود لکھے ہوئے اپنے حالات جو کہ نثر میں ہوں خود نوشت سوانح حیات کہلاتے ہیں ۔ "[1]

آپ بیتی کے بارے میں مشتاق احمد یوسفی کی رائے ہے کہ :

> " آپ بیتی میں ایک مصیبت یہ ہے کہ آدمی اپنی بڑائی آپ کرے تو خود ستائی کہلائے اور از راہ کسر نفسی یا جھوٹ موٹ اپنی برائی کرنے بیٹھ جائے تو احتمال یہ ہے کہ لوگ جھٹ یقین کرلیں گے ۔ "[2]

---

[1] ڈاکٹر صبیحہ انور : اردو میں خود نوشت سوانح حیات، صفحہ = 19 ، اگست 1982ء ، مطبوعہ نامی پریس ، لکھنو ۔

[2] مشتاق احمد یوسفی : زرگذشت صفحہ 13 ، 1976ء ، مکتبہ دانیال ، کراچی ۔

خود نوشت سوانح حیات کی سب سے پہلی خصوصیت سچائی ہے ۔ آپ بیتی لکھنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کی تمام وہ خوبیاں اور خامیاں دکھائے جو ایک فرد کی واضح صورت بنانے کے لئے اور زندگی کو سامنے لانے کے لئے ضروری ہوں ۔ ایک اچھی اور حقیقت افروز خود نوشت لکھنے میں جو چیز سب سے زیادہ حائل ہوتی ہے وہ فنکار کی اُنا ہے ۔ کوئی شخص یہ نہیں چاہتا کہ وہ اپنے اعترافات کی بنا پر اس سے کم تر درجے کا ثابت ہو جیسا کہ عام طور پر لوگ اسے سمجھتے ہیں اس لئے اپنی شخصیت اور اُنا کا خیال رکھنے والے کبھی اچھی خود نوشت سوانح حیات نہیں لکھ سکتے ۔ ایک کامیاب آپ بیتی میں حقیقت نگاری کی وضاحت کرتے ہوئے سر سیّد رضا علی لکھتے ہیں ۔

> " میرے نزدیک اپنے لکھے ہوئے سوانح حیات کی سب سے بڑی صفت یہ ہونی چاہئیے کہ ایک مرتبہ کراماً کاتبین بھی سامنے آ کر بہ آواز بلند پڑھ لیں تو پڑھنے والے کو آنکھ نیچی نہ کرنی پڑے ۔ "[1]

دوسری اصناف سخن میں سچائی کی جو اہمیت ہے خود نوشت میں اس کی اہمیت کئی گنا زیادہ بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس تحریر میں فن کا تانا بانا جس کے گرد بنا جاتا ہے اور جو بنتا ہے دونوں ایک ہی شخصیت ہوتی ہے اس لئے مصنف کی ذمہ داری کچھ اور زیادہ ہوجاتی ہے ۔ ڈاکٹر ایم ۔ ڈی ۔ تاثیر نے دیوان سنگھ مفتوں کی خود نوشت سوانح حیات " ناقابلِ فراموش " کا تعارف کراتے ہوئے برملا گوئی پر زور دیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ : " ہندوستان میں برملا گوئی کا دستور عام نہیں اور اردو نثر میں اس طرح کی تحریریں بہت کم ہیں جن میں زندگی کے حالات صاف صاف بیان کئے گئے ہیں ۔ جو ہوں بھی تو

---

[1] سر سیّد رضا علی : " اعمال نامہ " دیباچہ صفحہ نمبر ح ، 1942ء
رنگ محل پبلشر ، دہلی ۔

ضروری نہیں کہ مصنّف کی زندگی اس طرح کی ہو کہ ہر شخص کو اس میں دلچسپی ہو اور پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی زندگی دلچسپ ہوتی ہے وہ ہر واقعہ کو پوری تفصیل کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والا اکتا جاتا ہے ۔ یہ نہیں تو زیب داستاں کے لئے اس طرح رنگ آمیزی کی جاتی ہے کہ واقعہ قصّہ اور قصّہ داستان بن جاتا ہے ۔" [1]

اردو ادب میں ہی نہیں بلکہ دنیائے ادب کی اہم آپ بیتیوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف انہیں آپ بیتیوں کو قبولیت عام اور بقائے دوام کے دربار میں رسائی حاصل ہوتی ہے جن میں حقیقت بیانی سے کام لیا گیا ہو ۔

خود نوشت سوانح حیات کی دوسری اہم خصوصیت " شخصیت " ہے ۔ آپ بیتی میں اپنی ذات اور شخصیت ہی وہ محور ہوتی ہے جس کے گرد مصنف چکر لگاتا ہے ۔ ایک اچھی خود نوشت میں زندگی کے حالات بتدریج اس طرح بیان کئے جاتے ہیں جس طرح زندگی میں پیش آتے ہیں ۔ زندگی کے نشیب و فراز کو بڑی ہنرمندی سے بیان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ایک اچھا مصنّف ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ اس کی تصنیف نہ تو قارئین کے لئے بار ہوا اور نہ ہی کوئی ضروری بات لکھنے سے رہ جائے کہ پڑھنے والے کو تشنگی محسوس ہو ۔ آپ بیتی لکھنے والے اپنی شخصیت کو اپنی تصنیف میں پیش کرتے وقت ان باتوں کا خاص طور سے خیال رکھتے ہیں ۔

1- اپنی شخصیت اور کردار کی اہمیت کا موقع پیش کرنا ۔

2- اپنے حالات سے دوسروں کو روشناس کرانا ۔

---

[1] دیوان سنگھ مفتوں : ناقابل فراموش صفحہ نمبر 4 ، بار دوم ، رنجیت نیوز ایجنسی ، دہلی ۔

3- اپنی ذات پر گذرنے والے حالات اور تجربات سے دوسروں کو روشناس کرانا اور کسی عام غلط فہمی کا ازالہ کرنا ۔

4- اپنے حالات اگر ایسے ہیں جس میں محنت کر کے غیر معمولی ترقی حاصل کی گئی ہے تو دوسروں کو اس کی ترغیب دلانا ۔

5- اپنے زمانے کے سیاسی ، سماجی ، ادبی حالات کو اپنے زاویۂ نگاہ سے پیش کرنا اور اپنی زندگی کے اصولوں کی تبلیغ کرنا ۔

6- اپنے ہم عصروں سے اپنے تعلقات واضح کرنا اور ان کے اعمال اور افعال پر تنقید کرنا ۔

ڈاکٹر صبیحہ انور کا خیال ہے کہ " کسی فرد کی شخصیت کی خود نوشت سوانح حیات سے بہتر تصویر کشی نہیں ہوسکتی ۔ بشرطیکہ خود نوشت سوانح حیات دیانت داری اور خلوص نیت سے لکھی گئی ہو ، لیکن کتنے افراد میں یہ ہمت اور حوصلہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو اپنے اصلی رنگ روپ میں دیکھ سکیں چہ جائیکہ اپنے ڈھکے چھپے خد و خال کو سر بازار پیش کر سکیں ۔ اس لئے اپنی کہانی اپنی زبانی سناتے وقت اکثر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ اپنی شخصیت کو ظاہر کرنے کے لئے جتنے پردے اس پر سے اٹھائے جا رہے ہیں اس سے زیادہ اس پر ڈالے جا رہے ہیں ۔" [1]

خود نوشت سوانح حیات کی تیسری خصوصیت یہ مانی گئی ہے کہ خود نوشت کو یادداشت کا مجموعہ ہونے کے بجائے فن کا حصہ ہونا چاہئیے ۔ فن اظہارِ ذات کا دوسرا نام ہے چونکہ خود نوشت سوانح حیات کا تعلق ہمارے شدید

---

[1] ڈاکٹر صبیحہ انور : اردو میں خود نوشت سوانح حیات صفحہ 36 ، اگست 1982ء ، مطبوعہ نامی پریس ، لکھنو ۔

داخلی جذبات سے ہے اس لئے اسے فن کی اعلی اقدار میں شامل کیا جاسکتا ہے ۔ خود نوشت سوانح حیات کو ادبی کارنامہ بنانے کے لئے زبان و بیان کی ندرت ضروری ہے چونکہ حقیقت کو خوبصورت الفاظ میں ملبوس کر کے جب قارئین کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ یقیناً اس سے متاثر ہوتے ہیں ۔ بقول ڈاکٹر صبیحہ انور " آپ بیتی میں بے باک سچائی اور خلوص کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اس کی غرض شخصیت کو پیش کرنا ہے اور لازمی یہ ہے کہ تصنیف ، شخصیت کو واضح کر دے اور فن کا تقاضا بھی یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے صفائی اور سچائی کے ساتھ پیش کیا جائے ۔" [1]

شوکت تھانوی کی آپ بیتی :-

شوکت تھانوی کی خود نوشت سوانح حیات " مابدولت " 1945ء میں لکھی گئی جس میں پیدائش سے لے کر 1938ء تک کے واقعات بیان کئے گئے ہیں ۔ اس آپ بیتی میں تعلیم ، شاعری ، مضمون نویسی ، شادی ، صحافت اور ریڈیو لکھنو کی ملازمت کا تذکرہ دلکش انداز میں کیا گیا ہے ۔ اپنی تعلیمی زندگی کے آغاز کے بارے میں لکھتے ہیں " بڑے لاڈ پیار میں زندگی کے دن گذر رہے تھے کہ معلوم نہیں کس نے والد صاحب کو یہ مشورہ دے دیا کہ لڑکے کی تعلیم شروع ہونا چاہئیے ۔" [2] تعلیم شروع ہوگئی ۔ اساتذہ گھر پر انہیں تعلیم دینے کے لئے آتے تھے ۔ یکے بعد دیگرے کئی اساتذہ کو تبدیل کرنا پڑا ۔ باقاعدگی سے گھر پر پڑھائی نہ ہوسکی تو خالو مدن کے لال اسکول

---

[1] ڈاکٹر صبیحہ انور : اردو میں خود نوشت سوانح حیات صفحہ 41 ، اگست 1982ء ، مطبوعہ نامی پریس ، لکھنو ۔

[2] شوکت تھانوی : " مابدولت " صفحہ 21 ، ادارۂ فروغ اردو " ، لاہور

میں داخل کردیا گیا ۔ چھٹی جماعت پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد میں داخل ہوئے ۔ جہاں تعلیم کے بجائے غیر نصابی سرگرمیوں میں ہمیشہ پیش پیش رہے اپنی اس حالت کی تصویر کشی انہوں نے ان الفاظ میں کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں ۔ " کچھ دن تو اسکول میں بھیگی بلی بن کر رہے اس لئے کہ ایک مڈل اسکول سے آئے تھے اور یہاں کے لڑکے مڈل اسکول کے لڑکوں کو گاؤدی سمجھا کرتے تھے ۔ مگر رفتہ رفتہ ہمارے دوستوں کی بھی ایک جماعت پیدا ہوگئی ۔ اور پھر آخر تک اسی جماعت نے حسین آباد ہائی اسکول میں زندگی کی روح پھونکی ۔ پڑھنا وڑھنا تو خیر یہاں بھی برائے نام تھا ۔ البتہ تمام مشاغل میں ہم پیش پیش تھے ۔" [1] اس قسم کے شگفتہ اسلوب میں شوکت تھانوی نے یہ آپ بیتی تحریر کی ہے ۔

شوکت تھانوی کی دوسری خود نوشت سوانح حیات " کچھ یادیں کچھ باتیں " کے نام سے ادارہ فروغ اردو لاہور نے ان کے انتقال کے بعد 1964ء میں شائع کی ۔ " کچھ یادیں کچھ باتیں " کے نام سے شوکت تھانوی نے روزنامہ جنگ راولپنڈی میں ایک کالم شروع کیا تھا جس میں وہ اپنی گذری ہوئی زندگی کے واقعات لکھا کرتے تھے ۔ نسیم انہونوی نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ " کچھ یادیں کچھ باتیں " ۔ یہ عنوان تھا شوکت مرحوم کے اس مضمون کا جو وہ اخبار جنگ راولپنڈی میں گذشتہ چند ماہ سے لکھ رہے تھے اور جس کا سلسلہ جاری تھا کہ وہ علیل ہو کر لاہور کے میو ہسپتال میں داخل ہوئے اور پھر اپنی دوسری شریک زندگی زہرہ بیگم کے مکان میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے کر

---

[1] شوکت تھانوی : " مابدولت " صفحہ 48 بار چہارم ، ادارہ فروغ اردو " ، لاہور

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا والوں سے رخصت ہوگئے ۔ اس مضمون میں شوکت صاحب نے اپنی ابتدائی زندگی سے لے کر آج تک کے احباب کا تذکرہ ایک نئے انداز میں لکھنا شروع کیا تھا ۔ یہ تذکرہ وہ مصوّر شائع کر رہے تھے تا کہ جن احباب کا ذکر آئے ان کی تصویر بھی پڑھنے والے دیکھ سکیں ۔" [1]

" کچھ یادیں کچھ باتیں " روزنامہ " جنگ " راولپنڈی میں ہفتہ میں صرف ایک مرتبہ شائع ہوتا تھا جس پر ابراہیم جلیس نے ایک خط کے ذریعہ ان سے گذارش کی کہ اسے ہر ہفتہ شائع کرنے کے بجائے ہر روز شائع ہونا چاہئیے ۔ وہ لکھتے ہیں " آپ " کچھ یادوں اور کچھ باتوں " کے ذریعے اپنی پچھلی ساری زندگی کو جس سلیقے سے سمیٹ رہے ہیں وہ مجھے بہت پسند آیا ۔ آپ کی یہ تصنیف اردو ادب کی ۔ ایک دلچسپ اور مستند تاریخ بن جائے گی ۔ بہتر ہے کہ آپ " پہاڑ تلے " کے کالم کی بجائے روزانہ بھی یادیں اور باتیں لکھا کریں کیونکہ مجھ سے ہفتہ بھر کا انتظار نہیں ہوتا ۔" [2]

" کچھ یادیں کچھ باتیں " کا سلسلہ شوکت تھانوی کو 1938ء کے بعد کے واقعات سے شروع کرنا چاہئیے تھا چونکہ 1938ء تک کے واقعات " مابدولت " میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان ہوچکے تھے ۔ لیکن شوکت تھانوی نے ایسا نہیں کیا ۔ اس میں بھی وہی موضوعات ہیں جو " مابدولت " میں ہیں ۔ اس کا آغاز شاعری کی ابتداء اور مولانا آسی کی شاگردی سے ہوا ۔ چند مشاعروں کا تذکرہ کیا ۔ پھر والد صاحب کا انتقال اور روزنامہ ہمدم کی

---

[1] نسیم انہونوی : ماخوذ " کتاب " لکھنو ، شوکت تھانوی نمبر ، جولائی 1963ء ، ص: 16۔

[2] ابراہیم جلیس: ماخوذ از " ماہنامہ " کتاب " لکھنو شوکت تھانوی نمبر جولائی 1963ء ، صفحہ = 56 ۔

ملازمت کا ذکر ہے اور اس کے بعد صحافتی زندگی کے حالات بیان کئے گئے ہیں ۔ آخر میں سودیشی ریل کی مقبولیت کو اپنے لئے وبال جان قرار دیا ہے ـــــ شوکت تھانوی کا یہ منصوبہ ابھی زیر تکمیل ہی تھا کہ خالق حقیقی نے انہیں اپنے پاس بلالیا اور اس طرح یہ کتاب ادھوری رہ گئی ۔ اگر شوکت صاحب کو معلوم ہوتا کہ ان کی زندگی اتنی جلد ختم ہوجائے گی تو وہ یقیناً اسے " مابدولت " کے بعد سے شروع کرتے اور ایک خاص تسلسل کے ساتھ ان کی زندگی کے حالات ہمارے سامنے آتے ۔ " کچھ یادیں کچھ باتیں " کو چونکہ اخبار میں قسطوار چھاپا جاتا تھا اس لئے اس میں تسلسل کی کمی نظر آتی ہے ۔ دوسری بات یہ کہ اس میں اپنی ذات کو اجاگر کرنے کی بجائے دوسروں کی ذات کو زیادہ موضوع بحث بنایا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ مصنّف کی خود نوشت سوانح حیات کی بجائے مصنف کے عہد کی تاریخ معلوم ہوتی ہے لکھنؤ کے ماحول کی جا بجا تصویر کشی کی گئی ہے ۔ آسان اور عام فہم اسلوب نے اس کے حسن میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے ۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے شوکت تھانوی نے اپنے حالات دو کتابوں میں قلمبند کئے ۔ " مابدولت " ان کی زندگی میں (1945ء) میں شائع ہوئی جبکہ " کچھ یادیں کچھ باتیں " ان کے انتقال کے بعد 1964ء میں کتابی صورت میں منظر عام پر آئی ۔ ان دونوں کتابوں کے حوالہ سے ہمیں اس بات کا تجزیہ کرنا ہے کہ شوکت تھانوی نے آپ بیتی کے اصولوں یعنی سچائی ، شخصیت اور فن کا کہاں تک خیال رکھا ہے ؟ اور یہ کہ ان کی خود نوشت سوانح عمریاں اردو ادب میں کیا مقام رکھتی ہیں ۔

خود نوشت سوانح حیات میں سچائی ہی وہ روح ہے جو انسانی زندگی کو متحرک و جاندار بنا کر سامنے لے آتی ہے ۔ آپ بیتی دلکش تب ہی ہوسکتی ہے جب اس کے پڑھنے والے کو اس کے صحیح ہونے کا یقین ہو ۔ شوکت تھانوی نے " مابدولت " کے آغاز میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ سچ بولنا اقدام خودکشی کے مترادف ہے ۔ وہ لکھتے ہیں " نہ میں مہاتما گاندھی ہوں اور نہ مجھے " تلاش حق " نے اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ میں اپنی زندگی کے ہر رخ کو اس قدر سچائی کے ساتھ پیش کردوں کہ وہی سچ میری شامت بن کر میرے سامنے آجائے ۔ پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے سچ بولنے کی نہایت خطرناک کوشش کی ہے اور دراصل اپنے ان حالات کو پیش کرنا ہی ایک قسم کا اقدام خودکشی ہے ۔ مہاتما گاندھی کا کیا ہے وہ تو بچپن ہی سے مہاتما چلے آرہے ہیں ۔ بڑے سے بڑا جرم انہوں نے یہ کیا ہے کہ گوشت کھالیا یا کسی دوست کے بہکانے سے کسی بیسوا کے یہاں چلے گئے اور وہاں سے صاف نکل آئے لیکن یہ خاکسار نہ تو کبھی مہاتما تھا نہ اب ہے نہ آئندہ ہوسکتا ہے ۔ " [1]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شوکت تھانوی کو اس بات کا احساس تھا کہ آپ بیتی لکھتے وقت تمام باتوں کو سچائی کے ساتھ بیان کرنے میں اچھی خاصی دقّت پیش آتی ہے ۔ اگر سچ کہہ دیا جائے تو اپنی شخصیت کے مجروح ہونے کا خطرہ ہے اور اگر سچ نہ کہا جائے تو قارئین اسے زندگی کی سپاٹ کہانی تصور کرکے پسند نہیں کریں گے ۔ شوکت تھانوی نے " مابدولت " میں سچ بول کر اپنے قارئین کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں " میں عرض کرچکا ہوں کہ یہ بھی ایک قسم کا اقدام خودکشی ہے ۔ میں پوری کوشش بھی کروں

---

[1] شوکت تھانوی : " مابدولت " صفحہ 9 بار چہارم ، ادارۂ فروغ اردو ، لاہور ۔

کہ جہاں تک ہو سکے سچ بولوں البتہ شبہ اس سلسلہ میں یوں ہے کہ اگر مہاتما گاندھی کی طرح میری زندگی بھی معصوم ہوتی تو میں جھوٹ موٹ بھی جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرتا مگر یہاں تو سوائے جرائم کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔"[1]

شوکت تھانوی کی اس خود نوشت سوانح عمری میں ایک ملی جلی سی کیفیت نظر آتی ہے کہیں تو انہوں نے خطرناک حد تک سچ بولنے کی کوشش کی ہے اور کہیں واقعات پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ "مابدولت" میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک حسین و جمیل اور تمیزدار خاتون۔ ان کے یہاں دو تین مہینے مہمان رہیں۔ بیگم شوکت تھانوی کو کسی ضروری کام کے سلسلہ میں زرد کوٹھی جانا پڑا اور تمام گھر کی چابیاں ان محترمہ کے حوالہ کردی گئیں۔ شوکت تھانوی رات کو تو زرد کوٹھی میں بیوی کے ساتھ رہتے تھے" مگر دن کو سرپنچ کے دفتر کی وجہ سے اس گھر میں بھی آنا پڑتا تھا اور یہی آنا جانا آخر ایک دن ہم کو لے ڈوبا۔ ادھر سے پسندیدہ نظریں۔ ادھر سے ان نظروں کی پذیرائی۔ شیطان نے ہم دونوں کو اپنی آغوش میں لے کر اس قدر بھینچا کہ دونوں ایک ہوگئے۔"[2]

اس واقعہ سے شوکت تھانوی کی جرأت اور بے باکی ظاہر ہوتی ہے لیکن یہ واقعہ لکھنے کے فوراً بعد انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ پڑھنے والے مصنّف کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہ کرلیں اس لئے اس طرح بات بنانے

---

[1] شوکت تھانوی: "مابدولت" صفحہ 10 ، بار چہارم ، ادارۂ فروغ اردو ، لاہور۔

[2] شوکت تھانوی: "مابدولت" صفحہ 148 ، 149 ، بار چہارم ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور۔

کی کوشش کرتے ہیں ، " ہم ڈوب چکے تھے - پانی سر سے گذر چکا تھا - مگر اس گناہ کے بعد ہی آنکھیں کھل گئیں - سب سے پہلے اپنی اس معصوم بیوی کا خیال آیا جس کی ہم نے خیانت کی تھی اور جو ہم پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کرتی تھی -------- نتائج سے قطعاً بے فکر ہو کر ہم نے ایک اقراری مجرم کی طرح اپنے کو بیوی کے سامنے پیش کردیا - بیوی کے پاس پہنچ کر ہم اس قدر روئے کہ وہ بے چاری بھی پریشان ہوگئی اور رو رو کر ہم نے تمام قصہ من و عن بیان کردیا -" [1]

راقم نے اس واقعہ کے بارے میں بیگم سعیدہ شوکت سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میرے سامنے تو وہ نہ کبھی روئے نہ دھوئے اور نہ کسی جرم کا اقرار کیا - یہ واقعہ میں نے بھی آپ کی ہی طرح " مابدولت " میں پڑھا ہے - شوکت تھانوی کی شخصیت کا ایک اور اہم مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے والدین کی انتھک کوششوں کے باوجود تعلیم مکمل کرنے میں ناکام رہے - میٹرک کا امتحان بھی پاس نہ کر سکے - دوسری شادی کے موقع پر سسرال والوں کو اپنی تعلیمی قابلیت ایف - اے بتائی چونکہ زہرہ بیگم اس وقت ایف - اے کی طالبہ تھیں - "مابدولت" میں انہوں نے جب بھی اپنی تعلیم کا ذکر کیا ہے ، ہمیشہ استاد کو ہی مورد الزام ٹھہرایا - اپنی تعلیم مکمل نہ ہونے کا سبب اپنے اساتذہ کی نالائقی بتائی - اپنے ایک استاد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ : " ایک ماسٹر صاحب بلائے گئے معلوم ہوتا تھا بندر کا تماشہ شروع کریں گے ، ویسی ہی سر پر پگڑی وہی الجھی ہوئی داڑھی ، ہو بہو گڈی نما چہرہ - معلوم نہیں وہ خود بھی کچھ پڑھے لکھے تھے یا نہیں - بہر صورت ہمارے لئے ان سے بہتر معلم بھوپال میں

---

[1] شوکت تھانوی : " مابدولت " صفحہ 149 ، بار چہارم ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور -

گویا کوئی اور نہ مل سکا ۔ ان حضرت نے مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی ریڈروں کو رٹانا شروع کیا مگر کچھ ہی دن پڑھا سکے تھے کہ ایک دن والد صاحب نے ان کو پڑھاتے ہوئے کسی لفظ کے غلط تلفظ پر جو غور کیا تو اسی دن ماسٹر صاحب کا حساب کردیا گیا ۔ اس کے بعد ایک اور ماسٹر صاحب آئے جو چوتھے دن اس لئے نکال دئیے گئے کہ وہ ذرا سخت قسم کے آدمی تھے اور ماربیٹ میں ہاتھ کھلا ہوا تھا ۔" [1]

تحلیل نفسی کے عمل اور اصولوں کی روشنی سے شوکت تھانوی کی شخصیت اور نفسیات کا مطالعہ کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب میں شوکت تھانوی نے اپنی محرومیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے ۔

خود نوشت سوانح حیات کی طرف بیشتر لکھنے والوں نے بڑھاپے میں توجہ کی ہے چونکہ یہ پختگی کا زمانہ ہوتا ہے ۔ پچاس ، ساٹھ سال کی عمر میں پہنچنے کے بعد ماضی کے حالات پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر یہ انتخاب آسانی سے کیا جاسکتا ہے کہ اپنی شخصیت کا کون سا پہلو گفتنی ہے اور کون سا ناگفتنی ـــــ شوکت تھانوی نے " مابدولت " تقریباً چالیس برس کی عمر میں لکھی ۔ اور اسے اپنی لغزشوں کا اعتراف کہا وہ لکھتے ہیں :

" اب زندگی کا اعتبار روز بروز اٹھتا جاتا ہے ۔ کنپٹی کے اوپر اور ناک کے عین نیچے کچھ بال سفید ہوچکے ہیں ۔ قلب کی شکایت روز افزوں ترقی پر ہے ۔ عینک کا نمبر بڑھتا جاتا ہے ۔ یہ سب آثار ہیں وہاں بیشی کے اور حال یہ ہے اب تک کہ دنیا کسی طرح چھوڑتی ہی نہیں نہ روزے کے نہ نماز کے ۔ سوائے مصیبت کے کسی وقت خدا کا نام بھی زبان پر نہیں آتا ۔ اب اگر خدا

---

[1] شوکت تھانوی : " مابدولت " صفحہ 21 ، 22 ، بار چہارم ، ادارۂ فروغ اردو ، لاہور ۔

نے یہ توفیق دی ہے کہ کم سے کم اپنی لغزشوں کا اعتراف ہی کرلیں تو اس توفیق سے دنیا والوں کے ڈر کے مارے ہم آخر کیوں باز رہ جائیں۔ ہم اگر سچ بولنے کے بعد قابل نفرت ثابت ہوتے ہیں تو یہ قصور ہمارا نہیں بلکہ اس سچ کا ہوگا جس سے اب تک بچنے کی ہم نے ایمانداری کے ساتھ پوری کوشش کی۔" [1]

شوکت تھانوی نے اپنے حالات لکھنے سے پہلے "کچّا چٹھا" میں بار بار اس عزم کو دہرایا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کے اعتراف کے طور پر ان واقعات کو لکھ رہے ہیں۔ شوکت تھانوی کی شخصیت میں اہم تبدیلی ان کے والد صاحب کے انتقال کے بعد آئی۔ جب تک والد صاحب زندہ رہے شوکت تھانوی لکھنؤ کی رنگ رلیوں اور شعر و شاعری میں مصروف رہے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو پوری شدت سے محسوس کیا اور معمولی تنخواہ پر ملازمت کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ صحافت کو ذریعۂ معاش بنانے کا فیصلہ کیا اور شوکت صاحب نے اپنے ماموں سے کہا کہ انہیں خان بہادر سیّد احمد حسین صاحب رضوی، مینیجنگ ایڈیٹر روزنامہ "ہمدم" کے پاس لے جائیں اگر انہوں نے اپنے اخبار میں ملازمت دے دی تو وہ اتنی زیادہ محنت کریں گے کہ ترقی کے راستے ان پر کھلتے چلے جائیں گے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: "ماموں صاحب ان باتوں کے قائل تو نہ ہوئے مگر ہم کو لے کر خان بہادر سیّد احمد حسین صاحب رضوی کے پاس گئے۔ سیّد صاحب نے پوری عزیز دارانہ ہمدردی فرمائی اور ہم کو اسی وقت ایک پروانۂ تقرری دے دیا کہ اسے لے کر سیّد جالب دہلوی ایڈیٹر ہمدم سے کل ملنا۔ وہ تم کو مناسب کام دے دیں گے۔ فی الحال تنخواہ چالیس روپیہ ماہوار

---

[1] شوکت تھانوی: "مابدولت" صفحہ 13، 14، بار چہارم، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔

ہے۔ اس کے بعد تم اپنی استعداد سے خود ترقیاں حاصل کرو۔"[1]

شوکت تھانوی کی "مابدولت" اور "کچھ یادیں کچھ باتیں" میں ہمیں شوکت تھانوی کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے اپنے ہم عصروں کا تذکرہ اتنا ہی کیا ہے جتنی اس کی ضرورت تھی۔

خود نوشت سوانح حیات کو ادبی کارنامہ بنانے کے لئے زبان و بیان پر قدرت ہونا ضروری ہے۔ شوکت تھانوی کی "مابدولت" اور "کچھ یادیں کچھ باتیں" دیکھنے کے بعد اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ شوکت تھانوی زبان و بیان پر قدرت رکھتے تھے۔ انہیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ اپنی کہانی کو دل کش اور خیال انگیز کس طرح بنایا جاتا ہے وہ جزئیات کے حسنِ ترتیب سے مکمل مرقع بنانے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ شوکت تھانوی روزنامہ "ہمدم" کے مینجنگ ایڈیٹر کا خط لے کر روزنامہ "ہمدم" کے ایڈیٹر سیّد جالب کے پاس پہنچے تو دیکھا۔ " ترکی ٹوپی پہنے جس کا پھندنا آگے پڑا ہوا تھا اور پھندنے کے نیچے سفید بالوں کا گچھا ٹوپی سے پناہ مانگ کر نکلا بھاگتا تھا۔ پریشان سی سفید داڑھی۔ ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے میں قلم، میز سے کچھ ہی اٹھا ہوا سر۔ اس سج دھج سے ایک بزرگ اس طرح لکھنے میں مصروف تھے گویا اونگھ رہے ہیں۔ میرے آنے کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ لکھتے رہے برابر لکھتے رہے۔ نہ کچھ سوچنا نہ غور کرنا۔ بس لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ اتفاقاً کاتب کے آجانے سے گردن اوپر اٹھی، موقع دیکھ میں نے عرض کیا "السلام علیکم" نہایت کرخت آواز میں جواب میں "وعلیکم السلام" کہا۔

---

[1] شوکت تھانوی: "مابدولت" صفحہ 111، بار چہارم، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔

میں نے خان بہادر صاحب کا خط چپکے سے دے دیا - پڑھ کر دزدیدہ نگاہوں سے پہلے تو دیکھا - اس کے بعد میرا شجرہ شروع کر دیا۔" [1]

خود نوشت سوانح حیات میں اسلوب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر صبیحہ انور لکھتی ہیں " یہ حقیقت ہے کہ آپ بیتی کا گھروندا شخصیت کی بنیاد پر بنتا ہے - مگر اس گھروندے کی آب و تاب کا انحصار ادبی گارے اور مسالے پر ہوتا ہے - عمدہ پچی کاری اور آرائشی ہو تو گھروندا محل بھی بن سکتا ہے - خود نوشت میں حسن بیان اور اندازِ بیان کی بہرحال اہمیت ہوتی ہے۔ یہ کام منجھا ہوا ادیب ہی آسانی سے کر سکتا ہے -" [2]

اندازِ بیان کے اعتبار سے شوکت تھانوی ایک منجھے ہوئے ادیب تھے۔ ان کی بیشتر کتابوں کی طرح " مابدولت " بھی پبلشر کے تقاضے کی وجہ سے لکھی گئی - " مابدولت " میں وہ لکھتے ہیں کہ " ادارۂ فروغ اردو لاہور کے مالک محمد طفیل صاحب اس وقت لکھنؤ میں موجود ہیں - آپ کا اس خاکسار کے متعلق جو کچھ بھی خیال ہے اس کو تو آپ ہی جانتے ہوں گے - مگر آپ اس نیاز مند سے کام لیتے ہیں ٹائپ رائیٹر کا اور خیال آپ کا بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ لاہور سے آ کر محض آپ کا یہ کہہ کر بیٹھ جانا ہی کافی ہوتا ہے کہ اے ٹائپ رائیٹر لکھ دے ایک کتاب جلدی سے چنانچہ آپ بیٹھے رہتے ہیں اور ٹائپ رائیٹر لکھتا رہتا ہے - یہ کتاب بھی آپ نے اسی ٹائپ رائیٹر سے اسی طرح لکھوائی ہے اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کے متعلق ہمارے ذہن میں کچھ نوٹ

---

[1] شوکت تھانوی : " کچھ یادیں کچھ باتیں " صفحہ 74 ، 75 ، 1964ء ، بار اول ، ادارۂ فروغ اردو ، لاہور

[2] ڈاکٹر صبیحہ انور : اردو میں خود نوشت سوانح حیات ، صفحہ 251 ، 252 ، نامی پریس ، لکھنو -

پہلے سے تیار تھے ۔ مگر ان کو تحریری شکل میں ترتیب کے ساتھ لانا اور وہ بھی اس صورت میں کہ پاسبانِ عقل کسی وقت بھی دل کو تنہا نہ چھوڑے ایک عجیب قسم کی سزا ہے ۔ "[1]

شوکت تھانوی کو " مابدولت " ایک ٹائپ رائیٹر کی طرح لکھنی پڑی ڈاکٹر صبیحہ انور نے " مابدولت " کو مزاحیہ خود نوشت کہا ہے ۔[2] ہماری رائے میں یہ مزاحیہ خود نوشت نہیں ہے بلکہ یہ ایک سنجیدہ خود نوشت ہے اس میں شوکت تھانوی نے اپنی زندگی کے حالات سنجیدگی سے شگفتہ اسلوب بیان میں لکھے ہیں ۔

خود نوشت سوانح حیات دوسری اصناف کے مقابلے میں ایک اہم اور مشکل صنف ادب ہے ۔ شوکت تھانوی نے اس مشکل صنف ادب کا ایک حصہ " مابدولت " اس صنف میں شوکت تھانوی کا ابتدائی کارنامہ ہے وہ اس کا دوسرا حصہ بھی پیش کرنا چاہتے تھے :

> " " مابدولت " کے بعد دوسرا حصہ ایں جانب ابھی پیش ہونے والی چیز نہیں بلکہ اس کو ہم برابر مرتب کرتے رہیں گے اور غالباً وہ اس وقت پیش ہو سکے گی جب پیش کرنے والا دنیا کی جوابدہی کے بجائے کسی اور جوابدہی میں مبتلا ہوگا ۔ "[3]

---

[1] شوکت تھانوی : " مابدولت " صفحہ 5 ، بار چہارم ، ادارۂ فروغ اردو ، لاہور ۔

[2] ڈاکٹر صبیحہ انور : اردو میں خود نوشت سوانح حیات ، صفحہ 342 ، نامی پریس ، لکھنو ۔

[3]

شوکت تھانوی کے قلم سے نکلے ہوئے یہ الفاظ درست ثابت ہوئے چونکہ ان کی دوسری خود نوشت سوانح حیات " کچھ یادیں کچھ باتیں " کے نام سے ان کے انتقال کے بعد کتابی صورت میں شائع ہوئی ۔ اس دوسرے حصہ میں بھی 1938ء سے پہلے کے حالات بیان ہوئے ، بعد کے حالات وہ لکھنا چاہتے تھے لیکن مرض الموت میں مبتلا ہوگئے اور یہ داستان نا تمام رہ گئی۔ اس ناتمام آپ بیتی "کچھ یادیں کچھ باتیں" کی بہ نسبت " مابدولت " کی زیادہ اہمیت ہے اس میں واقعات کو ربط و تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جبکہ "کچھ یادیں کچھ باتیں" میں یہ ربط و تسلسل مفقود نظر آتا ہے ۔

آٹھواں باب

صحافت

صحافت یا جرنلزم حقائق سے راست طور پر آگاہی کا نام ہے ۔ اس میں واقعات کی عکاسی کی جاتی ہے ۔ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے کالم نگار کا بیان ہے کہ انگریزی لفظ جرنل (JOURNAL) لاطینی لفظ (DIURNALIS) سے ماخوذ ہے ۔ فرانسیسی میں جرنل کے اصلی معنی " روزآنہ " کے ہیں ۔[1]

جدید عربی میں اخبار کے لئے " جریدہ " کی اصطلاح مستعمل ہے اس کا مترادف " صحیفہ " ہے جو بہ صورت واحد کم استعمال ہوتا ہے لیکن بصیغۂ جمع یعنی صحف کا استعمال جرائد کی نسبت عام ہے ۔[2]

مشہور ادیب و ڈرامہ نگار جارج برنارڈ شاہ نے کہا ہے کہ اعلی ادب اور بلند پایہ ادبی شہ پارے درحقیقت " صحافت " ہیں ۔ [1]

(ALL GREAT LITERATURE IS JOURNALISM)

صحافت کا زندگی سے اور زندگی کا ادب سے چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ آج مغرب میں ادب اور صحافت نہ صرف دوش بدوش ہیں بلکہ زندگی کی ہمہ ہمی میں دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ۔ ادب اب زندگی کا ترجمان بن گیا ہے اور زندگی واقعات کے گرد و پیش سے اپنا واسطہ نہیں توڑ سکتی ۔ صحافت کا انسانی جذبات و احساسات سے گہرا تعلق ہے بعض مرتبہ ایک افسانہ یا نظم سے زیادہ کسی اخبار کی سرخی ہمارے جذبات و احساسات کی دنیا میں

---

[1] انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا ، جلد 13 ، صفحہ 94 ، مطبوعہ امریکہ ، 1970۔

[2] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ، جلد 7 صفحہ 179 مطبوعہ لاہور ۔ 1971ء ۔

آگ لگا دیتی ہے۔ اخبار کا ایک کارٹون تک لوگوں کی قسمت بناتا یا بگاڑتا ہے۔

دنیا کے اکثر ادیبوں نے پہلے پہل اخباروں اور رسالوں کے لئے مضامین لکھنے شروع کئے اور بعد میں ان کی تحریروں کو ادبی اہمیت حاصل ہوئی۔ امریکہ برطانیہ، فرانس اور جرمن وغیرہ میں ایسے بے شمار صحیفہ نگار ملیں گے جنہوں نے صحافت کے ذریعہ ہی ادب اور سیاست میں نمایاں شہرت اور کامیابی حاصل کی ان میں مشہور امریکی سائنس داں، مصنّف، سفیر، سیاست دان بنجامن فرینکلن BENJAMIN FRANKLIN مشہور ناول نگار مارک ٹوین MARK TWAIN امریکی صدر جمہوریہ روز ولٹ ROOSEVELT مشہور ناول نگار ڈینیل ڈیفو DANIEL DEFOE مشہور مفکر، مقرر، ناول نگار چارلس ڈکنس CHARLES DICKENS مشہور سیاست دان و وزیر اعظم انگلستان ولیم گلائیڈ اسٹون WILLIAM GLAD STONE ممتاز ادیب و ڈرامہ نگار جارج برنارڈ شاہ G.B.SHAW اور مشہور سیاست دان برطانیہ کے وزیر اعظم چرچل CHURCHILL خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ [1]

اردو زبان کے متعدد ادیبوں، شاعروں، محقّقوں اور نقّادوں کا بھی صحافت سے گہرا تعلق رہا ہے۔ صحافت کے ذریعہ ہی انہیں شہرت و عزت ملی۔ شوکت تھانوی بھی اس قسم کے ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز 1920ء میں ہو چکا تھا۔ اس وقت وہ گورنمنٹ حسین آباد ہائی اسکول لکھنؤ کی ساتویں جماعت کے طالب علم تھے۔ اس زمانے میں وہ اپنے اسکول کے دوستوں کے لئے " قلمی رسالہ " نکالتے تھے۔ " ماہدولت " میں انہوں نے اس بات پر اس طرح روشنی ڈالی:

" اس زمانہ میں ہم نے اپنے اسکول کے دوستوں کے لئے ایک قلمی رسالہ بھی جاری کیا تھا ۔ اس رسالہ کو خود نہایت خوشخط لکھتے تھے ۔ اس میں کارٹون بناتے تھے ۔ نظمیں ہوتی تھیں اور احباب پر چوٹیں ہوا کرتی تھیں ۔ یہ قلمی رسالہ حلقۂ احباب میں بہت مقبول تھا ۔ اس کا ہر نمبر جو صرف ایک ہی ہوتا تھا ، احباب کے یہاں ایک ایک دن مہمان رہتا تھا اور گشت ختم کرکے پھر ہمارے پاس آجاتا تھا ۔ پندرہ دن کے بعد دوسرا نمبر نکلتا تھا مگر اس کے غالباً چار ہی پانچ نمبر نکل سکے ۔ " [1]

1925ء میں شوکت تھانوی ایک دن پاشا نالہ کے بازار سے گذر رہے تھے ۔ کہ ایک دھندلا سا سائن بورڈ نظر آیا جس پر لکھا تھا " رسالہ حُسنِ ادب لکھنؤ " اور سامنے ہی ایک صاحب کرتا اُتارے ، پاجامہ پہنے ، سر منڈا ہوا ، بیٹھے تھے ۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ خود ہی اس رسالہ کے مالک تھے ۔ خود ہی مدیر تھے ۔ خود ہی کاتب اور خود ہی پریس مین تھے ۔ اور آپ کا نام منشی واحد علی لطف لکھنوی ہے ۔ دوران گفتگو انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ ایک معقول آدمی کی تلاش میں ہیں جس کا نام ادارت میں دیا جاسکے ۔ کافی دیر گفتگو کرنے کے بعد شوکت تھانوی نے ایک سے زیادہ مضامین دینے کا وعدہ کیا اور دوسرے ہی دن اس وعدے کو وفا بھی کردیا ۔ منشی واحد علی نے ان مضامین کو دیکھ کر کچھ غور کرنے کے بعد فرمایا :

> " اگر میں آپ کا نام ایڈیٹری میں دے دوں ۔ ہم کو اس کی امید بھی نہ تھی کہ ہمارے حصہ میں یہ اعزاز آنے والا ہے ۔ ہم نے کچھ دیر تامل کیا ۔ غور کرتے رہے کہ یہ اعزاز قبول کرنا چاہئیے یا نہیں -----

---

[1] شوکت تھانوی : ما بدولت ، مطبوعہ نقوش پریس لاہور ، بار چہارم ، ص 70 ۔

مختصر یہ کہ ہم نے ذمہ داری کو قبول کرلیا اور رسالہ کا دوسرا ہی روپ ہوگیا ۔ اب جو تازہ نمبر نکلتا ہے تو سرورق پر لکھا تھا ۔ ایڈیٹر ملک التحریر شیخ محمد عمر شوکت تھانوی ۔ یہ ملک التحریر اس لئے تھا کہ کسی رسالہ کے سرورق پر ایڈیٹر کی بجائے "رئیس التحریر" ہماری نظر سے گذر چکا تھا ۔ لہذا ہم نے اپنے لئے ملک التحریر سے کم کوئی درجہ مناسب نہ سمجھا ۔" [1]

صحافتی زندگی میں کالم نویسی ایک بہت مشکل فن ہے ہر کالم نویس کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ ہر روز نئے موضوع پر نئے افکار و خیالات اور نیا مواد کس طرح مہیا کیا جائے ۔ اس کے لئے اس کا مشاہدہ اور مطالعہ اس کی مدد کرتے ہیں ۔ جتنی اس کے مشاہدہ میں گہرائی اور مطالعہ میں وسعت ہوگی اتنا ہی اچھا وہ کالم نویس بن سکے گا ۔ فکاہی کالموں میں ہمیشہ ایسے واقعات و معاملات کو بنیاد بنایا جاتا ہے جن سے مزاح کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکلتا ہو۔ ان کالموں میں قارئین کو دلچسپی اور تفریح کا مواد بہم پہنچانے کے لئے الفاظ سے کھیلا جاتا ہے ۔ زبان کی چاشنی کو اولیت دی جاتی ہے ۔ اس قسم کے کالم عموماً زبان و بیان پر قدرت رکھنے والے اچھے ادیب ہی لکھ سکتے ہیں ۔ شوکت تھانوی نے فکاہی کالم لکھنے کا باقاعدہ آغاز 1928ء میں کیا جب انہوں نے مولانا ارشد تھانوی کے ہفتہ وار "تحریک" میں فکاہیہ کالم "لالہ زار" لکھنا شروع کیا ۔ لکھنؤ کے ماحول نے شوکت تھانوی کی زبان میں اتنی چاشنی پیدا کردی تھی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص صرف فکاہیہ کالموں کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہے ۔ فکاہیہ کالم نگاری کے جس سلسلے کا آغاز 1928ء میں

---

[1] شوکت تھانوی : مابدولت ، مطبوعہ نقوش پریس لاہور ، بار چہارم ، ص: 88 ، 89 ۔

ہوا تھا ، وہ پھر تا حیات جاری رہا ۔ " پہاڑ تلے " شوکت تھانوی کا آخری کالم ان کے انتقال کے تیسرے دن 7 ، مئی 1963ء کو " جنگ " راولپنڈی کی اشاعت میں شامل ہوا ۔ جس میں انہوں نے اپنی مختصر غیر حاضری کی معذرت کرتے ہوئے اپنی علالت کا تذکرہ کیا ہے ۔

شوکت تھانوی کے والد کا انتقال 20 ، اپریل 1928ء کو ہوا تو انہیں ملازمت کا خیال آیا ۔ اس وقت ان کی عمر 22 ، 23 برس تھی ۔ ان کے رشتہ دار ان کی طرف سے مطمئن نہیں تھے ۔ خود شوکت تھانوی کے ایما پر ان کے ماموں انہیں خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی ، مینجنگ ایڈیٹر روزنامہ " ہمدم " کے پاس لے کر گئے تو انہوں نے پوری عزیز دارانہ ہمدردی فرما کر اسی وقت شوکت تھانوی کو " ہمدم " میں گویا ملازم رکھ لیا ۔ اور کہا کہ فی الحال تمہاری تنخواہ چالیس روپے ماہوار ہے جتنی زیادہ محنت کروگے اتنی ہی ترقی حاصل کرتے چلے جاؤگے ۔

شوکت تھانوی اپنی تقرّری کا پروانہ لے کر دوسرے دن جالب دہلوی ایڈیٹر روزنامہ " ہمدم " کے پاس پہنچے تو وہ بہت خندہ پیشانی سے ملے اور انہیں قاضی محمد حامد حسرت کے پاس بھیج دیا ۔ آپ " ہمدم " کے مینجر بھی تھے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی ۔ قاضی صاحب بھی ان سے اس طرح ملے جیسے وہ ان سے پہلے سے واقف تھے انہوں نے اپنے ہی کمرے میں شوکت تھانوی کے لئے ایک علیحدہ میز لگوا دی ۔ " بعد میں معلوم ہوا کہ خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی نے قاضی صاحب کو کل ہی بلا کر اِن سے کہہ دیا تھا کہ شوکت تھانوی میرے عزیز ہیں ان کا خاص خیال رکھا جائے --- -- سب سے پہلے ہم کو یہ کام بتایا کہ آپ " ہمدم " کے دو مہینے کے فائل لے کر تمام مقالاتِ افتتاحیہ اور شذرات پڑھ ڈالئے تا کہ آپ کو حالات حاضرہ کے علاوہ ہمدم

کی پالیسی کا اندازہ ہوجائے ---- آخر تین دن میں ہم نے دو مہینے کے فائل پڑھ ڈالے ، مقالاتِ افتتاحیہ کو پڑھا ، شذرات پر نظر ڈالی اور مزاحیہ کالم دو دو باتیں بھی پڑھ ڈالیں - اب قاضی صاحب نے ہم سے چھوٹے چھوٹے شذرات لکھوانا شروع کئے اور کچھ ترجمہ کا کام ہمارے سپرد ہوا - خبروں کے ترجمہ میں تو کوئی خاص بات نہ تھی مگر شذرات سید جالب صاحب کے پاس بھیج دئیے جاتے تھے اور ان پر سید جالب صاحب سرخ روشنائی سے اس طرح اصلاح فرماتے تھے کہ تمام سیاہ عبارت پر سرخ عبارت طاری ہو کر رہ جاتی تھی۔" [1]

روزنامہ " ہمدم " کی ملازمت سے شوکت تھانوی نے صحافت کا باقاعدہ آغاز کیا - ابتداء ہی میں انہیں سیّد جالب دہلوی جیسے مہربان اور تجربہ کار انسان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا - انہوں نے قدم قدم پر ان کی رہنمائی کی- وہ ہر تحریر پر اصلاح دینا اپنا فرض سمجھتے تھے - بعض اوقات شوکت تھانوی ان کی اصلاحوں کو سمجھنے سے قاصر ہوتے تھے ایک مرتبہ شوکت تھانوی نے اپنی کسی تحریر میں " نقطۂ نظر " لکھا تو سید جالب دہلوی نے اسے کاٹ کر " زاویۂ نظر " کر دیا - شوکت تھانوی اس کے فرق کو نہ سمجھ سکے اور سیّد صاحب کے پاس پہنچکر کہا کہ :

" میں یہ سمجھا نہیں کہ آپ نے نقطۂ نظر کاٹ کر زاویۂ نظر کیوں بنا دیا ہے - میرے نزدیک تو کوئی ایسا فرق ان دونوں میں نہیں ہے - سیّد صاحب نے اسی طرح نہایت بے پروائی سے بغیر سانس لئے فرمایا بہت بڑا فرق ہے - نقطۂ نظر کا مفہوم یہ ہے کہ جو بات آپ کہہ رہے ہیں اس کی اصلیت پر آپ کی نگاہ تیقن کے ساتھ پہنچ چکی ہے اور اب اس میں آپ کے نزدیک کسی قسم کا

---

[1] شوکت تھانوی : مابدولت ، مطبوعہ نقوش پریس ، ص: 113 ، 114 -

شبہ نہیں ہے اور زاویۂ نظر کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کی نظر اس نقطہ کے اردگرد منڈلا رہی ہے یعنی وہ بات جو آپ بیان کر رہے ہیں غلط بھی نکل جائے تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمارا نقطۂ نظر نہیں بلکہ زاویۂ نظر تھا۔ ایک اخبار نویس کی حیثیت سے آپ کے لئے ضروری ہے کہ آپ ذمہ داری صرف اس بات کی لیں جس کے متعلق آپ کو واقعی یقین ہو کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔"[1]

سیّد جالب دہلوی بہت صاحب نظر اخبار نویس تھے۔ ایسے شخص کی شاگردی اختیار کرنا یقیناً قابلِ فخر بات ہے۔ سیّد صاحب کے بارے میں تمام عملہ کو یہ شکایت تھی کہ وہ کبھی کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ وہ صرف ذہانت اور محنت کی قدر کیا کرتے تھے۔ شوکت تھانوی کی ذہانت اور ان کی سنجیدہ تحریروں میں شگفتگی کو دیکھ کر انہوں نے اپنے اخبار کا فکاہیہ کالم " دو دو باتیں " ان سے لکھوانے کا فیصلہ کیا۔ سیّد صاحب کو اس بات کا احساس تھا کہ مزاحیہ کالم لکھنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ مزاح نگار کو نہایت باریک پگڈنڈی پر چلنا پڑتا ہے اس طرف ذرا سا ہٹ جائے تو پھکڑ بن کر رہ جاتا ہے اور اس طرف ہٹ جائے تو سنجیدہ بن جاتا ہے۔ مزاح نگاری کے لئے فطری رحجان کا ہونا ضروری ہے۔ اور ان کی دور بیں نگاہ نے یہ فطری رحجان شوکت تھانوی کے ہاں پالیا تھا۔ انہوں نے شوکت تھانوی کو شوکت تھانوی بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ شوکت تھانوی ان کی علمیت سے ہر جگہ مرعوب نظر آتے ہیں انہوں نے ہر جگہ ان کا تذکرہ بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ کیا ہے " شیش محل " میں ان کا خاکہ لکھتے ہوئے ان کی شخصیت کے ایک پہلو پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں :

---

[1] شوکت تھانوی : مابدولت ، مطبوعہ نقوش پریس لاہور ، ص: 115 ، 116۔

" میر صاحب کو زندہ انسائیکلو پیڈیا کہا جاتا تھا ۔ کسی موضوع پر گفتگو کیجئے بات کریں گے بات کی جڑ بتائیں گے یہاں تک کہ پھنگی بھی بتا جائیں گے ۔ حلوہ سوہن ، خمیرہ ، سرطان ، مثنوی مولانا روم ۔ خاندانِ پہلوی ، گاماں پہلوان ، پلاؤ کی پُخت ، عرض تو کیا کوئی موضوع لے لیجئے گھنٹوں تقریر کریں گے اور اس وثوق سے موضوع کے ہر پہلو کو نمایاں کریں گے گویا یہ آپ کا خاص سبجیکٹ رہا ہے ۔" [1]

اخبار کی انتظامیہ سے اَن بن ہونے کی وجہ سے سیّد جالب دہلوی " ہمدم " سے علیحدہ ہوگئے ۔ ان کی علیحدگی کے بعد " ہمدم " کی اِدارت ایک ہفتہ تک ملک نصراللہ خاں عزیز نے کی ان کے بعد قاضی محمد حامد حسرت قائم مقامی کرتے رہے اور صرف دو دن کے لئے شوکت تھانوی کے پاس چارج رہا پھر چوہدری رحم علی ہاشمی نے باضابطہ ادارت سنبھال لی ۔ اس طرح روزنامہ " ہمدم " کے دوسرے دور کا آغاز ہوا ۔ یہاں پہلے دور کا ایک کالم " دو دو باتیں " پیش کرنا بے محل نہیں ہوگا جس سے شوکت تھانوی کے اندازِ تحریر کے بارے میں بہت سی باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں :

" قرطاسِ ابیض کے متعلق ہم تو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ آپ کوئی نہایت ہی عالم فاضل باشرع بزرگ ہوں گے ۔ بڑی سی داڑھی ہوگی ، لمبی سی تسبیح رکھتے ہوں گے بڑا سا عمامہ باندھے عبا وغیرہ پہنے ہوئے بالکل رمضان شریف کی طرح اونٹ پر سوار تشریف لائیں گے اور خود اپنے السلامُ علیکم سے اپنی آمد کی اطلاع دیں گے لیکن جب 18 ، مارچ کی صبح کو یہ شور بلند ہوا کہ

---

[1] شوکت تھانوی : شیش محل ، مطبوعہ استقلال پریس لاہور ، ص : 82 ۔

" قرطاس ابیض " آگیا تو خاکسار پاتونی نے ہر شتر سوار کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا مگر جناب مولانا قرطاس ابیض کا کہیں پتہ نہ تھا ۔ وہ کس راستے سے تشریف لائے اور کہاں گئے ، مجبوراً لوگوں سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ آپ اخبار پانیر میں تشریف رکھتے ہیں اب جو پانیر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوا کہ

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

بہر حال ہم نے شروع سے آخر تک اس قرطاس کو دیکھا اور سمجھنے کی کوشش کی ۔ اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو ایک معمولی سی سمجھ کے انسان کے ذہن میں نہ آجاتی چہ جائیکہ ہم ، مختصر یہ کہ ہم نے اس کو ایک مرتبہ رواں اور دوسری دفعہ مع مضمون کے پڑھ کر بخوبی سمجھ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اب چپ رہو ۔ ذرا دیکھو تو دوسری بڑی بڑی کھوپڑیوں والے کیا فرماتے ہیں بیچ اس مسئلہ کے ۔ اس کے بعد میاں پاتونی تم بھی اکثریت کی ہاں میں ہاں ملا دینا یہی تمہاری رائے ہوگی اور دراصل یہی محفوظ ترین رائے ہے بلکہ موجودہ زمانے کے تدبّر کا راز اسی ایک نکتہ میں پنہاں ہے کہ انسان اقلیت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے بس چپکے سے اکثریت کے ساتھ ہوجائے ورنہ نتیجہ یہی ہوگا کہ تمام دنیا انگشت نمائی کرے گی اور اس انگشت نمائی کی تاب ظاہر ہے کہ صرف وہی لوگ لا سکتے ہیں جو سچ مچ کے پڑھے لکھے ہوں اور بہر حال اپنے لئے امن اسی میں ہے کہ جو سب کی رائے وہی ہماری ورنہ اختلاف کر کے کون وجہ بتاتا پھرے اور کیا بتائے ؟ ۔[1]

1930ء میں سیّد جالب دہلوی " ہمدم " سے علیحدہ ہوئے تو چوہدری رحم علی ہاشمی باضابطہ طور پر اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے ۔ وہ اردو اور

---

[1] ماخوذ ۔ شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت از احمد جمال پاشا ، مطبوعہ نظامی پریس لکھنو ، ص: 21 ، 22 ، 23 ۔

انگریزی صحافت کا وسیع تجربہ رکھتے تھے ۔ شوکت تھانوی نے ان کے ماتحت کام کرکے ان کے تجربہ سے استفادہ کیا ۔ " دو دو باتیں " کا کالم اب بھی شوکت تھانوی ہی کے سپرد رہا ۔ اس زمانہ میں علامہ سیماب اکبرآبادی سے " دو دو باتیں " میں ہمدم کی معاصرانہ نوک جھونک جاری تھی اور اب اس ناخوشگوار بحث نے باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کرلی تھی ۔ علامہ نے اپنے اخبار کےعلاوہ اپنے ایک شاگرد خواجہ ستار الحسن جمیل مدیر ہفت روزہ " فرشتہ " سے بھی ہمدم کے خلاف آتش فشانی شروع کرادی ۔ " فرشتہ " کی ایک تحریر کا جواب دیتے ہوئے باتونی نے لکھدیا کہ " فرشتہ تو فرشتہ اس معلم الملکوت تک کے فرشتوں کو کیا اس کی خبر نہیں کہ " ہمدم " روزانہ اخبار ہے اور یہ گنڈے دار چھپنے والے ہفتہ وار اخبار اس کی روزانہ کی چوٹوں کا اگر ہفتہ میں ایک بار بھی جواب دے سکیں تو بھی ہفتہ کے باقی چھ دن سہلاتے گذر جایا کریں گے ۔ علامہ سیماب نے " تاج " آگرہ میں اس کا فوراً جواب دیا کہ ؎

ادب باقی ہے اب ان میں نہ استعداد باقی ہے
فقط طاغوتیوں کی فکرِ مادر زاد باقی ہے
کوئی ہمدم کے " باتونی " سے جا کر صرف یہ کہدے
کہ شیطاں مر گیا ، اس کی مگر اولاد باقی ہے [1]

سنجیدہ قسم کے بزرگ اس ناخوشگوار بحث کو ختم کرانا چاہتے تھے ۔ چنانچہ چوہدری رحم علی ہاشمی نے اس جنگ کو ختم کرنے کے لئے شوکت تھانوی سے اصرار کیا ۔ شوکت تھانوی نے رسالہ " پیمانہ " میں سیماب کی تازہ غزل پر

---

[1] احمد جمال پاشا : شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت ، مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ ، ص: 29 ۔

سخت تنقید کرتے ہوئے لیکن اس کے مقطع سے جس کا ایک مصرعہ یہ تھا ع سیماب حقیقت میں فطرت کا تمسخر ہے فائدہ اٹھاتے ہوئے لکھدیا کہ اب جبکہ مولانا نے خود اس حقیقت کو تسلیم کرلیا ہے اب ہم مولانا کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے اور آج سے ہم اس بحث کو ختم کر رہے ہیں۔

1930ء میں رسالہ " انکشاف " لکھنو نے " ظریف نمبر " نکالنے کا فیصلہ کیا تو " انکشاف " کے ایڈیٹر نسیم انہونوی ، چوہدری رحم علی ہاشمی کی معرفت شوکت تھانوی سے ملنے اور مضمون لینے کے لئے آئے۔ ہاشمی صاحب نے نسیم انہونوی کو شوکت تھانوی سے ملوا دیا۔ اس ملاقات کے بعد دونوں کی دوستی اتنی بڑھی کہ یک جان و دو قالب والا معاملہ ہوگیا۔ نسیم انہونوی نے " انکشاف " کا سالنامہ " ظریف نمبر " فروری 1930ء میں بڑے دھوم دھام سے نکالا۔ اس نمبر کو شوکت تھانوی نے مرتب کیا تھا اور ہندوستان کے تمام مزاح نگاروں کی تخلیقات اس میں چھپی تھیں۔ اس نمبر کے اداریے میں شوکت تھانوی نے " بیگار " کے عنوان سے لکھا تھا :[1]

" کس کی بکری اور کون ڈالے گھاس ، یعنی رسالہ ایک آنہ فنڈ کا ، ایڈیٹر اس کے میاں نسیم صاحب اور شذرات لکھیں مولانا شوکت تھانوی ، گویا مولانا شوکت تھانوی نہ ہوئے کرایہ کے بلکہ بیگار کے ٹٹو ہوگئے کہ چاہے فٹن میں جوت دیا ، چاہے تانگہ میں لگا دیا ، ہم کو دلکی چلنے سے کام ، یہ رمضان شریف کا زمانہ دیکھئیے ، یہ عید کی آمد اور اس سلسلہ میں ہندوستان کے رسائل کے عید نمبر میں ہمارے مضامین کا شریک ہونا ملاحظہ فرمائیے اور پھر سر پر سو دُرّے یہ شذرات لکھنا دیکھئیے ، شذرات کیا لکھ رہے ہیں

حق دوستی بھگت رہے ہیں۔ "[1]

" انکشاف " کا یہ ظریف نمبر بے حد مقبول ہوا مگر نسیم انہونوی صاحب کا اس کی پالیسی سے اختلاف ہوگیا اور وہ اس سے کنارہ کش ہوگئے۔ ایک سال کے بعد شوکت تھانوی کے مشورے سے ہفتہ وار " سرپنچ " نکالا جس کی ادارت شوکت تھانوی کے سپرد کی ہفت روزہ سرپنچ " لکھنو کا پہلا شمارہ شوکت تھانوی کی ادارت میں ستمبر 1931ء میں نکلا۔ " اودھ پنچ " اس زمانے میں مائل بہ زوال تھا اس لئے اودھ پنچ کے بہت سے لکھنے والے " سرپنچ " کے صفحات پر نظر آنے لگے۔ ان میں ظریف لکھنوی، چودھری محمد علی ردولوی اور شہباز بلند پرواز کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں " سرپنچ " کا آغاز " اودھ پنچ " کے انداز میں کیا گیا تھا اس لئے اس کا سائز، سرورق تہذیب و ترتیب، شذرات، کالم، تبصرے، کارٹون وغیرہ میں مماثلت و مشابہت پائی جاتی ہے۔ معیار کے اعتبار سے جب ہم ان دونوں پرچوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں " اودھ پنچ " کے لکھنے والوں کی تحریریں بہت معیاری معلوم ہوتی ہیں۔ اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں منشی سجاد حسین، شیخ ممتاز حسین عثمانی، رتن ناتھ سرشار، اکبر الہ آبادی، مچھو بیگ ستم ظریف نواب سید محمد آزاد کی تحریروں میں طنز و مزاح کے علاوہ علمیت بھی نظر آتی ہے جبکہ " سرپنچ " کے لکھنے والوں کی تحریروں میں لاابالی سا انداز نظر آتا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اودھ پنچ کے بعد طنز و ظرافت کا سب سے بڑا خزانہ ہمیں سرپنچ ہی میں نظر آتا ہے۔ احمد جمال پاشا اپنی کتاب میں اس

---

[1] اداریہ از شوکت تھانوی، ماہنامہ " انکشاف " لکھنو، ظریف نمبر فروری 1930ء۔

موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

> " اودھ پنچ کے بعد سرپنچ کا ہمارے مزاحیہ ادب میں سب سے اہم مقام ہے ۔ سرپنچ نے مزاح نگاروں کی ایک پوری نسل کو جنم دیا ، شائستہ ظرافت اور مزاح کے لئے فضا پیدا کی اور کاروانِ طنز و ظرافت کو ایک نئی منزل عطا کی ۔ سرپنچ کے خس و خاشاک میں بھی زعفران کی آمیزش اور خوشبو ہے غرض " سرپنچ " شوکت تھانوی کا ایک ایسا محترم کارنامہ ہے جو ہمیشہ ان کے نام کو زندہ اور سربلند رکھے گا ۔ "[1]

1932ء میں " ہمدم " کی انتظامیہ نے اسے بند کرنے کا فیصلہ کیا تو شوکت تھانوی کی ملازمت خطرے میں پڑگئی ۔ ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ روزنامہ " اودھ " اخبار میں ایک اسسٹنٹ ایڈیٹر کی اسامی کا پتہ چلا ۔ لہٰذا شوکت تھانوی اس اخبار کے قائم مقام ایڈیٹر سیّد نورالحسن سے ملے ۔ ابھی اِدھر اُدھر کی باتیں جاری تھیں اور شوکت تھانوی نے اپنے آنے کا مقصد ظاہر نہیں کیا تھا کہ سیّد نورالحسن نے انہیں " اودھ اخبار " میں ملازمت کی پیش کش کی ۔ شرائط طے ہوئیں اور شوکت تھانوی " اودھ اخبار " کے عملۂ ادارت میں شامل ہوگئے ۔ یہاں آکر بھی انہوں نے ہمدم والا کالم " دو دو باتیں " جاری کیا ۔ کبھی کبھی اداریہ لکھنے کا کام بھی ان کے سپرد کردیا جاتا تھا ۔ اس اخبار کے شب و روز شوکت تھانوی نے اپنی کتاب میں اس طرح بیان کئے ہیں :

---

[1] احمد جمال پاشا : شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت ، مطبوعہ نظامی پریس لکھنو ، ص: 37 ۔

" دراصل اس وقت اس اخبار کی حیثیت اخبار کی تھی ہی نہیں بلکہ مالکان اخبار کا مقصد صرف یہ تھا کہ چونکہ منشی نولکشور صاحب آنجہانی نے اس اخبار کو جاری کیا تھا لہذا یہ سرنامہ پر ان کی تصویر کے ساتھ نکلتا رہے جس طرح بھی نکلے ۔ البتہ چونکہ بہت پرانا اخبار تھا لہذا ولایتی کمپنیوں کے اشتہارات اس کے پاس کافی تھے ۔ مگر پھر بھی غالباً خسارہ میں چل رہا تھا ۔ ہم نے اس اخبار کے دفتر میں کام کرکے یہ تماشا دیکھا کہ جس کا جس وقت جی چاہا چلا آیا اور جو جی چاہا کام کیا ۔ کوئی پرسانِ حال نہ تھا ۔ خود ایڈیٹر صاحب اس قدر کم سخن تھے کہ کسی سے کچھ کہہ ہی نہ سکتے تھے ۔ عملۂ ادارت والے یہ کرتے تھے کہ قلم سے زیادہ قینچی سے کام لیا جاتا تھا ۔" [1]

سیّد نورالحسن نے اس اخبار کی ادارت سے استعفیٰ دیا تو شوکت تھانوی کو ایڈیٹر بنا دیا گیا " اودھ اخبار " کے ایڈیٹر جیل گئے ہوئے تھے نورالحسن صاحب قائم مقام ایڈیٹر تھے اسی طرح شوکت تھانوی کو بھی قائم مقام ایڈیٹر بنایا گیا ۔ اسی زمانہ میں منشی بشن نرائن کا انتقال ہوگیا جو نول کشور اسٹیٹ کے مالک تھے اور تمام اسٹیٹ مع اخبار کے کورٹ آف وارڈس میں چلا گیا اس لئے کہ نئے مالک کے بالغ ہونے میں کچھ عرصہ تھا ۔ اس انقلاب کا شوکت تھانوی کو یہ فائدہ ہوا کہ جیل سے آنے کے باوجود اودھ اخبار کے اصل ایڈیٹر اِدارت پر واپس نہ آ سکے ۔ اور شوکت تھانوی بحیثیت ایڈیٹر کام کرتے رہے لیکن کچھ عرصہ کے بعد کورٹ آف وارڈس کے افسران نے انہیں اسسٹنٹ ایڈیٹری پر واپس کردیا اور ایک نئے صاحب کو ایڈیٹر بنا کر بھیج دیا ۔ شوکت تھانوی نول کشور اسٹیٹ

---

[1] شوکت تھانوی : مابدولت ، مطبوعہ نقوش پریس ، لاہور ، ص : 131 ، 132 ۔

کی ملازمت کو ایک قسم کی پنشن سمجھتے تھے اس لئے اسسٹنٹ ایڈیٹری کو بھی قبول کرلیا ۔

شوکت تھانوی لکھنو کی زرد کوٹھی میں رہ کر بیک وقت یہ دو ملازمتیں یعنی اودھ اخبار کی ملازمت اور سرپنچ کی ادارت نہیں کرسکتے تھے اس لئے انہیں لاٹوش روڈ کے ایک مکان میں آنا پڑا ۔ اس مکان کے دو حصے تھے اندر کے حصہ میں شوکت تھانوی نے رہائش رکھی اور باہر کے حصہ کو سرپنچ کا دفتر بنا دیا ۔ " سرپنچ " کے اسسٹنٹ ایڈیٹر امین سلونوی اور مینجنگ پروپرائٹر نسیم انہونوی تھے ۔ شوکت تھانوی اپنی کتاب " مابدولت " میں " سرپنچ " کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" پہلا ہی پرچہ بازار میں آیا تھا کہ لوگوں کو دوسرے اور پھر تیسرے اور آخر ہر نمبر کا مسلسل انتظار رہنے لگا ۔ نئے نئے کالم اس میں جاری کئے تمام اطرافِ ملک کے مزاح نگاروں سے بہتر سے بہتر مضامین لکھوائے ۔ نئے نئے مزاح نگار پیدا کئے اور کچھ ہی دنوں میں سرپنچ نے ایک خاص حلقہ بنالیا اور خریداروں کی تعداد میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اسی اخبار کی ایک خاص وقعت اخباری برادری میں بھی قائم ہوگئی ۔ اس کے مضامین معاصرین نے نقل کرنا شروع کردئیے اور اس کے تبصروں سے بڑے بڑے سورما چوکنے رہنے لگے کہ معلوم نہیں کب کس کی کس رنگ میں خبر لے لی جائے ۔ "[1]

شوکت تھانوی ، نسیم انہونوی ، عظیم بیگ چغتائی ، فرحت اللہ بیگ مُلا رموزی ، چودھری محمد علی رودلوی ، ظریف لکھنوی ، احمق پھپھو ندوی

---

[1] شوکت تھانوی : مابدولت ، مطبوعہ نقوش پریس ، لاہور ، ص: 138 ، 139 ۔

اور شہباز بلند پرواز " سرپنچ " کے نو رتن کہلاتے تھے ۔ سرپنچ کی فائلوں میں سب سے زیادہ تخلیقات ان ادیبوں کی نظر آتی ہیں ۔ پانچ شاعر خاص طور سے اپنی تخلیقات " سرپنچ " میں بھیجا کرتے تھے جنہیں " سرپنچ " کے " پنچ " کہا جاتا ہے ان میں علامہ عبدالباری آسی ، امین سلونوی ، منّور آغا مجنوں لکھنوی ، احتشام ماہلی اور عبداللّٰہ ناصر شامل تھے ۔" یہاں یہ انکشاف بھی خاصا دلچسپ ہے کہ سیّد اختشام حسین افسانہ نگاری سے قبل سرپنچ کے باقاعدہ مزاح نگار تھے اور مزاحیہ شاعری میں حیران تخلص کرتے تھے[1]۔

شوکت تھانوی جب تک اس پرچے کے ساتھ منسلک رہے اس کے اداریوں میں طنز اور گرمی ہوتی تھی کہیں کہیں مزاح کے چھینٹوں کی وجہ سے ان میں دھواں اٹھتا بھی نظر آتا ہے ۔ تیئس فروری انیس سو تینتیس عیسوی کے " سرپنچ " کے اداریہ میں شوکت تھانوی نے " انگارے " کے بارے میں لکھا کہ : " یہ انگارے وہ نہیں ہیں جو آگ لگانے کے بعد ----- کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں ، بلکہ ہمارا مقصد " انگارے " سے وہ کتاب ہے جو آج کل اخبارات کا دلچسپ ترین اور مسلم اخبارات کا اہم ترین مبحث بنی ہوئی ہے ----- اس کو دیکھ کر نگاہ سے لے کر دل تک جل بھن کر رہ گیا اور ہم منفعل ہیں کہ ہم نے آخر اس دہکتے ہوئے جہنم کو دیکھا ہی کیوں تھا ----- یہ کتاب دراصل دس مہمل اور بے تکے افسانوں کا ایک بے ڈھنگا سا مجموعہ ہے جس کو ایک عورت اور تین مردوں کی اجتماعی کوششوں نے مرّتب کیا ہے ۔ یہ پانچ افسانے سجاد ظہیر نے لکھے ہیں ۔ دو افسانے احمد علی صاحب کی ادبی بدہضمی کا نتیجہ ہیں ، دو افسانے رشید جہاں صاحبہ کی انشا پردازانہ ہیضہ کا نمونہ ہیں اور ایک افسانہ محمود الظفر صاحب نے لکھ مارا ہے ۔ ان دسوں افسانوں

---

[1] احمد جمال پاشا : " شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت " مطبوعہ نظامی پریس لکھنو ، صفحہ = 48 ۔

کو پڑھ کر اگر پہلی مرتبہ کوئی شخص اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ لکھنے والے نے کیا لکھا ہے اور پڑھنے والے نے کیا پڑھا ہے تو دعوے سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بریلی یا آگرے کے پاگل خانے کا مہتمم بننے کا اہل ترین ہوگا ------ اور اگر ان افسانوں کو کوئی شخص بار بار پڑھے تو وہ یقیناً ہماری طرح صرف اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ کتاب ایک صنعت کے تحت لکھی گئی ہے جس کو " صنعتِ بے دھڑک " کہہ سکتے ہیں یعنی لکھنے والے نے صرف یہ کیا ہے کہ قلم اٹھا کر کاغذ پر لکھنا شروع کردیا اور بغیر یہ سوچے سمجھے کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں لکھتے ہی چلے گئے ہیں ، کفر لکھ گئے تو لکھ گئے گالی قلم سے نکل گئی تو نکل گئی ۔ مختصر یہ کہ " یاوہ گوئی " کی طرح گویا ان حضرات نے " یاوہ نگاری " کے کمالات ان افسانوں میں دکھائے ہیں -------- ہم نے اس جہنمی صحیفہ کو ادبی ، اخلاقی معاشرتی اور دیگر حیثیتوں سے بھی مضرّت رساں پایا ہے ۔ اس میں تین شرفاء اور ایک شریف زادی نے جو جو حیا سوز مناظر پیش کئے ہیں ان کو دیکھ کر آبرو باختہ ہستی بھی انتہائی نفرت سے لاحول پڑھنے پر مجبور ہوجائے گی خداوند کریم اور رسول صلعم کی جو توہین ہوئی اس کا سوال تو اس وقت پیدا ہوگا جب ان مصنّفین کی صحیح الدماغی تسلیم کرلی جائے گی لیکن ہمارے خیال میں تو یہ مجموعی خرافات سوائے اس کے اور کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ واقعی ان انگاروں کو خاکستر کردیا جائے "۔ [1]

سرپنچ کے اداریوں میں سنجیدہ مسائل پر شگفتہ انداز میں بحث کی جاتی تھی ۔ اس اداریے میں شوکت تھانوی نے ادبی بے راہروی کی نشاندہی

---

[1] شوکت تھانوی : اداریہ " سرپنچ " ، 23 ، فروری 1933ء ۔

کی ہے وہ سمجھتے تھے کہ اس قسم کی تحریریں ہماری معاشرت پر ضرور اثر انداز ہوتی ہیں اس لئے ہمارے ادیبوں کو اس قسم کے اخلاق سوز افسانے لکھنے سے باز رہنا چاہئیے ۔

سرپنچ کے نورتن اور پنچوں کے علاوہ اس کی برادری پورے برعظیم میں پھیلی ہوئی تھی ۔ عام طور پر کوشش تو نئی تحریریں لکھوانے کی ہوتی تھی لیکن بعض حالتوں میں دوسرے رسائل اور اخبارات سے بہترین تخلیقات کا انتخاب بھی چھاپا جاتا تھا ۔ سرپنچ میں لکھنے والوں کے اسمائے گرامی میں خواجہ حسن نظامی ، نیاز فتح پوری ، حکیم ممتاز حسین عثمانی ، مولانا عبدالمجید سالک ، پطرس بخاری ، رشید احمد صدیقی ، علامہ جمیل مظہری ، سلطان حیدر جوش ، ایم ۔ اسلم ، فلک پیما ، ارشد تھانوی ، فرقت کاکوروی ، مُلّا حضوری ، خان محبوب طرزی ، علامہ ہنٹر اور محشر عابدی خاص طور سے قابل ذکر ہیں ۔ سرپنچ کے ان لکھنے والوں کو سرپنچ برادری کہا جاتا تھا ۔

شوکت تھانوی کا " سرپنچ " اردو کا پہلا مزاحیہ اخبار ہے جس میں سب سے زیادہ مزاحیہ کالم تھے اس لئے ان کالموں کی مزاحیہ کالم نویس کی تاریخ میں ہمیشہ ایک خاص اہمیت رہے گی ۔ سرپنچ کے قابل ذکر کالم دو دو باتیں ، قلمزار ، چشکیاں ، تیر بہدف ، کھلکستان ، دیوارِ قہقہہ ، گرما گرم ، عقلمندیاں ، بے پرکی ، گپ شپ ، ٹیلی فون ، کٹ پیس ، حضرت عشق ، الم غلم ، پھبتیاں ، تُو تُو میں میں ، اِدھر اُدھر کی ، ایڈیٹر کی ڈائری اور اقوالِ مولانا سرپنچ تھے ۔ اقوالِ مولانا سرپنچ کے تحت مولانا شوکت تھانوی اپنے اقوال تیار کرتے تھے ۔ نمونے کے طور پر چند اقوال ملاحظہ کیجئے ۔

1- " شادی کے بعد سسرال میں پڑے رہئیے تا کہ کچھ عرصہ کے بعد میکے کی قدر ہوسکے ۔

2- دوسروں کی بیویوں کو اپنی والدہ سمجھئے تا کہ آپ کی بیوی کو بھی لوگ والدہ سمجھیں ۔

3- پلاؤ زردہ سے کم پر شکر ادا نہ کیجئے ورنہ اللہ میاں سمجھیں گے کہ یہ بندہ دال اور روٹی میں خوش ہے اسے اس سے بہتر کھانے کیوں دئیے جائیں ۔

4- وقت کا پابند ہونا حبسِ دوام کی سزا بھگتنے کے برابر ہے ۔

5- آج کا کام کل پر ٹالئیے اس لئے کہ ممکن ہے کہ کل کا کام پرسوں پر ٹل جائے ۔"[1]

" اودھ پنچ " کے بعد ہمیں کارٹونوں کا سب سے بڑا خزانہ شوکت تھانوی کے " سرپنچ " میں ہی ملتا ہے ۔ سرپنچ کے کارٹون بہت نوکیلے ، تیکھے جاندار ، بولتے ہوئے اور دلآویز ہوتے تھے ۔ کامل لکھنوی اور سمیع فرنگی محلی اپنے فن میں یکتا تھے ۔ یہ سیاسی ، سماجی ، ثقافتی ، ادبی ، مذہبی اور معاشرتی موضوعات کو ہدف بناتے تھے ۔ خاص نمبروں میں مزاح نگاروں کے کارٹون بھی ہوتے تھے ۔ چوڑیاں پہنے ہوئے پولیس ، حامد کا ہوّا ، مولانا شوکت علی ، افقسو موہانی ، عنایت دہلوی ، مدیر ریاست اور " لیگ اقوام " کے کارٹون اس میں بے حد مقبول ہوئے ۔ سرپنچ اکثر انگریزی رسائل و اخبارات کے کارٹون بھی نقل کرتا تھا ۔[2]

---

[1] احمد جمال پاشا : شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت ، مطبوعہ نظامی پریس لکھنو ، ص: 72 ، 73 ۔

[2] نقوش لاہور ، شوکت نمبر ۔ شوکت تھانوی ، ایک صحافی از احمد جمال پاشا ، ص: 608 ۔

" سر پنچ " میں شوکت تھانوی کے کمالات اپنے عروج پر تھے۔ ایک ہی وقت میں کئی کالم خود لکھا کرتے تھے۔ اور ہر کالم میں کوئی نہ کوئی جِدّت ہوتی تھی۔ وہ اپنے کالم کا موضوع اِرد گرد بکھری ہوئی خبروں سے اپنے مزاج کے مطابق حاصل کیا کرتے تھے اس لئے ان کے موضوعات میں ہمیں تنّوع نظر آتا ہے۔

شوکت تھانوی اودھ اخبار کی ملازمت اور سر پنچ کی اِدارت میں مصروف تھے کہ لالہ ویش بندھو گپتا کے اخبار روزنامہ تیج دہلی کے ایڈیٹر شری رام لال ورما، مالکان تیج سے کسی بات پر ناراض ہو کر لکھنو آگئے اور لکھنو سے اپنا ذاتی روزنامہ " ہند " نکالنے کے انتظامات میں مصروف ہوگئے۔ وہ امین سلونوی کی معرفت شوکت تھانوی سے ملے اور اس قسم کی ادارت کی پیش کش کی کہ روزنامہ " ہند " کی ادارت تو شوکت تھانوی کریں لیکن نام لکھا ہو شری رام لال ورما کا۔ امین سلونوی کے اصرار پر ان سے شرائط طے ہوئیں اور جب انہوں نے ہر شرط منظور کرلی تو شوکت تھانوی اخبار " ہند " سے وابستہ ہوگئے اور اودھ اخبار کی ملازمت کو خیر باد کہدیا۔ شوکت تھانوی اودھ اخبار کی ملازمت سے بد دل ہوچکے تھے۔ وہ بہت عرصہ تک قائم مقام ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے لیکن اودھ اخہار کی انتظامیہ نے نہ تو کسی قسم کا سپیشل الاؤنس دیا اور نہ ہی ان کی محنت کی قدر کی۔ کچھ عرصہ کے بعد نئے ایڈیٹر کو تعینات کر دیا گیا اور شوکت تھانوی کو اسسٹنٹ ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ ان حالات کے پیش نظر شوکت تھانوی نے اودھ اخبار چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور روزنامہ ہند کی ایڈیٹری قبول کرلی۔ یہ اخبار زیادہ دیر نہ نکل سکا صرف دو مہینے کے بعد ہی بند کردیا گیا۔ شوکت تھانوی اپنی کتاب " کچھ یادیں کچھ باتیں " میں اس اخبار کی ملازمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" یوں تو روزنامہ ہند کی فضائیں اب میرے لئے سازگار ہوچکی تھیں مگر دوسرے ہی مہینہ کے اختتام پر معلوم یہ ہوا کہ اس ملازمت میں تنخواہ ملنا کوئی ضروری بات نہیں ہے ۔ پہلی تاریخ سے پندرہ تاریخ ہوگئی مگر تنخواہ کا کوئی ذکر نہ تھا ۔ پندرہ تاریخ کے بعد شعبۂ کتابت نے کچھ گڑ بڑ شروع کی ۔ اس گڑبڑ میں مترجم ، پھر کچھ اسسٹنٹ ایڈیٹر شامل ہوگئے اور آخر رام لال ورما نے مجھ سے کہا کہ شوکت صاحب میں بالکل پھکّڑ ہوچکا ہوں اور اب میرے لئے اخبار کو جاری رکھنا نا ممکن ہوگیا ہے ۔ دو مہینہ کی تنخواہ سارے عملے کی چڑھی ہوئی ہے لہذا میں تو اخبار بند کر رہا ہوں ۔ چنانچہ یکم مئی کو نکلنے والا اخبار یکم جولائی کو بند کردیا گیا اور سارا عملہ چیختا پیٹتا رہ گیا "[1]

روزنامہ ہند بند ہوگیا تو " سرپنچ جرنلس " نے " شباب " کے نام سے ایک ادبی ماہنامے کا اجرا کیا اور اس کا ایڈیٹر شوکت تھانوی کو مقرر کیاگیا ۔ اس ادبی ماہنامے میں اس وقت کے اہم ادیبوں کی تخلیقات چھپتی تھیں ۔ شوکت تھانوی نے اس کے کئی اہم نمبر نکال کر دنیائے ادب میں دھوم مچادی ۔ لیکن یہ ایک سال کے بعد بند ہوگیا ۔

1935ء میں ہفتہ وار " حق " کی انتظامیہ نے اسے روزانہ اخبار بنانے کا فیصلہ کیا ۔ عبدالروف عباسی کی ادارت میں یہ اخبار نکلتا تھا ۔ شوکت تھانوی کو اسسٹنٹ ایڈیٹری کی پیش کش کی گئی ۔ دوستوں کے مشورہ سے شوکت تھانوی نے اسے قبول کرلیا ۔ روزنامہ " حق " کی مناسبت سے شوکت تھانوی

---

[1] شوکت تھانوی : کچھ یادیں کچھ باتیں ، مطبوعہ نقوش پریس لاہور ، ص : 147 ، 148 ۔

نے اپنے فکاہیہ کالم کا نام " حق و باطل " تجویز کیا ۔ اس کالم کے علاوہ خبروں کا ترجمہ اور شذرات کا لکھنا بھی ان کی ذمہ داری ٹھہری شوکت تھانوی تقریباً تین سال اس اخبار سے وابستہ رہے اور اپنا فکاہیہ کالم " حق و باطل " باقاعدگی سے لکھتے رہے ۔ نمونے کے طور پر صرف ایک کالم نقل کیا جارہا ہے ۔

" لیجئے اور سنیئے کہ یورپ کے ایک ڈاکٹر صاحب نے یہ جدید تحقیقات فرمائی ہیں کہ اکثر بیماریوں کا علاج گانے کے ذریعے سے ہوسکتا ہے اور بہت سے ایسے امراض ہیں جن میں بجائے دوائیں استعمال کرنے کے یہ طریقہ بے حد مفید ثابت ہوگا ۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ مستقبل قریب میں لوگ ادویہ کا استعمال بالکل ترک کردیں گے اور موسیقی کے ذریعہ بیماریوں کا تدارک کریں گے اسی طریقہ کو تمام اطباء اختیار کرلیں گے ۔ موسیقی سے نہ صرف ذہنی اور دماغی بلکہ جسمانی علاج بھی ہوگا ۔

اگر ڈاکٹر صاحب کی یہ تحقیق صحیح ہے تو سب سے پہلے ان کو اپنی اور اپنے ہم پیشہ طبقہ کی خیر منانا چاہئیے اور حصول معاش کا کوئی اور ذریعہ تلاش کرلینا چاہئیے اس لئے کہ موسیقی سے بیماریوں کا علاج عام رواج پانے کے بعد یہ تمام دنیا کے ڈاکٹر اور حکیم غریب شٹوں ٹوں رہ جائیں گے البتہ ان کی جگہ مس زہرہ بائی ، مس اللہ رکھی ، مس بگن جان ، مس بے نظیر ، مس کجن بائی اور ماسٹر نثار وغیرہ کی پریکٹس خوب چلے گی اور ہر شہر کے چکلوں میں ہر کوٹھے پہ مطب کھل جائیں گے ۔ یہی کم خرچ بالا نشیں گانے والیاں سول سرجن بھی ہوا کریں گی اور اسسٹنٹ سرجن بھی اور یہی تمام آلاتِ موسیقی آلاتِ طب کا کام دیں گے ۔

جب یہ علاج کا طریقہ جاری ہوگا تو غالباً یہ ہوا کرے گا کہ غریب آدمی بیمار ہو کر ڈولیوں میں اور با پیادہ گانے والوں اور گانے والیوں کے مکانات

اور کمروں پر جایا کریں گے اور وہ مریضوں کو دیکھ کر نسخہ تجویز کریں گی کہ اس کو ٹھمری سے فائدہ ہوسکتا ہے یا بھیرویں سے ، غزل اس کے لئے مفید ہوگی یا دادرا ، اور جیسی بھی مرض کی نوعیت ہوگی ویسا ہی علاج کردیا جائے گا اسی طرح امراء ان مغنّی طبیبوں کو فیس دے کر اپنے گھر پر بُلایا کریں گے اور وہ بجائے تھرما میٹر اور دوسرے آلات کے طبلہ اور سارنگی وغیرہ لے کر موٹر پر نہایت ٹھاٹھ سے ان کے یہاں جایا کریں گے ۔ ان کی نبض دیکھیں گے کہ کون سا راگ چھیڑ رہی ہے پھر اس کے مطابق کوئی چیز ان کو سنا کر اپنی فیس لے لیں گے اور کسی دوسرے مریض کے یہاں چلے جائیں گے ۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ جب یہ طریقہ علاج رائج ہوجائے گا تو لیڈی ڈاکٹروں کی کثرت ہوجائے گی اور مرد زیادہ تر لیڈی ڈاکٹروں ہی کا علاج کریں گے ۔

اگر اس وقت بھی نسخہ لکھنے کا طریقہ رائج رہا تو یہ ہوا کرے گا کہ ڈاکٹرنی صاحبہ مع اپنے سازندوں کے جو اس وقت کمپونڈر کہلائیں گے مریض کے یہاں جائیں گے اور اس کا معائینہ کرنے کے بعد پہلے تو یہ طے کریں گے کہ کون سا مرض ہے یعنی دِق ہے یا ہیضہ ، اور اس کے بعد پھر اس طرح نسخہ لکھیں گے ۔

ہو

نام مریض	چودھری عطا اللہ شاہ
مرض	ضعف معدہ
معالج	مس زہرا بائی گورکھپوری

" مار گیو رے دل پہ برچھی نجر کی " ، گوش کنند و عقب آں
" جبارا ہائے ڈولے ہو " سماعت کنند ۔

اب دیکھئے کون سے ولایتی ڈاکٹر صاحب علاج بالرقص ایجاد فرماتے ہیں۔ [1]

روزنامہ " حق " کی ملازمت کے دوران شوکت تھانوی کو قادیان جانا پڑا لکھنو میں ان دنوں احمدیت کے خلاف پروپیگنڈہ ہو رہا تھا ۔ اس سلسلہ میں مولوی محمد عثمان احمدی نے " حقیقت " کے ایڈیٹر انیس احمد عبّاسی اور شوکت تھانوی کو دعوت دی کہ آپ لوگ قادیان چل کر وہاں کے حالات کا خود مطالعہ کریں اور اپنے اس مطالعہ کی روشنی میں اگر مناسب سمجھیں تو کچھ لکھیں ۔ یہ دعوت منظور کرلی گئی اور قادیان پہنچکر ہر شعبہ کو تنقیدی نظر سے دیکھا ۔ لکھنؤ میں ان کے بارے میں جو کچھ سنا تھا حقیقت اس کے برعکس تھی۔

روزنامہ " حق " کی ملازمت کا تذکرہ " مابدولت " میں شوکت تھانوی اس طرح کرتے ہیں :

> " عبدالروف صاحب عبّاس اور علی اختر صاحب عبّاس سے دوستانہ تعلقات پہلے تھے اور ملازمت بعد میں شروع کی تھی ۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں دوستی ختم نہ ہوجائے اور صرف خادم اور آقا کے تعلقات نہ رہ جائیں ۔ مگر یہ صورت نہ ہوسکی بلکہ دوستانہ تعلقات نے عزیزدارانہ تعلقات کی صورت اختیار کرلی ۔ " [1]

عبدالروف عباسی نے 1937ء میں یہ طے کیا کہ ایک ماہنامہ نکالا جائے جس کا نام " کائنات " تجویز ہوا ۔ شوکت تھانوی کو اس کا ایڈیٹر بنایا

---

[1] احمد جمال پاشا : شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت ، ص: 90 ، 91 ، 92 ، 93 ۔

[2] شوکت تھانوی : مابدولت ، مطبوعہ نقوش پریس لاہور ، ص: 199 ۔

گیا ۔ دو تین پرچوں کے بعد ہی اس کے خریداروں کی تعداد کافی پیدا ہوگئی اور رسالہ نے مقبولیت حاصل کرنا شروع کردی ۔ روزانہ اخبار کی مصروفیات اتنی زیادہ تھیں کہ اس رسالہ پر توجہ دینا بہت مشکل نظر آرہا تھا ۔ اسی لئے اس کے 5 ، یا 6 شمارے ہی نکلے ہوں گے کہ عبّاسی صاحب نے اس کو بند کرنے کا فیصلہ کیا حالانکہ اس کے بند ہونے کے بعد بھی اس کی مانگ برابر جاری رہی ۔

شوکت تھانوی تقریباً تین سال تک روزنامہ " حق " سے وابستہ رہے اور 1938ء کے اوائل میں بعض نزاکتوں کے تحت " حق اخبار " سے علیحدہ ہوگئے " مابدولت " میں اپنی اس علیحدگی کا ذکر کرتے ہوئے شوکت تھانوی لکھتے ہیں:

> " ہم نے اپنی شکایت کے ساتھ استعفٰی پیش کردیا ۔ " حق " کی ملازمت کے زمانہ میں جو محنت ہم نے کی تھی اور جس خلوص سے کام کیا تھا اس کے پیش نظر ہم کو ایک وہم یہ بھی تھا کہ ہم نے بھی تھوڑا بہت استحقاق پیدا کرلیا ہے اور حق کے حق داروں میں ہم بھی ہیں ۔ مالی حیثیت سے نہ سہی اخلاقی حیثیت سے سہی کم سے کم اتنا حق تو ہمارا بھی تھا کہ ہمارے اس استعفٰی پر ہمدردانہ غور کیا جاتا مگر بجائے اس کے ہوا یہ کہ عبدالروف صاحب عباسی نے ایک دم اپنی نظریں ایسی پھیر لیں کہ گویا کبھی مراسم تھے ہی نہیں ۔ لہذا ہم نے اپنے باقی مطالبات سے بھی ہاتھ اٹھائے اور بجائے اس کے رہے سہے تعلقات کو بھی ختم کردیا جاتا ۔ ہم نے ملازمت ہی کو ختم کردیا ۔" [1]

شوکت تھانوی کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا ۔ ان کے دوستوں کو جب معلوم ہوا کہ شوکت تھانوی ان حالات میں " روزنامہ حق " سے علیحدہ

---

[1] شوکت تھانوی : مابدولت ، مطبوعہ نقوش پریس لاہور ، ص: 213 ۔

ہوئے ہیں تو ان میں سے کچھ نے عبدالروف صاحب عباسی سے صلح کروانے کی کوشش کی ۔ رفیع احمد خاں ان سب میں پیش پیش تھے ۔ عباسی صاحب کا روّیہ حوصلہ افزا نہیں تھا اس لئے رفیع احمد خاں ان کی طرف سے بد دل ہوگئے۔

خان بہادر سیّد عین الدین کو جب شوکت تھانوی کی " حق اخبار " سے علیحدگی کا پتہ چلا تو انہوں نے شوکت تھانوی کو اپنے پاس بُلا کر اپنا ذاتی اخبار نکالنے کا مشورہ دیا ۔ اس کی مالی اعانت کا بوجھ اپنے سر لیا ۔ مالی مسائل حل ہوتے دیکھ کر شوکت تھانوی نے اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا اور ایک اسکیم بنائی ۔ اس اسکیم کو کچھ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے سامنے پیش کیا گیا انہوں نے خان بہادر سید عین الدین صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اخبار کو سرمایہ فراہم کرنے کا وعدہ کیا ۔ علی گڑھ کے نواب بہادر سر محمد مزمّل اللہ خان سے بھی سیّد عین الدین نے گراں قدر عطیہ دلوایا ۔ اس طرح شوکت تھانوی کے پاس اتنی رقم اکٹھی ہوگئی کہ وہ اخبار نکال سکتے تھے ۔

چودھری خلیق الزماں نے اخبار کا نام " ہنگامہ " تجویز کیا تھا! مگر اکثریت کی رائے " طوفان " کے حق میں رہی ۔ اس لئے شوکت تھانوی کے اخبار کا نام " طوفان " طے پایا ۔ لاٹوش روڈ پر ایک بہت عمدہ مکان " طوفان " کے دفتر کے لئے اور شوکت تھانوی کی رہائش کے لئے کرایہ پر لیا گیا ۔ " طوفان " کا بہت عمدہ سائن بورڈ تیار کروا کر آویزاں کیا گیا ۔ خان بہادر شیخ احمد علی کی بیگم صاحبہ نے اس دفتر کے لئے تمام فرنیچر بطور عطیہ دیا ۔

" طوفان " کے لئے عملہ کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو شوکت تھانوی نے خان محبوب طرزی کو اپنا اسسٹنٹ ایڈیٹر بنایا اس لئے کہ وہ ان کے ساتھ " ہمدم " ، " اودھ اخبار " اور " سرپنچ " میں کام کرچکے تھے۔

نسیم انہونوی کے انتظامی مشورے اور امین سلونوی کی انڈیپنڈنٹ نیوز سروس کی خدمت " طوفان " کے لئے موجود رہی - اس قسم کے تمام ابتدائی انتظامات مکمل کرنے کے بعد 10 ربیع الاول 1357 ھ مطابق 11 ، مئی 1938 ء کو " طوفان " کا نمونہ کا پرچہ نکلا - اور یہ اعلان کیا گیا کہ اس کی باقاعدہ اِشاعت یکم جون 1938 ء سے شروع ہوگی - بیس دن کا یہ وقفہ اشتہارات حاصل کرنے ، خریدار فراہم کرنے ، ایجنسیاں قائم کرنے اور دوسرے تمام انتظامات مکمل کرنے میں صرف کئے گئے - یکم جون 1938 ء کو اس کی باقاعدہ اشاعت شروع ہوگئی -

11 ، مئی 1938 ء کو نمونہ کا پرچہ نکالا گیا - اس کا اداریہ " روزنامہ " طوفان " کا اجراء اور اس کے مقاصد " کے موضوع پر لکھا گیا جس کا آغاز اس شعر سے کیا گیا - ؎

ڈوبنے کے واسطے کافی ہے اک ہلکی سی موج
ہاں ابھرنے کے لئے موجوں میں طوفاں چاہئیے

اس شعر کے بعد شوکت تھانوی اداریے کا آغاز اس طرح کرتے ہیں :

" روزنامہ طوفان کا اجراء میرے اس مسلسل خواب کی ایک خوشگوار تعبیر ہے جو اپنی صحافتی زندگی میں اپنی بیدار آنکھوں سے میں برابر دیکھتا رہا ہوں اور اخبار نویس کا ہر تلخ تجربہ جس شیریں توقع اور جس خوشگوار مستقبل کے سہارے مجھ کو اس مشغلہ سے مایوس ہونے سے ہمیشہ باز رکھتا رہا وہ شیریں توقع آج پوری ہو رہی ہے اور وہ خوشگوار مستقبل آج میرے پیش نظر ہے - آج میرے ہاتھ میں میرا ہی قلم ہے اور میرے دماغ میں میرے ہی خیالات - میں آج مسلم لیگ کا حامی ہو کر کانگرس کی ہمنوائی کے لئے مجبور نہیں ہوں - اور نہ کانگرس کے مقاصد پر ایمان رکھتے ہوئے مسلم لیگ کی جانبداری کے

لئے مجھ کو کوئی مجبور کر سکتا ہے - میں نے اپنی صحافتی زندگی کے کم و بیش بارہ سال اپنے قلم سے دوسروں کے خیالات کی ترجمانی میں بسر کئے - اکثر مجھ کو ضمیر فروشی بھی کرنا پڑی اور اکثر اس سے بھی زیادہ ذلیل قسم کی قلمی تجارت - مگر میں جانتا تھا کہ میرا قلم دراصل قلم نہیں بلکہ پھاوڑہ ہے اور میرا کام صرف یہ ہے کہ دماغ کو بالکل معطّل کرکے صرف اپنے سرمایہ دار کے اشاروں پر چلوں اور قلم کو چلاؤں ------- بہرحال بارہ سال کی اس ضمیر فروشی نے مجھ کو بہت سے قیمتی سبق بھی پڑھائے ہیں اور ان ہی قیمتی اسباق میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں سیاسی عقائد کے اعتبار سے ایک اخبار کا اپنے کو کسی ایک عقیدہ کے لئے وقف کردینا اصول صحافت کے قطعاً منافی سمجھتا ہوں - کسی اخبار کا اپنے کو کسی ایک عقیدہ کے لئے وقف کردینا اصول صحافت کے قطعاً منافی سمجھتا ہوں - کسی اخبار کا اپنے کو کسی جماعت کا آرگن کہنا اس کی اخباری شان کے شایان نہیں کہا جاسکتا بلکہ اس قسم کے جماعتی آرگن اخبار کی تعریف سے علیحدہ ہوکر اشتہار کی تعریف میں آتے ہیں ------- طوفان ہر جماعت کا اخبار ہے اور ہر جماعت کے جائز حقوق کا محافظ مگر اس کے ساتھ ہر جماعت کی خامیوں اور کوتاہیوں کا آئینہ بھی ہے --- اگر اس ارادہ میں نیک نیتی کو دخل ہے تو میرا ایمان ہے کہ خدا مجھ کو اسی جادہ پر استقلال اور ہمّت عطا کرکے کامیابی کی منزل کی طرف سلامت رَوی کے ساتھ گامزن رکھے گا - آمین -

اس کو طوفانِ حوادث سے بچانا یارب
آرزو پھول لئے پھرتی ہے دامنوں میں [1]

---

[1] روزنامہ " طوفان " لکھنو ، 11 مئی 1938ء جلد نمبر (1) ص: 2 -

یہ اداریہ اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں شوکت تھانوی نے اپنا نظریۂ صحافت پیش کیا ہے۔ صحافی اور اخبار کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سے پیشتر اپنی کوتاہیوں کو بے نقاب کیا ہے اور واضح طور پر یہ کہہ دیا ہے کہ پہلے میرا قلم ضمیر کی آواز کی بجائے سرمایہ دار کی آواز کا ساتھ دیا کرتا تھا لیکن آج جبکہ وہ اپنا ذاتی اخبار نکالنے میں کامیاب ہوچکے ہیں تو وہ یہ عہد کرتے ہیں کہ ان کا اخبار کسی سیاسی جماعت کا آلہ کار بننے کی بجائے ہر جماعت کو اس کی برائیوں اور بھلائیوں سے نہایت دیانت داری کے ساتھ آگاہ کرتے رہیں گے تاکہ ان کی اِصلاح بھی ہوسکے اور وہ اپنی حقیقت سے بھی باخبر رہیں۔ اداریہ کے بعد اس نمونے کے پرچے میں شوکت تھانوی نے "مدّ و جزر" کے نام سے ایک فکاہیہ کالم بھی تحریر کیا ہے۔ اس کالم کا تعارف خود خوکت تھانوی نے اس طرح کروایا ہے: "سیاسی رونا رونے کے لئے اس اخبار کے باقی تمام کالم پڑے ہوئے ہیں بلکہ رونے کے لئے تو تمام ہندوستان ہی پڑا ہوا ہے اور ہندوستان ہی کو کیوں لیجئے یہ کہئے کہ اگر کسی کو رونا ہی ہے تو "ملکِ خدا تنگ نیست" مگر اس کالم میں تو رونے والوں کو بھی ہنسنا ہی پڑے گا اور ہنسنے والے تو خیر ہنسیں ہی گے ان کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ہم تو اس کالم میں اشکوں کو بھی تبسم کی تعلیم دیں گے اور ہندوستانیوں کو بجائے رونے کے تمام مصائب کو قہقہوں پر اڑانے کا سبق پڑھائیں گے خواہ ہماری اس ہنسی کو کوئی بے حیائی سمجھے یا کچھ مگر ہم بے حیا سہی اسی طرح جی بچیں اور اسی طرح عمر دراز ہوجائے۔"[1]

1938ء میں لکھنو میں شیعہ سنی فساد ہوا۔ 11، مئی 1938ء کو مصالحتی کمیٹی بن چکی تھی اور ہر طرف مصالحت کروانے اور حالات کو معمول پر لانے کی

---

[1] روزنامہ "طوفان" لکھنؤ، 11، مئی 1938ء "مدّ و جزر"، ص: 2۔

کوششیں ہو رہی تھیں ۔ اس نمونہ کے پرچہ میں ایک کارٹون بنا ہوا ہے اور یہ قطعہ لکھا ہوا ہے ۔

یہ شیخ و برہمن کو لڑانے والے + ہیں مسجد و مندر کے بھی ڈھانے والے
طوفان یہ اٹھا ہے اٹھانے کو انہیں + طوفاں میں ہیں طوفان اٹھانے والے [1]

یہ اخبار چھ صفحوں پر مشتمل ہے ۔ آخری صفحہ پر شوکت تھانوی کے دو ناولوں " خانم خاں " اور " سوتیلی چاہ " کا اشتہار ہے ۔ اس کے علاوہ وہی وھانوی کی کتاب " شرمناک افسانے " کا بھی اشتہار ہے ۔

روزنامہ " طوفان " کا باقاعدہ اجراء یکم جون 1938 ء مطابق یکم ربیع الثانی 1357 ہجری یوم چہار شنبہ سے ہوا ۔ اس اخبار کے پہلے صفحہ پر اہم خبروں کے علاوہ " طوفان کی حیات بخش موجیں " کے عنوان کے تحت اشرف الحکماء حکیم سیّد علی آشفتہ لکھنوی کی چھبیس اشعار کی نظم میں روزنامہ طوفان کا خیر مقدم کیا گیا ۔ دوسرے صفحہ پر خواجہ حسن نظامی نے روزنامہ " طوفان " کا خیر مقدم ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے :- " مولانا تفریح الملک شوکت صاحب تھانوی کا روزانہ اخبار طوفان آج میرے پاس آیا ۔ آسمان پر گرد و غبار کا طوفان ہے زمین پر حرارتِ شمسی کا طوفان ہے کل راتِ مولانا تفریح الملک کی تقریر لکھنو ریڈیو میں سنی تھی ۔ مریخ کے دُم دار آدمی کی بیوی نے ریڈیم کے حروف کے اخبار کا ذکر کیا تھا ۔ اگر وہ خواب تھا تو اس کی تعبیر آج طوفان اخبار کی صورت میں سامنے آ گئی ۔ خدا کرے کہ یہ اخبار مفرد طوفان رہے کیونکہ مرکّب طوفان کے لئے اُردو زبان میں پہلا لفظ جھوٹ لگایا جاتا ہے یعنی جھوٹ طوفان ۔ مگر یہ اخبار سچ طوفان ثابت ہو ۔ مولانا

---

[1] روزنامہ " طوفان " لکھنؤ ، 11 ، مئی 1938ء ایڈیٹر شوکت تھانوی ، ص : 2 ۔

کی تحریر و تقریر کے طوفان مسلسل آتے رہتے ہیں لیکن یہ اخبار ان کی دلچسپ اور فرحت بخش تحریروں کا ایک ذخیرہ ثابت ہوگا ۔ بشرطیکہ وہ اس کو ادبی اخبار بنانے کی کوشش کریں اور پنجابی تجارت کے سیلاب میں بہنے سے انکار کردیں ۔" [1]

اس اخبار کے کالم " مدّ و جذر " میں شوکت تھانوی نے ہمارے معاشرے کی ایک برائی کی نشاندہی شگفتہ انداز میں کی ہے اور وہ برائی یہ ہے کہ آج کل کے مرد عورتوں کو للچائی ہوئی نظروں سے کیوں گھورتے ہیں اس مسئلہ کا پس منظر اور پیش منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں : " ہندوستان کے مردوں کا عجیب حال ہے کہ اپنی اپنی بیویوں کو تو سب پردہ کراتے ہیں اور اپنی بیوی کے علاوہ باقی ہر عورت کو ایسی نظر سے دیکھتے ہیں کہ گویا دل ہی میں تو رکھ لیں گے حالانکہ زبان سے یہی کہتے ہیں کہ ع " اے ماؤ ، بہنو ، بیٹیو دنیا کی عزت تم سے ہے " مگر زبانِ حال سے ان کی ہر نظر یہی اعلان کرتی ہے کہ دنیا کی عزت تم سے ہو یا نہ ہو مگر تمہاری عزت اور آبرو ہم مردوں کے ہاتھوں ہر وقت خطرہ میں ہے ------ مردوں کی اس بدنیتی کی وجہ پردہ کا رواج ہے اگر پردہ اٹھا دیا جائے تو مردوں کی نظریں سیر رہیں اور وہ عورتوں کو عجیب و غریب چیز سمجھ کر گھورنا چھوڑ دیں مگر چونکہ پردہ کی وجہ سے ان کی نظریں ترسی ہوئی ہوتی ہیں لہٰذا وہ ہر بے نقاب عورت کو ایسی کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہیں گو یا سات فاقوں سے ہیں ۔" [2]

---

[1] روزنامہ " طوفان " لکھنؤ ، ایڈیٹر شوکت تھانوی ، یکم جون 1938ء ص: 2 ۔

[2] روزنامہ " طوفان " لکھنؤ ایڈیٹر شوکت تھانوی ، یکم جون 1938ء ، " مدّ و جزر " کالم ، ص: 2 ۔

اس اخبار میں زیادہ جگہ راجہ صاحب جہانگیر آباد ، صدرِ مجلسِ استقبالیہ زمیندار کانفرنس کے خطبۂ صدارت کو دی گئی ہے جس میں زمینداروں کے مسائل اور ملک و ملت کی ترقی میں زمینداروں کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے - اس اخبار کے آخری صفحہ پر شوکت تھانوی کی کتابوں سوتیاہ۔ چاہ ، دل پھینک ، سودیشی ریل ، بڑبھس ، خانم خاں ، موجِ تبسم ، گھرستان اور سیلابِ تبسم کے اشتہارات دئیے ہوئے ہیں -

2 ، جون 1938ء مطابق 2 ربیع الثانی 1357 ہجری کے اخبار میں پہلے صفحہ پر مہاراج/ دھراج دربھنگہ کے خطبۂ صدارت کے ساتھ ساغر نظامی کی طرف سے آٹھ اشعار پر مبنی ایک نظم میں روزنامہ طوفان کا خیر مقدم کیا گیا ہے - دوسرے صفحہ پر خان بہادر نواب بہادر ڈاکٹر نواب سر محمد مزمّل اللہ خان صاحب بہادر کے - س - آئی - ای ، او - بی - ای ، ایل - ایل - ڈی رئیسِ اعظم بھیکم پور (علی گڑھ) نے طوفان کا خیر مقدم ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے :

" مخدومی و مکرمی - سلامت - السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ اللہ تعالی آپ کے قلم میں اس سے زیادہ قوت عطا فرمائیے ، جس طرح سے کہ " طوفان " کے انجام میں خوشگوار بارش اور معتدل موسم ہوتا ہے اسی طرح اس کا نتیجہ خدا کرے کہ خوشگوار ہو -

خاکسار

محمد مزمّل اللہ خان " [1]

---

[1] روزنامہ " طوفان " لکھنؤ ایڈیٹر شوکت تھانوی ، 2 ، جون 1938ء ، ص : 2 -

2 ، جون کے اخبار میں " مدوجزر " کا کالم سرالمرتھ رائٹ کے اس نظریہ کے بارے میں ہے کہ آنسو میں نہایت قیمتی جوہر ہوتا ہے جو ہر قسم کے جراثیم کو مار سکتا ہے ۔ شوکت تھانوی اسے اپنے کالم کا موضوع بناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ : " اگر سرالمرتھ رائٹ کا یہ نظریہ درست ہے تو گھر بیٹھے اچھی تجارت ہاتھ آئی اور رونا بھی گویا ایک قسم کا بیوپار ہوگیا کہ جب مفلسی نے تنگ کیا لگے آنسو بہانے ۔ اپنے آنسوؤں سے بوتلیں بھر کر " عرقِ جراثیم کش " کا لیبل لگا دیا اور دوا فروشوں کے یہاں بیچ آئے ۔ ہندوستانیوں کے لئے رونے کے امکانات خدا کے فضل سے یوں ہی کیا کم ہیں ۔ دوسرے ممالک کے باشندے تو شاید کوشش کرنے کے بعد آنسو بہا سکتے ہیں مگر یہاں تو یہ کاروبار نہایت آسانی کے ساتھ چل سکتا ہے اس لئے کہ آلام و مصائب نے ہر ہندوستانی کی صورت ہی رونی بنا دی ہے اور ہر نوکِ مژگاں میں مستقل واٹر ورکس کھول رکھے ہیں کہ جہاں پلک دبائی اور سیلاب امنڈ آیا ۔ "[1]

3 ، جون 1938ء کے اداریہ میں شوکت تھانوی نے مسلمانوں کی مرکزیت کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے انہوں نے مسلمانوں کی حالت زار کی ایک سچی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ انتشار اور خود غرضی کی وجہ سے مسلمان بکھر چکے ہیں حالانکہ اسلام نے مرکزیت کی تعلیم کو سب سے زیادہ اہم قرار دیا ہے مگر اسی کو آج غیر اہم سمجھا جا رہا ہے چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر جگہ کے مسلمان اپنے آپ کو بے یار و مددگار سمجھتے ہیں اور اس نا اتفاقی کی وجہ سے دوسری قومیں انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں ۔

---

[1] روزنامہ " طوفان " لکھنو ایڈیٹر شوکت تھانوی ، 2 جون 1938ء ، " مدّوجزر " ، ص: 2 ۔

3 ، جون 1938ء کے " طوفان " میں بھی خیر مقدم کا سلسلہ دکھائی دیتا ہے ۔ آنریبل ڈاکٹر سیّد محمود وزیر تعلیم صوبہ بہار نے اس اخبار کا خیر مقدم کیا ہے ۔ 3 ، جون 1938ء کے کالم " مد و جزر " میں امرتسر کی ایک خبر کو موضوع کالم بنایا ہے ۔ وہ خبر یہ ہے کہ سیکرٹری مجلسِ اتحادِ ملت نے رستمِ زماں گاماں پہلوان اور رستمِ ہند حمیدا پہلوان کو دعوت دی ہے کہ وہ نیلی پوش مجاہد بن کر اپنی سیاسی حیثیت کو بھی نمایاں کردیں ۔ شوکت تھانوی لکھتے ہیں کہ :

" اب اگر ان سیاسی جماعتوں میں پہلوان بھرتی کئے گئے تو سیاسی کاٹ چھانٹ کی جگہ پر کشتی کے عجیب عجیب داؤں پینچ دیکھنے میں آئیں گے اور ہر جماعت کی طاقت کا اندازہ اس کے پہلوانوں کی طاقت سے ہوگا اس کے علاوہ اب سیاسی اختلافات اس طرح نہ ہوں گے کہ اخبارات میں مضامین بازی ہورہی ہے یا پلیٹ فارموں پر تقریر کے جوہر دکھائے جا رہے ہیں بلکہ اب یہ ہوگا کہ اگر اتحادِ ملت کو احرار سے کوئی شکایت پیدا ہوئی تو ادھر سے گاماں نے خم ٹھونک کر یاعلی کا نعرہ بلند کیا اور ادھر سے گونگا پہلوان اپنا کس بل دکھاتا ہوا اکھاڑہ میں کودا اور تھوڑی ہی دیر میں مار پچھاڑ ہوگئی یعنی کوئی نہ کوئی فیصلہ ہوگیا۔ یہ کیا کہ زبان چل رہی ہے اور قلم چل رہا ہے مگر کچھ طے نہیں پاتا ۔ "[1]

یہ اخبار بھی چھ صفحوں پر مشتمل ہے ۔ اس کے آخری یعنی چھٹے صفحہ پر شوکت تھانوی کی کتابوں سونیا چاہ " دل پھینک ، سودیشی ریل ، بڑبھس ، خانم خان ، موجِ تبسم ، گھرستان ، اور سیلابِ تبسم کے اشتہارات ہیں۔

---

[1] روزنامہ " طوفان " لکھنؤ ، 3 ، جون 1938ء ایڈیٹر شوکت تھانوی ، ص: 2 ، " مدّ و جزر " ۔

4 ، جون 1938ء کا اخبار پہلے اخبارات کی طرح پانچ کالمی ہے ۔ تمام اخبارات میں شوکت تھانوی نے پہلے صفحہ کی اہم سرخی کو زیادہ سے زیادہ تین کالمی بنایا ہے ۔ اس اخبار کی اہم سرخی کے الفاظ یہ ہیں " برطانیہ کی شرائطِ صلح ہر ہٹلر کی ٹھوکروں میں " دوسری لائین میں " برطانیہ کے لئے صرف ایک صورت باقی ہے یعنی جنگ " اور تیسری لائن میں " مسٹر چرچل جرمنی کی اس گستاخی پر آتش زیرپا ہیں " ۔ یہ سرخی تین لائینوں میں لکھی گئی ہے ۔ پہلی لائن کے لئے جلی قلم استعمال کیا گیا ہے ، دوسری لائن کے لئے اس سے کم اور تیسری لائن کے لئے اور کم ـــ اس سرخی کو پڑھنے سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ یہ کسی ادیب کی عبارت ہے ۔

4 ، جون 1938ء کے اخبار میں نصیر الملک معتمد السلطان سرسیّد لیاقت علی آف بھوپال کا " طوفان " کے خیر مقدم کے سلسلہ میں خصوصی پیغام شائع ہوا ہے : " چونکہ میری طبعیت ضرورت سے زیادہ سکون پسند واقع ہوئی ہے لہذا اس نام سے ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوئی لیکن جب میں نے اس کا مقالہ افتتاحیہ پڑھا تو معلوم ہوا کہ اس " طوفان " کی غرض و غایت یہ نہیں ہے کہ ملک میں کوئی نیا طوفان برپا ہو بلکہ اس کی بے تعصبی اور غیر جانب داری کی پالیسی سے وہ فرقہ بندی کا طوفان جو ہماری اجتماعی زندگی میں تلاطم پیدا کر رہا ہے ضرور ہوجائے لہذا میں اس اخبار کا دلی مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ جس مقصد سے اس کا اجراء کیا گیا ہے وہ پورا ہو اور اس کا اصول، عمل ہمیشہ راست بازی اور اعلاء حق رہے ۔" [1]

---

[1] روزنامہ " طوفان " لکھنؤ ، 4 - جون 1938ء ، ایڈیٹر شوکت تھانوی ، ص : 2 ۔

4- جون 1938ء کے اداریہ میں کانگریسی لیڈروں کے قول و فعل کے تضاد اور دورنگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے کانگریسی دور میں سیاسی ڈکیتیوں کو موضوع بحث بنایا ہے اور کانگریس کی پالیسیوں پر بھرپور تنقید کی گئی ہے۔ اپنے کالم " مدّ و جزر " میں بھی شوکت تھانوی نے کانگریسی وزراء کی تنخواہوں اور الاؤنسوں پر تنقید کی ہے :

" ان وزراء نے تنخواہ کے نام سے تو صرف پانچ سو روپیہ قبول کیا ہے لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ بغیر تنخواہ کا نام لئے اگر ان کو باقی تمام سرکاری ملازمین کی تنخواہ بھی دے دی جائے تو غالباً یہ با مروت وزراء غیرت نہ برتیں گے اور اس کو اپنا ہی گھر سمجھ کر بے تکلفی سے کام لیں گے۔ مگر اب ذرا تنخواہ کے علاوہ جو کچھ یہ حضرات حاصل کرتے ہیں اس کی تفصیل بھی سن لیجئے۔

1- تنخواہ کے علاوہ سواری کا خرچ ایک سو پچاس روپے ماہوار۔
2- سرکاری موٹر کار مع پٹرول اور اس کی ٹوٹ پھوٹ کا خرچ حکومت کے ذمہ۔
3- رہنے کے لئے وزراء کے شایان شان کوٹھی۔
4- کوٹھی میں تمام اثاث البیت جو وزراء کے مرتبہ کے مطابق شاندار ہونا چاہئیے۔
5- چھ آنہ فی میل کے حساب سے سفر خرچ۔ " [1]

5- جون 1938ء کے اداریہ میں بھی ہمیں شوکت تھانوی کا ادبی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کی سرخی بنائی ہے " پنڈت جواہر لال نہرو کی زمینداروں کو دھمکیاں " اور چھوٹی سرخی اس کے نیچے یہ ہے کہ " ملاح در فرنگ و کشتی در ہند " اس کے بعد حسبِ دستور یہ شعر تحریر کیا گیا ہے۔

---

[1] روزنامہ " طوفان " لکھنؤ، 4- جون 1938ء، ایڈیٹر شوکت تھانوی : ص: 2۔

" مرا چاک گریباں دیکھ کر تم بعد میں ہنسنا
ہنسے گی تم پہ دنیا تم خبر لو اپنے داماں کی

پنڈت جواہر لال نہرو پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" خود آپ اپنی تقریروں کو ملاحظہ فرمائیے اور کانگریسی حکومت کے قیام سے قبل کی پوری زندگی کا مطالعہ کر جائیے تو آپ کو اپنی ہر جنبش اور ہر حرکت بالکل وہی بلکہ اس سے بہت زیادہ پختہ نظر آئے گی جس کو آج اپنی مجنونانہ اور بدمستانہ حرکت کہہ رہے ہیں ؎

اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے
جس قدر کرنا ملامت اور کو آسان ہے " [1]

شوکت تھانوی کی ادبی حیثیت مسلّم ہے اس لئے وہ جب اخبار کے لئے کوئی بھی چیز لکھتے ہیں تو اس میں لاشعوری طور پر برمحل اشعار کا استعمال ان کی تحریر میں ادبیت پیدا کردیتا ہے ۔

اپنے کالم " مدّ وجزر " میں شوکت تھانوی نے لکھنو کے شیعہ و سنی فساد کو موضوعِ کالم بنایا ہے ۔ انہوں نے نہایت چابکدستی سے مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ فساد حکومت کے ایماء پر ہو رہا ہے تا کہ مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہوجائے اور وہ آسانی سے ان پر حکومت کرتے رہیں وہ لکھتے ہیں :

" مگر اس سلسلہ میں ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر حکومت وقت جو نہ شیعہ ہے نہ سنی ، اس معاملہ میں کیوں مداخلت کررہی ہے ۔ دراصل غور کیجئے تو یہ کرفیو آرڈر اور دفعہ ایک سو چوالیس (144) وغیرہ جو شیعوں اور سنیوں کے درمیان حائل کی جارہی ہے ۔ ایک قسم کی مداخلت فی الدین ہے ----

---

[1] روزنامہ " طوفان " لکھنو ، ایڈیٹر شوکت تھانوی ، 5-جون 1938ء ، ص: 2 ۔

---- دراصل یہ سب کچھ حکومت کی مداخلت ہی کی بدولت تو ہو رہا ہے ۔ نہ اس مداخلت کا بھروسہ ہوتا نہ جانبازیوں اور سرفروشیوں کے یہ کمالات دکھائے جاتے مگر افسوس تو یہی ہے کہ حکومت ہمارا یہ مشورہ نہ مانے گی اور اس گھریلو لڑائی میں بھی اپنی ٹانگ ضرور اڑائے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نتیجہ کچھ نہ نکل سکے گا ۔ " [1]

7 - جون 1938 ء کے طوفان کا اداریہ اسپین کی خانہ جنگی کے بارے میں لکھا گیا ہے عنوان ہے " اسپین کے جنازہ میں برطانیہ کا کندھا ـــــ اب بھی پوچھا تو مہربانی کی ـــ " اپنے کالم " مدّ و جزر " میں شیعہ سنی فسادات کو موضوع بنایا گیا ہے ۔

(ضمیمہ) 8 - جون کے اداریہ میں لکھنؤ کی زمیندار کانفرنس کے کانگریس پر اثرات کو موضوع بنایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو ایسا سنجیدہ کانگریسی بھی زمینداروں کی اس بیداری پر اپنے قابو سے باہر نظر آتا ہے اور زمیندار کانفرنس کی تجویزوں کو دیکھ کر ایک ایسا بیان دیتا ہے جو کسی طرح بھی اس کی شان کے شایان اور اس کی سیاسی عظمت کے مطابق نہیں کہا جا سکتا ۔

8 - جون کے مدّ و جزر میں حیدر آباد کی ایک خبر کو موضوع بنایا ہے کہ نواب مہدی نواز جنگ بہادر میونسپل کمشنر اپنے رفقائے کار کی ایک جماعت کے ساتھ 3 - جون کی صبح کو جھاڑو ، پنجہ اور ٹوکری لے کر نکلے اور سڑکوں کی صفائی اپنے دستِ مبارک سے شروع کردی ۔ اپنے اس طرزِ عمل سے نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے ایک لاجواب سبق پڑھایا ہے اور ان کا یہ کارنامہ صرف

---

[1] روزنامہ " طوفان " لکھنؤ ، 5 - جون 1938ء ، کالم " مدّ و جزر " ، ص: 2 ۔

حیدر آباد ھی نہیں بلکہ تمام ھندوستان بھر کے میونسپل کمشنروں کے لئے باعث تقلید ھونا چاھئیے ۔

8 ۔ جون 1938ء کو روزنامہ " طوفان " کا ایک ضمیمہ بھی چھاپا گیا جس کے مدّ و جزر میں زمیندار کانفرنس کو موضوع بنایا گیا ھے جس میں کہا گیا کہ زمیندار غفلت کی نیند سوتے رھے اور کانگریس نے کسانوں کو زمینداروں کے خلاف بھڑکانا شروع کردیا اور اس طرح کسانوں کی ھمدردیاں حاصل کرلیں لیکن اب زمیندار جاگ گئے ھیں ۔ اور انھوں نے دیہات میں جا کر کسانوں کو کانگریس کے مذموم ارادوں سے باخبر کردیا ھے اور ایک والنٹیرکور بنانے کا فیصلہ بھی کیا ھے جو زمینداروں کے جان و مال کی حفاظت کرسکے ۔ کانگریس کو بھی اپنے والنٹیر پر ناز ھے لیکن زمینداروں کے والنٹیر دیہات میں جا کر کسانوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کریں گے ۔ اسی کالم کے آخر میں زمینداروں کو مشورہ دیا ھے کہ وہ اپنی مرکزیت اور اجتماعیت کو قائم رکھیں اور کسانوں کو بھی اس اجتماعیت میں اپنے برابر سے شریک کریں ۔

9 ۔ جون کے اداریہ میں کرفیو آرڈر ۔ حکومتِ وقت کے لئے ایک لمحۂ فکریہ کے موضوع پر اظہارِ خیال کیا گیا ھے ۔ لکھنو میں ساڑھے سات بجے شام سے کرفیو آرڈر لگا دیا جاتا تھا جس کی وجہ سے مسلمان مسجد میں جا کر عشاء کی نماز نہیں پڑھ سکتے تھے ۔ شوکت تھانوی نے اپنے اداریہ میں حکومتِ وقت کی توجہ اس اھم مسئلہ کی جانب مبذول کروائی ھے اور حکومت سے اپیل کی ھے کہ اگر کرفیو آرڈر لگانا ایسا ھی ضروری ھے تو اس کا وقت ساڑھے نو بجے رات سے کردیا جائے تاکہ مسلمانوں کے مذھبی فرائض کی ادائیگی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ھو ۔

10۔ جون 1938ء کے " طوفان " کے فکاھیہ کالم " مدّ و جزر " میں شوکت تھانوی نے حکومتِ پنجاب کے اس فیصلہ کو موضوع بنایا ھے جس میں حکومت نے

اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے چند مزید ٹیکس عائد کرنے کا فیصلہ کیا تھا ۔ ایک نیا ٹیکس " شادی ٹیکس " کے نام سے بھی عائد کیا گیا تھا جو ہر شادی کرنے والے سے وصول کیا جائے گا ۔ شوکت تھانوی اپنے مخصوص انداز میں اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں : " اگر غور کیجئے تو شادی بجائے خود ایک دائمی ٹیکس کی حیثیت رکھتی ہے اور شادی کے بعد اس ٹیکس میں روزانہ اضافے ہی ہوتے رہتے ہیں کہ آج صاحبزادے تولد ہوئے ہیں ، کل صاحبزادی صاحبہ نے ولادت باسعادت فرمائی ہے ۔ آج بیگم صاحبہ اختناق الرحم کے دورہ میں مبتلا ہیں ۔ کل ان کی ہمشیرۂ محترمہ کی شادی کا حادثہ درپیش ہے ۔ آج صاحبزادے صاحب طولعمرہٗ کا ختنہ ہے کل صاحبزادی صاحبہ کی روزہ کشائی ہے مختصر یہ کہ دنیا بھر کے ہنگامے شادی کے بعد ہی سے شروع ہوتے ہیں اور شادی ہی ان تمام مصائب کی جڑ ہے ۔ اس سے لوگ یوں ہی پناہ مانگتے ہیں اور کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں پھر جب ٹیکس عائد ہو جائے گا تو لوگ اور بھی " واحد حاضر " رہنا پسند کریں گے ۔ "[1]

اس اہم موضوع پر اتنا شگفتہ انداز اختیار کر کے انہوں نے حکومت کو یہ مشورہ دیا ہے کہ اپنی آمدنی کے لئے آپ شادی ٹیکس ضرور لگائیں لیکن صرف ان لوگوں پر جو اپنے نابالغ بچوں کی شادیاں کردیتے ہیں یا ان بوڑھوں پر جو بوالہوسی کا شکار ہو کر شادیاں رچانے بیٹھ جاتے ہیں ۔

14- جون کے " مدّ و جزر " میں انٹرنس کے نتائج پر گفتگو کی گئی ہے ۔ برعظیم میں انٹرنس پاس کرنے کا رجحان بڑھ رہا تھا جتنی تعلیم عام ہورہی تھی

---

[1] روزنامہ " طوفان " لکھنؤ ، 10 - جون 1938ء ، کالم " مدّ و جزر " ، ص: 2 ۔

اتنی ہی بیروزگاری میں اضافہ ہورہا تھا ۔ شوکت تھانوی نے اس بیروزگاری کے مسئلہ پر تشویش کا اظہار کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں : " ابھی تو یہ غریب ادھر ادھر نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھریں گے ۔ شروع شروع میں تو بڑی تنخواہوں کی نوکریاں ڈھونڈیں گے اس کے بعد معمولی معمولی تنخواہوں پر جان دیں گے اور آخر کار نتیجہ یہ ہوگا کہ جب معمولی نوکریاں بھی نہ ملیں گی تو ان میں سے بہت سے انقلاب پسند ہوجائیں گے ۔ کچھ لیڈر بن جائیں گے ۔ کچھ فلم کمپنیوں کے چکر لگائیں گے ۔ کچھ شاعر ہوجائیں گے اور کچھ ایڈیٹر ---- اب بتائیے کہ ہم کیونکر ان کامیاب طلبہ کو مبارکباد دے سکتے ہیں البتہ تعزیت ہمارا فرض ہے لہذا ہم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ آپ پاس ہوگئے ہیں خیر صبر کیجئے خدا آپ کو غریق ملازمت کرے اور آپ کے تعلیم دلوانے والوں کو صبر جمیل عطا فرمائیے ۔" [1]

17 ۔ جون 1938ء کے " مدّ و جزر " میں شوکت تھانوی نے پنجاب کے اخباروں سے گلہ کیا ہے کہ بمبئی میں کانگریس اور مسلم لیگ کا قصّہ اہم نوعیت اختیار کرتا جا رہا ہے لیکن پنجاب کے اخبار اسے کوئی اہمیت نہیں دے رہے ہیں وہ ان اہم مسائل پر قلم اٹھانے کی بجائے آم اور خربوزہ پر کالم اور اداریہ لکھ رہے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں : " مولانا عبدالمجید سالک مدیر " انقلاب " اور ملک نصراللہ عزیز مدیر " زمزم " آج کل اپنے پورے انہماک کے ساتھ سیاستِ امبہ کی گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف ہیں ۔ بمبئی میں کانگریس اور مسلم لیگ کا قصہ چھڑا ہوا ہے ادھر لاہور میں یہ نہایت اہم مسئلہ درپیش ہے کہ آم اور خربوزے کے معاملات کو کس طرح طے کیا جائے ۔ یہ دراصل کوئی معمولی بات نہیں ہے ۔

---

[1] روزنامہ " طوفان " لکھنؤ ، 14 ۔ جون 1938ء ، کالم " مدّ و جزر " ، ص : 2 ۔

بلکہ ہم تو اس کو کانگریس اور مسلم لیگ کے قضیہ سے کم اہمیت نہیں دیتے ۔ کانگریس اور مسلم لیگ میں جو مناسبت ہے تقریباً وہی مناسبت ہم کو آم اور خربوزے میں نظر آتی ہے ۔" [1]

18۔ جون 1938ء کے اداریہ کی سرخی ہے " کانگریس کے چار شکار ۔ مسلمان ، اچھوت ، زمیندار اور مزدور " کانگریس اپنے آپ کو ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت کہتی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسے نہ مزدوروں کا اعتماد حاصل ہے نہ زمینداروں کا ۔ اور اس سے نہ مسلمان مطمئن ہیں نہ اچھوت ۔ پھر یہ نمائندہ جماعت کیسے ہوسکتی ہے ۔ شوکت تھانوی نے اسے ایک ایسا جھلملاتا ہوا چراغ کہا ہے جسے چاروں طرف سے آندھیوں نے گھیر لیا ہو ۔

21 ۔ جون کے اداریہ کا موضوع ہے " کانگریسیوں کی اردو دشمنی " شوکت تھانوی نے قائداعظم محمد علی جناح کی ایک تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ قائداعظم نے اپنی تقریر میں کانگریس کی اردو دشمنی اور ہندی نوازی کے متعلق جو کچھ کہا تھا اس کا جواب مولانا ابوالکلام آزاد نے حسب معمول کانگریس کی حمایت میں دیا ہے ان کا یہ بیان شاید کانگریسیوں کے لئے تو اہم ہو لیکن کانگریسی حدود کے باہر کسی نے اسے قابل غور بھی نہیں سمجھا ۔

21 ۔جون 1938ء کے " مدّ وجزر " کا آغاز شوکت تھانوی نے ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے : " کلکتہ میں ایک صاحب ہیں ملیح آبادی ۔ آپ آم نہیں بلکہ آدمی ہیں حالانکہ آپ کو آدمی کہنا بھی زیادتی ہے اس لئے کہ آپ آدمی ہونے سے زیادہ ہندو معلوم ہوتے ہیں اور ایک ایسے اخبار کے ایڈیٹر ہیں جس

---

[1] روزنامہ " طوفان " لکھنؤ ، 17۔جون 1938ء ،
ایڈیٹر شوکت تھانوی ، " مدّ وجزر " ، ص: 2 ۔

میں محض واؤ کی کسر ہے ورنہ وہ اخبار ہی ہندو کہلاتا ۔ پھر بھی ہندوستان کا تخلص یعنی " ہند " تو ہے ہی ۔ ان حضرت کی تعریف تو خیر ہم عرصہ سے سنتے تھے کہ آپ بھی عجائبات عالم میں سے ہیں ۔ معاصر "انقلاب" آپ کو ہمیشہ چینی زبان میں پھونگچو کہا کیا ۔ ملیح آباد والے آپ کو محض خان صاحب کا لٹھ سمجھتے رہے اور عوام اسی غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ آپ ملیح آباد کے آموں میں سے کون سے آم ہیں ۔ دوسروں کا تو خیر ذکر ہی کیا ہم کو خود اعتراف ہے کہ ہم آج تک آپ کے متعلق یہی نہ سمجھ سکے کہ آپ قلمی ہیں یا تخمی ۔" [1]

22 ۔ جون 1938ء کے اداریہ میں " کانگریس کی فوجی تنظیم " کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں : " آج کل کانگریس کی تمام تر توجہ محض اس جانب مبذول ہے کہ کسی طرح اپنے رضاکاروں کی تعداد میں اضافہ پر اضافہ کرے اور ان تمام رضاکاروں کو فوجی تنظیم کے ساتھ باقاعدہ کانگریسی لشکر کی صورت میں میدان کار زار میں جانے کے لئے تیار رکھے ۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سا میدان کار زار ہے جس کے لئے کانگریس کو اس "بھرتی" کی ضرورت اس شدّت کے ساتھ محسوس ہوئی ہے --- اس سوال کا جواب بالکل صاف ہے اور سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ یہ فوجی تنظیم دراصل زمینداروں کی اس والنٹیر کور سکیم کا نہایت غلط اور بھونڈا سا جواب ہے جو زمیندار اپنے تحفظ کے لئے عمل میں لانا چاہتے ہیں ۔" [2]

---

[1] روزنامہ " طوفان " لکھنؤ ، ایڈیٹر شوکت تھانوی ، 21 ، جون 1938ء ، کالم نمبر 4 ، 5 ، ص: 2 ۔

[2] روزنامہ " طوفان " لکھنؤ ، 22 ۔ جون 1938ء ، ایڈیٹر شوکت تھانوی ، ص : 2 ۔

24- جون 1938ء کے اداریہ کی سرخی ہے " مسلم رابطۂ عوام کی تحریک- مسلم اداروں کی بیداری میں کیفیتِ خواب " شوکت تھانوی نے اس اداریہ میں مسلمانوں کی کوتاہیوں کی نشاندہی کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں بیداری تو ضرور پیدا ہوگئی ہے لیکن اس بیداری میں غنودگی کی کیفیت پائی جاتی ہے اگر ان میں یہ غنودگی نہ ہوتی تو کانگریس کے ہندوؤں کی یہ جراُت نہ ہوتی کہ وہ مسلمانوں کے گھروں میں گھس کر ان کی تباہی کا باعث بنیں - یہ سب کچھ مسلمانوں کی نا اتفاقی اور انتشار کی وجہ سے ممکن ہوا اگر مسلمان صحیح طور پر منظم اور متحد ہوتے تو ان میں ہندوؤں کی شاطرانہ چالوں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوچکی ہوتی - مسلمان اپنی طاقت کو سمجھتے ہوئے بھی اس کے استعمال سے تغافل برت رہے ہیں اور حد یہ ہے کہ انہیں اپنی سب سے بڑی قوت یعنی پریس تک کا ہوش نہیں ہے - بہت سے مسلم اخبارات اپنی اقتصادی حالت سے مجبور ہو کر کانگریس کے ہاتھوں ضمیر فروشی کر رہے ہیں - اخباروں کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش تو درکنار مسلم رہنماؤں کی طرف سے زبانی ہمدردی اور لفظی حوصلہ افزائی تک میں انتہائی بخل سے کام لیا جاتا ہے -

26- جون 1938ء کے اداریہ کی سرخی ہے " جنرل نہیں سپاہی بنئیے - حامیانِ مسلم لیگ سے دو دو باتیں " اس موضوع کو زیر بحث لاتے ہوئے شوکت تھانوی کہتے ہیں کہ مسلم لیگ میں سپاہی بہت کم ہیں اور جنرل بہت زیادہ ہیں - کام کرنے والے تھوڑے ہیں اور احکامات دینے والے زیادہ ہیں - ہر فرد اپنی جگہ پر ایک مستقل لیڈر رہے اور ہر لیڈر اپنی لیڈرانہ عظمت اور اپنے وقار کی آئینہ داری میں ہمہ تن مصروف نظر آتا ہے - ان خامیوں کے باوجود مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لئے قابل فخر خدمات انجام دی ہیں مسلم لیگ کی چند ہی انگڑائیوں سے کانگریس کے ایوان میں زلزلہ کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے - اگر ہمارے رہنما ایوانوں میں بیٹھنے کی بجائے سپاہیانہ شان کے ساتھ میدان عمل میں

آ جاتے تو نہ معلوم اب تک ان کیفیات میں کتنا اضافہ ہوگیا ہوتا ۔

26 ۔ جون 1938ء کے " مدّ و جزر " کا آغاز شوکت تھانوی نے اس طرح کیا ہے : ، گاندھی جی کے متعلق ایک اخبار میں یہ سرخی نظر سے گذری کہ " گاندھی جی کب مریں گے " اس سے قبل کہ اس کے متعلق ہم کچھ عرض کریں اس سوال کا جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ " کبھی نہیں " ؟ اس لئے کہ جو شخص اکیس اکیس دن تک مرنے کی مسلسل کوشش کرے یعنی برت رکھنے کے باوجود زندہ رہا ہو اس کے مرنے کی کیا امید ہو سکتی ہے ۔ ان کی طرح کوئی اور ڈھائی پسلی اور آدھی چھٹانک وزن کا آدمی ہوتا تو دو ہی دن میں ایں جہانی سے آنجہانی ہوجاتا مگر آپ ہیں کہ اس قسم کے سینکڑوں برت رکھے ۔ ہزاروں مرتبہ خون کے دباؤ اور خدا جانے کن کن امراض میں مبتلا ہوئے مگر اب تک " طولعمرہٗ " بنے ہوئے ہیں ۔ ایسی حالت میں آپ کے متعلق یہ سوال ہی خارج از بحث سا معلوم ہوتا ہے ۔"[1]

29 ۔ جون 1938ء کے اداریے کا موضوع ہے " محشر ستانِ فلسطین " اس اداریہ میں شوکت تھانوی نے فلسطین کے مسلمانوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے کہ وہ اپنے مذہبی حقوق اور اسلامی روایات کے تحفظ کے لئے کفن بردوش میدانِ جہاد میں موت و زیست کی فیصلہ کن کشمکش میں مبتلا ہیں اور ہر اس مصیبت کا مردانہ وار تبسّموں سے خیر مقدم کر رہے ہیں جس کے تصور سے بھی بڑے بڑے مردِ میدان لرزہ بر اندام ہوجاتے ہیں ۔ اس کے بعد شوکت تھانوی ہندوستان کے مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ انہیں اپنے فلسطینی بھائیوں کی مالی اعانت کرنی چاہئیے ۔ وہ لکھتے ہیں : " بہر صورت فلسطین کے مسلمان اپنا

---

[1] روزنامہ " طوفان " لکھنؤ ، 26 ۔ جون 1938ء ، ایڈیٹر شوکت تھانوی ۔

حقِ ایمان ادا کر چکے ہیں ، ادا کر رہے ہیں اور ادا کرتے رہیں گے مگر اب یہ مسئلہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے قابل غور ہے کہ ان سے ان کی اسلامی اخوت کیا تقاضہ کر رہی ہے - فلسطین کے مسلمان جس ایمان پر قربان ہو رہے ہیں وہ صرف ان کا ایمان نہیں بلکہ تمام دنیائے اسلام کا ایمان ہے اور یاد رکھئیے کہ اگر فلسطین کو یہود کا وطن بنا دیا گیا تو نہ مسجد اقصیٰ کی خیر ہے نہ فلسطین کی تقدیس کی سلامتی - اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے مسلمان کر ہی کیا سکتے ہیں وہ خود آزاد نہیں ہیں اور نہ ان کو کوئی ذمہ دارانہ حیثیت حاصل ہے - لیکن کچھ نہ کرنے پر بھی وہ مصیبت زدگانِ فلسطین کے لئے مالی اعانت کر سکتے ہیں - سینما دیکھنا چھوڑ سکتے ہیں - اپنی تفریحات میں قصر کر سکتے ہیں اپنے لہو و لعب میں اسلام کے نام پر تخفیف کر سکتے ہیں اور وہ تمام روپیہ جو ان مدوں میں صرف ہوتا ہے مسلمانانِ فلسطین کے لئے روانہ کیا جا سکتا ہے - "[1]

30 - جون 1938ء کا " مدّ و جزر " شوکت تھانوی کی ذاتی ڈائری ہے - اس کالم میں انہوں نے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار ایسے انداز میں کیا ہے جس انداز میں ایک شخص اپنی پرائیویٹ ڈائری لکھتا ہے - انہوں نے اس کالم کا آغاز اس طرح کیا ہے : " راقم الحروف ابھی مسوری سے واپس آیا ہے اور قبل اس کے کہ لکھنو کی گرمی سے بد حواس ہو کر پنکھا جھلے نہایت بدحواسی کے ساتھ مدّ و جزر میں مبتلا ہو گیا ہے - حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ مسوری سے واپس آ کر لکھنو میں شگفتہ نگاری کی کوشش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جس طرح روتے روتے کوئی زبردستی ہنسنے کی کوشش کرے اور اس کی یہ

---

[1] روزنامہ " طوفان " لکھنؤ ، اداریہ ، 29 - جون 1938ء ، ایڈیٹر شوکت تھانوی ، ص : 2 -

ہنسی رونے سے زیادہ عبرت انگیز نظر آئے۔ بہرحال ہم کو امید ہے کہ ناظرین طوفان آج کی اس مصنوعی ہنسی کو معاف فرما کر ہمارے شریکِ غم ہوں گے کہ ایک دن جنت میں رہ کر پھر اسی جہنم میں واپس آئے ہیں جو مقدّر ہوچکا ہے۔" [1]

4- جولائی 1938ء کے " مدّ و جزر " میں شوکت تھانوی نے کانگریسی مسلمانوں پر بھرپور طنز کیا۔ اسلامی روایات کو چھوڑنے اور مذہب سے مغائرت برتنے پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:- " کانگریس میں جو مسلمان شریک ہیں ان کا بھی عجیب عالم ہے۔ شکل و صورت ایسی بنائے پھرتے ہیں کہ کسی کی سمجھ ہی میں نہ آئے کہ یہ آدمی ہیں یا ہندو۔ ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے ہیں اور السلامُ علیکم کو کانگریس کی شان میں گالی سمجھتے ہیں۔ مسجد اور باجہ کا قضیہ ہو تو وہ مارے روا داری کے باجہ بجانا شروع کردیں گے مگر مسجد میں محض اس لئے نہ جائیں گے کہ اس سے فرقہ وارانہ رنگ پیدا ہوتا ہے۔ اپنے کو حضرت اور جناب وغیرہ کے بجائے شریمان لکھا ہوا دیکھ کر بے حد خوش ہوتے ہیں۔ سبزی کھاتے ہیں اور چپل پہنتے ہیں۔ خیر یہ تمام باتیں تو یوں ہی سی حماقت کی ہیں مگر عبرت انگیز اور حد درجہ افسوس ناک حالت یہ ہے کہ یہ کلمہ گو کانگریسی حضور سرورِ کائنات صلعم کو بھی صرف " محمد صاحب " کہتے ہیں۔ اور اس طرح اسلام سے اپنی مغائرت کا ثبوت دیتے ہیں۔ اِنّا لِلّٰہِ و اِنّا اِلیہِ راجِعون۔" [2]

---

[1] روزنامہ " طوفان " لکھنؤ " مدّ و جزر " ، 30- جون 1938ء ایڈیٹر شوکت تھانوی ، ص: 2۔

[2] روزنامہ " طوفان " لکھنؤ ، 4- جولائی 1938ء ، " مدّ و جزر " ص: 2۔

27 - جولائی 1938ء کے " مدّ و جزر " میں شادی کے مسئلہ پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے - پہلی جنگِ عظیم کے بعد مغربی ممالک میں لڑکیوں کے لئے ڈھنگ کے رشتے تلاش کرنا ایک بہت بڑا مسئلہ بن گیا تھا چونکہ مردوں کی ایک بہت بڑی تعداد جنگ عظیم میں کام آگئی تھی مغربی صورتِ حال کا ہندوستان سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں : " ہندوستان میں خدا نخواستہ یہ کیفیت تو نہیں ہے لیکن شریف خاندان لڑکیوں کے لئے ڈھنگ کے لڑکے یہاں بھی نہیں ملتے کوئی شرابی ہوتا ہے تو کوئی جواری ، کوئی بدچلن ہوتا ہے تو کوئی خاندانِ غلاماں کا چشم و چراغ - بہرحال لڑکی والے ایسے بدحواس نہیں ہوتے کہ ان ہی نا معقول لڑکوں کو اپنی لڑکیوں کا ہاتھ پکڑا دیں البتہ انتخاب میں ذرا سختی برتنا پڑتی ہے اور باوجود اس سختی کے اکثر دھوکہ کھا جاتے ہیں یعنی شادی کے بعد پتہ چلتا ہے کہ دولہا میاں تو جولاہے بھی ہیں اور بدمعاش بھی یا دولہا میاں نے جو ولدیت بتائی تھی وہ غلط ہے بلکہ ان کے صحیح شجرہ میں ولدیت " اینڈ کو " لکھی ہوئی ہے یا دولہا میاں جن کو نہایت سلیم الطبع سمجھ کر لڑکی دی گئی تھی دو مرتبہ کے سزا یافتہ ہیں اور تیسرا مقدمہ چل رہا ہے جس میں سزا ہوجانا تقریباً طے ہے - مختصر یہ کہ شادی بیاہ کے معاملہ میں ، یہاں بھی دقتیں ہیں -"[1]

روزنامہ " طوفان " کی مصروفیات کے علاوہ شوکت تھانوی دوسرے رسالوں کے لئے مضامین اور افسانے بھی تحریر کرتے رہتے تھے - اس کے ساتھ ساتھ ریڈیو کے لئے بھی بہت کچھ لکھتے تھے - 1936ء میں شوکت تھانوی کے دوست نسیم انہونوی نے عورتوں کے لئے ایک رسالہ " حریم " نکالا - اس کے ایڈیٹر

---

[1] روزنامہ " طوفان " لکھنؤ ، 27-جولائی 1938ء
ایڈیٹر شوکت تھانوی کالم " مدّ وجزر " ، ص: 2 -

نسیم انہونوی تھے اور سرپنچ جرنلس، لاٹوش روڈ ، لکھنؤ سے یہ رسالہ نکلتا تھا ۔ اس کے مضمون نگاروں میں شوکت تھانوی کا نام ہمیشہ سرِفہرست رہا ۔ زنانہ رسالہ کی مناسبت سے شوکت تھانوی نے لکھنو کی بیگمات کے چند گھریلو الفاظ کو اپنے مضامین کا موضوع بنایا ۔ یہ سلسلہ مضامین بہت دلچسپ ثابت ہوا اور اس کی مقبولیت کے پیشِ نظر نسیم انہونوی نے ان تمام مضامین کو کتابی شکل میں شائع کیا اور اس کتاب کا نام " مونڈی کاٹے " رکھا ۔ اس کتاب میں بارہ مضامین شامل کئے گئے ہیں ۔ ان کے موضوعات یہ ہیں ۔ (1) نگوڑے مونڈی کاٹے ، (2) اوئی ۔ نوج ، (3) نگلو ۔ زہر مار کرو ، (4) دور ۔ دفعان ، (5) چولہے میں جاؤ ، بھاڑ میں جاؤ ، (6) چل ۔ ہٹ ، (7) موئے — مردے ، (8) اے ہے ۔ ہے ہے ، (9) اوں ۔ واہ ، (10) توبہ ۔ اللہ ، (11) آگ لگے ۔ جھاڑو پھرے ، (12) بھئی اللہ ، اوئی اللہ ، ہائے اللہ ۔

نسیم انہونوی نے " مونڈی کاٹے " کا تعارف کراتے ہوئے شوکت تھانوی کی مزاح نگاری پر اس طرح روشنی ڈالی ہے : " شوکت صاحب کی مزاح نگاری کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر بات میں مزاح پیدا کر دیتے ہیں چنانچہ اوئی ، نوج ، مونڈی کاٹے ، موئے — مردے ، چل ۔ ہٹ ، دور ۔ دفعان وغیرہ میں بظاہر کوئی مذاق معلوم نہیں ہوتا ۔ ہم نے خود ان الفاظ کو عورتوں کے منہ سے بارہا سنا اور سنتے رہتے ہیں لیکن کبھی ہنسی نہیں آئی لیکن شوکت صاحب نے ان الفاظ کو سن کر ان میں مزاح کا زبردست پہلو نکال لیا اور انہیں مضامین کی صورت دے کر ایک دلچسپ کتاب لکھ ڈالی ۔ "[1]

---

[1] مونڈی کاٹے ، مطبوعہ یوسفی پریس لکھنؤ ، تعارف نسیم انہونوی ، ص: 3 ، 4 ۔

اس کتاب کا پہلا مضمون " نگوڑے ، مونڈی کاٹے " ہے - یہ خواتین کی وہ مہذب گالیاں ہیں جن کو شریف زادیاں رائج الوقت گالیاں نہ بک سکنے کی وجہ سے گالیاں بکنے کے موقع پر استعمال کرتی ہیں اور انہیں اس بات کا اطمینان ہوتا ہے کہ یہ گالیاں نہیں ہیں - شریف بہو بیٹیوں نے اپنے غصہ کے اظہار کے لئے یہ گالیاں ایجاد کی ہیں اور انہیں شرفاء کے یہاں بے دھڑک استعمال کیا جاتا ہے - نگوڑے اور مونڈی کاٹے کے معنی لغات میں تلاش کرنے کے باوجود ہمیں نہیں مل سکتے - یہ لکھنؤ کے ماحول میں وضع کئے گئے چند الفاظ صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو لکھنوی تہذیب اور معاشرت کو جانتے ہوں - شوکت تھانوی اپنے مضمون میں " نگوڑے " کے معنی کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں : " جہاں تک ہم کو معلوم ہے نگوڑے کے معنی تنہا کے ہیں لیکن بعض موقعوں پر نکمے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور ہوتا رہتا ہے مگر جس وقت عورتیں خود اپنی ذات کے لئے اس لفظ کو استعمال کرتی ہیں اس وقت اس کے معنی خاکسار کے بھی ہوتے ہیں اور کبھی کمبخت کے بھی - مثلاً ساس اور بہو کی قیامت خیز جنگ کے بعد جب پڑوسن بیچ بچاو کے لئے آتی ہیں اس وقت ساس کا بیان ہوتا ہے کہ " میں نگوڑی نہ اچھائی میں نہ برائی میں بیگم صاحب ہاتھ دھو کے میرے سفید چونڈے کے پیچھے پڑگئی ہیں ہر وقت یہی کل کل ہے " اور بہو بھی آواز ملا کر اپنا بیان دیں گی " تو مجھ نگوڑی نے آخر اس وقت کیا کیا تھا جو تم بڑبڑائے جاتی ہو -" ان دونوں بیانوں میں مہذب ساس اور مہذب بہو نے بجائے ایک دوسرے کو کہنے کے خود اپنے کو کمبخت کہا ہے -" [1]

---

[1] شوکت تھانوی : مونڈی کاٹے ، مطبوعہ یوسفی پریس لکھنؤ ، ص : 8 ، 9 -

ہندوستان میں عموماً اور لکھنؤ میں خصوصاً عورتوں اور مردوں کی زبان میں کچھ اختلاف ہے اور اس حد تک اختلاف ہے کہ اگر کسی باقاعدہ اردو داں سے ان الفاظ کا مطلب پوچھ لیا جائے تو وہ بھی بغلیں جھانکنے لگتا ہے - شوکت تھانوی نے اپنے ایک اور مضمون " اوئی - نوج " میں ان دونوں الفاظ کے مختلف معنی دریافت کرنے کی کوشش کی ہے - یہ دونوں الفاظ اپنے اندر معنی کی تہیں رکھتے ہیں اسی لئے اپنی روز مرہ کی گفتگو میں لکھنؤ کی خواتین اکثر ان الفاظ کا استعمال کرتی ہوئی نظر آتی ہیں - " اوئی " ایک وسیع المعنی لفظ ہے اس کے بارے میں شوکت تھانوی لکھتے ہیں: " اوئی " کو استعمال کرنے والیاں اس سے بخوبی واقف ہوں گی کہ " اوئی " کے کوئی ایک معنی نہیں بتا سکتا مگر " اوئی " کے سننے والے اس کو سوائے ایک مہمل لفظ کے اور کچھ نہیں سمجھتے لیکن آپ ہی بتائیے کہ اگر یہ لفظ مہمل ہوتا تو اس کے لئے اتنا اہتمام کیوں ، کہ کلمہ کی انگلی کو لبِ زیریں کے قریب لاکر یا ناک کے پاس پہنچا کر اس کو ادا کیا جاتا ہے اور کچھ اس طرح ادا کیا جاتا ہے کہ اس کو مہمل کہنے کو دل نہیں چاہتا بلکہ ہمارا تو خیال ہے کہ اگر بیگم قسم کی عورتیں " اوئی " کہنا چھوڑ دیں تو ان کا اوّل تو عورت رہنا مشکل ہے اور اگر رہیں بھی تو لیڈیز ہو کر رہ جائیں گی -" [1]

اسی مضمون میں " نوج " کے معنی تلاش کرتے ہوئے شوکت تھانوی لکھتے ہیں : " اسی خاندان کا لفظ ایک اور بھی ہے جس کو " نوج " کہتے ہیں اور اس کو ہوش سنبھالنے کے وقت سے تا دمِ تحریر مضمون ہذا سننے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کے معنی ہیں " خدا نہ کرے " مثلاً

---

[1] شوکت تھانوی : مونڈی کاٹے ، مطبوعہ یوسفی پریس لکھنؤ ، ص : 17 -

کوئی بیگم صاحبہ کہیں " نوج ہوا میں ریل پر بیٹھوں " تو اس کے معنی ہوں گے " خدا نہ کرے ہوا میں ریل پر بیٹھوں " لیکن استعمال کی کثرت کے اعتبار سے " اوئی " کے بعد اگر کسی کا نمبر آتا ہے تو وہ یہی " نوج " ہے جس کو ایک سوائے اردو کے اور زبانوں کی کتب لغات چھان چکنے کے بعد بھی کہیں نہ پاسکیں گے ۔" [1]

اوئی اور نوج کی زبان مردوں کے لئے مہمل سہی لیکن عورتوں کے لئے یہ کوئی مضحک چیز نہیں ہے البتہ اگر کوئی مرد عورتوں والی اوئی ۔ نوج شروع کردے تو وہ عورتوں کے نزدیک بھی تماشا ہوجائے گا اور مرد بھی اس کی ہنسی اڑائیں گے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ یہ الفاظ صرف عورتوں نے ہی اپنی ضرورت کے مطابق ایجاد کئے ہیں اور انہی کی زبان پر اچھے لگتے ہیں ۔

1935ء میں شوکت تھانوی نے اسی رسالہ میں قسط وار مسلسل افسانہ " سوتیاہ چاہ " کے نام سے لکھنا شروع کیا جسے بعد میں صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے کتابی صورت میں شائع کیا ۔ اس کا مقدمہ شوکت دلہن کے نام سے شوکت تھانوی کی پہلی بیگم سعیدہ شوکت نے تحریر کیا ہے وہ لکھتی ہیں ۔

" تمام مضامین سب سے پہلے میں سنتی ہوں البتہ جو مضامین دفتر میں لکھے جاتے وہ طبع ہونے کے بعد میری نظر سے گذرتے ہیں چنانچہ زیر نظر مسلسل افسانہ " سوتیاہ چاہ " بھی شوکت صاحب سے میں نے سنا نہیں بلکہ حریم کے صفحات پر قسط وار میں نے دیکھا ہے اور اس افسانے کے متعلق میرا ہمیشہ سے یہ دل چاہتا رہا کہ میں تفصیل کے ساتھ اس کے متعلق اظہارِ خیال کروں ۔ چنانچہ جب یہ کتابی صورت میں شائع ہونے لگا اور نسیم صاحب نے مجھ سے مقدمہ کے لئے کہلوایا تو مجھ کو گویا دل کی مراد ملی اور اب میں اظہارِ خیال کرسکتی ہوں [2]۔ "

---

[1] شوکت تھانوی: " مونڈی کاٹے " مطبوعہ یوسفی پریس لکھنؤ ، صفحہ = 18 ۔

[2] شوکت تھانوی : " سوتیاہ چاہ " مطبوعہ یوسفی پریس لکھنؤ ، مقدمہ از شوکت دلہن ، صفحہ = 3 ۔

اس ناول کا دار و مدار اس واقعہ پر ہے کہ ایک شوہر اپنی بیوی کے اس اصرار پر کہ وہ اولاد کے لئے دوسری شادی کرے بظاہر نہایت برہمی کے ساتھ انکار کرتا ہے لیکن چند ہی دنوں کے بعد اپنی بیوی کی ایک سہیلی سے عقدِ ثانی کے انتظامات اپنی بیوی کو بتائے بغیر شروع کردیتا ہے ۔ بیوی کو اس کی اطلاع ہوجاتی ہے تو وہ شوہر کی اس چالاکی بلکہ چوری پر افسردہ ہونے کے باوجود نہایت عالی ظرفی کے ساتھ اس غم کو برداشت کرتی ہے ۔ دوسری شادی ہوجاتی ہے ۔ ان دونوں سوتوں کے درمیان نہایت محبت کے تعلقات قائم رہتے ہیں جن کا شوہر کو علم نہیں ہوتا ۔ دونوں سوتنیں اپنے شوہر کے خلاف دلچسپ سازش تیار کرتی ہیں جس سے شوہر کافی حد تک پریشان ہوجاتا ہے ۔ اس ناول میں اس توقع کا اظہار کیا گیا ہے کہ مرد ایک عورت کو کس حد تک وسیع النظر دیکھنا چاہتے ہیں ۔

شوکت تھانوی کا اخبار " طوفان " ایک سال نکلنے کے بعد مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہوگیا ۔ لکھنو ریڈیو اسٹیشن قائم ہوچکا تھا ۔ اب شوکت تھانوی لکھنو ریڈیو کے باقاعدہ ملازم ہوگئے ۔ پھر فلم سے وابستہ ہو کر لاہور آگئے ۔ اس عرصہ میں بھی وہ اپنے مضامین اور افسانے رسالوں میں چھپواتے رہے ۔

15 ۔ اگست 1957 ء کو روز نامہ " جنگ " کراچی میں کالم نگار کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور فکاہیہ کالم " وغیرہ وغیرہ " کے نام سے لکھنا شروع کیا ۔

17 ۔ اگست 1957 ء کو روز نامہ جنگ کراچی میں شوکت تھانوی کا پہلا فکاہیہ کالم " وغیرہ وغیرہ " کے عنوان کے تحت شائع ہوا ۔ شوکت تھانوی سے پہلے " جنگ " کراچی میں مجید لاہوری فکاہیہ کالم لکھتے تھے ان کے کالم کا نام " حرف و حکایت " تھا ۔ روز نامہ " جنگ " کے علاوہ کئی اخبارات میں فکاہیہ کالم اسی نام سے چھپتا تھا اس لئے شوکت تھانوی نے اپنے کالم کا نام

بدل دیا ۔ اس کالم کا نام " وغیرہ وغیرہ " کیوں رکھا گیا ؟ اس سوال کا جواب شوکت تھانوی نے اس طرح دیا ہے ۔ " طے یہ پایا کہ اس کالم کا نام کچھ اس طرح تبدیل کیا جائے کہ اس کالم سے مجید لاہوری کی وابستگی بھی ظاہر ہوتی رہے اور عنوان کی انفرادیت بھی قائم رہے چنانچہ غور و فکر کے بعد اس کالم کا نام " وغیرہ وغیرہ " اس لئے طے کیا گیا کہ یہ عنوان بھی مجید لاہوری کا اپنایا ہوا تھا اور اسی عنوان کے تحت وہ ریڈیو پاکستان سے ہفتہ وار گل افشانیاں فرما رہے تھے اور اس عنوان کی ہمہ گیری سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے ۔" [1]

اسی کالم میں روز نامہ "جنگ " سے اپنی وابستگی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " جہاں تک میرا تعلق ہے میں اخبار "جنگ" سے اپنی وابستگی کے متعلق صرف یہ عرض کر سکتا ہوں کہ ع

پہونچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اب سے تقریباً بیس سال قبل ریڈیو نے جبکہ ریڈیو مشرف بہ پاکستان نہ ہوا تھا ۔ اور آل انڈیا ریڈیو تھا مجھ کو صحافت سے چھینا تھا اور آج ریڈیو پاکستان نے صحافت کی یہ امانت پھر صحافت کو سونپ دی ہے چنانچہ میں اپنے مرکز کی طرف واپس آ کر بارگاہِ خداوندی میں سر بسجدہ ہوں ۔ معلوم نہیں یہ سجدۂ شکر ہے یا سجدۂ سہو بہرحال میری زبان پر اس بارگاہ میں صرف یہ الفاظ ہیں کہ ع

ترے نام سے ابتدا کر رہا ہوں [2]

---

[1] شوکت تھانوی ۔ " وغیرہ وغیرہ " روز نامہ جنگ ، 17 ۔ اگست 1957ء

[2] ایضاً

روز نامہ " جنگ " کراچی میں رہ کر شوکت تھانوی نے اس اخبار کے لئے کیا کچھ لکھا ، اس کا اظہار انہوں نے ایک کالم میں اس طرح کیا ہے کہ " 15 ۔ اگست 1957 ء کو جب میں بر سرِ جنگ آیا ہوں اور اس کے عملۂ ادارت میں آ کر ادارتی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں تو مجھ کو میرے فرائض بتاتے ہوئے میر خلیل الرحمٰن صاحب نے فرمایا تھا کہ آپ ایڈیٹوریل اور شذرات وغیرہ لکھتے رہیں گے ۔ میں نے وضاحت چاہی کہ وغیرہ وغیرہ سے کیا مواد ہے آپ کی ؟ میر صاحب نے فرمایا کہ مثلاً مزاحیہ کالم "[1]

18 ۔ مارچ 1959 ء کو شوکت تھانوی نے روز نامہ "جنگ" کراچی کے تحت " وغیرہ وغیرہ " کے سلسلے کا آخری کالم لکھا اور آئندہ کے لئے اپنے اس کالم کو ابراہیم جلیس صاحب کے حوالہ کیا انہوں نے اپنے آخری کالم میں لکھا کہ " میں یہ کالم اگر پورے اعتماد کے ساتھ کسی کے سپرد کرسکتا تھا تو وہ صرف ابراہیم جلیس ہی ہو سکتے تھے جو میری طرح آپ کو بھی بہت جلد اپنی تحریروں کا گرویدہ بنالیں گے اور آپ کو مجھ سے یہ شکایت پیدا نہ ہوگی کہ میں نے محض اپنے سر کا بوجھ اتارا ہے ۔"[2]

ابراہیم جلیس نے اپنے پہلے کالم میں شوکت تھانوی کی تائید اس طرح کی کہ " جنگ " میں آنے میں میرے محترم دوست جناب شوکت تھانوی صاحب کا بھی بڑا ہاتھ ہے ۔ انہیں عرصۂ دراز سے پتہ تھا کہ مجھے "جنگ" کا بڑا شوق ہے اسی لئے انہیں ہر وقت میرے مستقبل کے بارے میں بڑی تشویش تھی ۔ چنانچہ بالآخر انہوں نے نہ مجھے " تھانے " جانے دیا اور نہ میدان جنگ پر بلکہ بڑے ہی مشفقانہ انداز میں نصیحت کی " بھیّا ۔ جنگ

---

[1] شوکت تھانوی ۔ " وغیرہ وغیرہ " روز نامہ جنگ کراچی ، 18 ۔ مارچ 1959 ء ۔

[2] ایضاً

پر جاؤگے تو " کام آجاؤگے " لیکن اگر جنگ میں آؤگے تو "کالم " لکھو گے دام کماؤگے نام پاؤگے وغیرہ وغیرہ ۔" [1]

حکومت نے کراچی کی بجائے اسلام آباد کو دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کیا تو روز نامہ " جنگ " کا ایڈیشن راولپنڈی سے بھی نکلنا شروع ہوا ۔ اور شوکت تھانوی کو راولپنڈی کے لئے اس کا ریذیڈنٹ ایڈیٹر مقرر کیا گیا ۔ راولپنڈی سے روز نامہ جنگ کا پہلا پرچہ بارہ صفحات پر مشتمل 13 ۔ نومبر 1959 ء کو نکلا جس میں شوکت تھانوی نے " پہاڑ تلے " کے نام سے ایک فکاہیہ کالم لکھنا شروع کیا ۔ 13 ۔ نومبر 1959 ء کے " پہاڑ تلے " کا آخری پیرا اس طرح ہے ۔

" اور صاحب سچی بات تو یہ ہے کہ ایک پہاڑ خود ہمارے چہرے سے برستا ہوا بھی لوگ دیکھ رہے ہوں گے وہ ہے ذمہ داریوں کا پہاڑ ، راولپنڈی سے جنگ کے اجراء نے جن ذمہ داریوں میں ہم کو مبتلا کردیا ہے وہ اتنی شدید ہیں کہ ان کے مقابلے میں نہ سردی کی شدت محسوس ہوتی ہے نہ مکانوں کی قلت نہ احباب کی فوقت کا احساس ہے نہ کسی راحت کے فقدان کا ہوش ۔ فکر ہے تو صرف یہ کہ راولپنڈی کا "جنگ" اپنے روایتی معیار اور ان توقعات کا حامل ہو جو ادارہ "جنگ" سے وابستہ ہوسکتی ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اس مقصد میں کامیاب کردے تو ہم بھی اِدھر اُدھر کی باتوں پر غور کریں گے اپنے سردی لگائیں گے ۔ مکان کی بجائے محل ڈھونڈیں گے ۔ ارزانی اور گرانی کے فرق کو محسوس کریں گے ہم سخن احباب کو ڈھونڈیں گے اور راولپنڈی میں سمندر نہ ہونے کا شکوہ کریں گے ۔ خدا وہ دن تو کرے ۔" [2]

---

[1] ابراہیم جلیس = وغیرہ وغیرہ ، روز نامہ جنگ کراچی ، 19 ، مارچ 1959ء ۔

[2] روز نامہ " جنگ " راولپنڈی ، 13 ۔ نومبر 1959 ء ۔

"پہاڑ تلے" لکھنے کا سلسلہ شوکت تھانوی نے تادمِ مرگ جاری رکھا ۔ 7 ۔ مئی 1963ء کے روز نامہ "جنگ" راولپنڈی میں ان کا آخری "پہاڑ تلے" چھپا جس میں ادارے کی جانب سے یہ وضاحت کی گئی تھی "آج جناب شوکت تھانوی کو رحلت فرمائے دو دن گذر گئے مگر یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جدا ہوچکے ہیں ان کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے ان کا آخری کالم نذر قارئین ہے ۔"[1] یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ 7 ۔ مئی 1963ء کو انتقال کا تیسرا دن تھا چونکہ شوکت صاحب کا انتقال 4 ۔مئی 1963ء کو ہوا تھا ۔ اس طرح یہ کہنا کہ "ان کو رحلت فرمائے دو دن گذر گئے" درست نہیں ہے ۔ "پہاڑ تلے" کے آخری کالم کا پہلا پیراگراف "مجھے افسوس ہے کہ میں کئی دن کی غیر حاضری کے بعد آج حاضرِ خدمت ہو رہا ہوں اور بے حد نادم ہوں کہ بغیر معزز قارئین کی اجازت حاصل کئے بیمار ہوکر صاحبِ فراش رہا ہوں ۔ آج جبکہ بسترِ علالت سے اٹھ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں ۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں اس وقت بھی کرسی پر نہیں بیٹھا ہوں بلکہ ہوائی جہاز میں سفر کر رہا ہوں اور بار بار ایک ایسا غوطہ کھا جاتا ہوں کہ ہاتھ غیر اردی طور پر حفاظتی بند ٹٹولنا شروع کر دیتے ہیں ۔ بہر صورت یہ "بمپنگ" ہوائی سفر میں موسم کی خرابی کے باعث نہیں ہے بلکہ سفرِ زندگی میں صحت کی خرابی کے باعث ہے اور چونکہ علالت کو صحت کی زکواۃ کہتے ہیں ۔ لہذا اس زکواۃ میں تھوڑا بہت میں خود تقسیم ہو کر پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوگیا ہوں اور ہر چند کہ آپ کو اپنے لئے میں نے دعا کی زحمت نہیں دی مگر خود آپ کے لئے دعا گو ہوں کہ جو نوعیت میری

---

[1] روز نامہ "جنگ" راولپنڈی "پہاڑ تلے" 7 ۔مئی 1963ء ۔

بیماری کی تھی اللّٰہ تعالیٰ اس سے آپ کو ہمیشہ محفوظ رکھے ۔ اس لئے کہ یہ مرض تھا ہی عجیب و غریب " ۔

اسی کالم کا آخری پیراگراف یہ ہے :

" آپ بھی کہیں گے کہ اتنے دن تک ایک تو غیر حاضر رہا اور اب حاضر ہوا ہے تو شفاخانہ کھول کر بیٹھ گیا ہے مگر یہ تفصیلات بھی عرض کرنا ضروری تھیں تا کہ آپ کو میری رخصتِ علالت منظور کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہو اور اگر اب بھی آپ ڈاکٹری سارٹیفیکیٹ طلب کریں تو میں ایک چھوڑ دو سرٹیفیکیٹ پیش کر سکتا ہوں ۔ ایک اپنا دوسرا اس مریض کا جس کی دوا بھی مجھ ہی کو پینا پڑی ۔ دعا فرمائیے اب میں آپ کی خدمت میں حاضر رہوں۔ اور ایسے حالات پیدا نہ ہونے پائیں کہ میں مارے غم خواری کے عوام النّاس کی دوا پی کر اپنا ستیا ناس کرتا پھروں ۔ میں قوم کا غم کھانے کو تیار ہوں مگر قوم کی دوا پینے کو ہرگز تیار نہیں ہوں ۔"[1]

جنگ (راولپنڈی) کی 7 ۔ مئی 1963 ء کی اشاعت میں شوکت تھانوی کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے ۔ " آخر موت کے بے رحم ہاتھوں نے ادارہ "جنگ" کی ممتاز شخصیت اور برصغیر پاک و ہند کے عظیم مزاح نگار ، صحافی ، ادیب اور شاعر کو ہم سے چھین کر ان گنت انسانوں کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیا ۔ طنز و مزاح اور صحافت کا بہت بڑا ستون گرگیا ۔ ہماری اپنی محفل سنسان ہوگئی ۔ قلم کاری کی بزم میں صفِ ماتم بچھ گئی ۔ موت اس بدقسمت انسان کے لئے برحق ہے لیکن کاش کوئی ایسا قانون بن سکتا

---

[1] ماخوذ از روز نامہ جنگ راولپنڈی ، 7 ۔ مئی 1963 ء ۔

کہ موت بڑھاپے کے آخر میں آنے کے اصول کی پابند ہوجاتی ۔ اچھے لوگوں کی بے موقع وفات زندگی کی قدر و قیمت اور حیات کا حسن ملیا میٹ کر کے رکھ دیتی ہے ۔ شوکت ادب ، صحافت اور ملک کی گراں بہا خدمات انجام دے رہے تھے کہ اچانک موت کے بے رحم پیغامبر نے انہیں آ لیا ۔ اور وہ اپنے پیارے بچوں ۔ اپنے دفتر میں اپنے ساتھیوں ، اعزاء اور احباب کو روتا چھوڑ گئے ۔ اس سانحہ کی کس سے تعزیت کی جائے ، صبر کی تلقین کسے کی جائے ۔ جبکہ یہ ہمارا اپنا غم ہے ۔ یہ ہمارا اپنا ماتم ہے ۔ شوکت طنز و مزاح کے شہنشاہ صحافت کے آزمودہ جرنیل اور ادب کے صاحبِ اسلوب اہلِ قلم تھے ۔ ان کی موت سے ادب کی محفل سونی ہوگئی ۔ صحافت ، طنز اور مزاح کی بزم میں صفِ ماتم بچھ گئی ۔ بہتے ہوئے آنسوؤں کی لڑیوں میں جبکہ خیالات پراگندہ اور احساسات ماتم گسار ہیں کن الفاظ سے اس شخصیت کی موت کا نوحہ کیا جائے ۔ جس کی ساری زندگی روتوں کو ہنسانے اور غمزدوں کو مسکرانے کا سامان مہیا کرتے گذر گئی ۔ شوکت اپنی جگہ ایک انجمن ۔ اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے ۔ وہ خوبیوں کا مجسّمہ اور اچھائیوں کا پیکر تھے ۔

حق مغفوت کرے عجب آزاد مرد تھا

آہ شوکت تھانوی

اِنا لِلّٰہِ و اِنآ اِلیہِ رَاجِعَون "[1]

---

[1] ماخوذ : اداریہ روز نامہ جنگ ، 7 ۔ مئی 1963 ء ، راولپنڈی ۔

شوکت تھانوی کے صحافتی کارناموں کا جائزہ لینے کے بعد ہم بہ آسانی اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ وہ اپنے دور کے ایک کامیاب صحافی تھے اور اردو صحافت کی تاریخ میں ان کو ایک ممتاز مقام ملنا چاہئیے ۔ ان میں وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو ایک کامیاب اخبار نویس میں ہونی چاہئیں ۔ ایک اخبار نویس کے لئے زبان و بیان پر قدرت ، مشاہدہ کی گہرائی ، قوتِ امتیاز اور احساسِ ذمہ داری کی صفات کا ہونا ضروری تصور کیا جاتا ہے ۔

شوکت تھانوی نے لکھنُو کے ماحول میں پرورش پائی تھی ۔ لکھنُو کے صاحبانِ علم و ادب کی صحبت نے ان کو اپنی فطری صلاحیتوں کے ابھارنے اور نکھارنے کے ایسے مواقع فراہم کئے کہ بہت جلد ان کا شمار اردو زبان و ادب کے ممتاز ادیبوں میں کیا جانے لگا اور ملک کے مشہور رسائل میں ان کے مضامین ، افسانے اور شاعری چھپنا شروع ہوگئی ۔ فکاہیہ کالم نگاری کا آغاز شوکت تھانوی نے 1928 ء میں کیا اور یہ سلسلہ 1963 ء تک جاری رہا ۔ اس قسم کے کالموں میں چھوٹی سی بات کو شگفتہ انداز میں بڑا بنا کر پیش کیا جاتا ہے ۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب کالم نگار زبان و بیان پر قدرت رکھتا ہو ۔ شوکت تھانوی زبان و بیان پر قدرت رکھتے تھے ۔ اس لئے فکاہیہ کالم نگاری کا سلسلہ مرتے دم تک جاری رہا ۔

زبان و بیان کی قدرت کے ساتھ ساتھ اخبار نویسی کے لئے وسیع مشاہدہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے ۔ اخبار نویس کا دماغ اس کیمرے کی مانند ہونا چاہئیے جو چیزوں کو دیکھتے ہی ان کے نقوش اپنے اندر جذب کر لیتا ہے ۔ وہ شخص جو اپنے گرد و پیش ہونے والی تبدیلیوں کا شعور نہیں رکھتا ایک کامیاب اخبار نویس نہیں بن سکتا ۔ شوکت تھانوی نے 1928 ء سے 1963 ء تک اخبار

میں مختلف حیثیتوں میں کام کیا ۔ مدیر کی حیثیت سے بہت سے اخبارات میں کام کیا ۔ " طوفان " کے نام سے اپنا اخبار نکالا اور آخر میں روز نامہ "جنگ " راولپنڈی سے وابستہ رہے ۔ ان سب اخبارات کے ادارتی مقالات دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ شوکت تھانوی گرد و پیش کے مسائل سے بخوبی واقف تھے اس دور کا کوئی اہم قومی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس تک ان کی نگاہ نہ پہنچی ہو ۔ 17 ۔ جولائی 1938ء کے روز نامہ " طوفان " لکھنؤ کے ادارتی مقالہ میں اردو ہندی تنازعہ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

" مرکزی کانگریس کی زبانی یا دستاویزی قرار داد خواہ کچھ ہو مگر زبان کے مسئلہ میں عملی صورت جو ہمارے پیش نظر ہے وہ صرف یہ ہے کہ اردو کو علانیہ طور پر نظر انداز کیا جا رہا ہے اور گو ہندی اس کی جگہ نہیں لے سکتی مگر زبردستی ہندی کو ٹھونسا جا رہا ہے ۔ حد یہ ہے کہ تمام لٹریچر ہندی میں ہوتا ہے اور اسی ہندی پر ہندی نہ جاننے والے کانگریسی بھی زندگی بسر کرتے ہیں ۔ لکھنؤ سٹی کانگریس کمیٹی کی ہندی نوازی اور اردو دشمنی کے چرچے آج کل عام ہو رہے ہیں اور اب تو اس ہندی نوازی میں اس قدر شدت پیدا ہوگئی ہے کہ غیر کانگریسی تو کیا خود کانگریس والے بھی چیخ اٹھے ہیں ۔" [1]

شوکت تھانوی کا ہر اداریہ گرد و پیش کے مسائل کے بارے میں ہے ۔ اور اس سلسلہ میں ان کا نقطۂ نظر اتنا واضح ہوتا ہے کہ ان کی تحریر میں کہیں ابہام پیدا نہیں ہوتا ۔

---

[1] ماخوذ : اداریہ روز نامہ " طوفان " لکھنؤ ، 17 ۔ جولائی 1938ء ص : 2 ۔

تیسری صفت جو ایک صحافی میں ضروری سمجھی جاتی ہے وہ قوتِ امتیاز ہے ۔ اسی قوت کے باعث اخبار نویس ضروری اور غیر ضروری باتوں میں تمیز کرتا ہے ۔ شوکت تھانوی کے اخبارات دیکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان میں یہ قوتِ امتیاز کتنی زیادہ تھی ۔ شوکت تھانوی کو اداریہ لکھنا ہو یا فکاہیہ کالم ، سب سے اہم مسئلہ موضوع کا انتخاب ہے ۔ شوکت تھانوی کے موضوعات کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ماضی کے مسائل کے بجائے اپنے عہد کے قومی مسائل کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے ۔ ان کی تمام تحریروں میں ہمیں کوئی غیر ضروری بات نظر نہیں آتی ۔

احساسِ ذمہ داری کی صفت میں ہم شوکت تھانوی کو ان کے معاصرین سے بہت آگے پاتے ہیں ۔ وہ خوب جانتے تھے کہ صحافت ایک کاروباری فن ہے اور وہ صحافی جو اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری میں کوتاہی کرتا ہے کبھی صحافتی دنیا میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا ۔ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ اخبار نویس مالی منفعت کی خاطر اخبار میں اشتہارات کی اتنی بھرمار کردیتے ہیں کہ اس میں خبروں ، ادارتی مقالات اور مضامین کے لئے پوری گنجائش باقی نہیں رہتی ۔ کبھی کبھی اخباروں کے کئی کئی کالم صرف ایسے مضامین سے پر کر دئیے جاتے ہیں جن کا تعلق باہمی جھگڑوں سے ہوتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ مضامین نہ ناظرین کے لئے دلچسپ ہوتے ہیں اور نہ مفید ۔ شوکت تھانوی کا خیال تھا کہ اخباروں کے کالم اخبار نویسوں کے ذاتی حملوں اور شخصی تنازعوں کے بجائے قومی مفادات کے لئے محفوظ ہونے چاہئیے ۔ شوکت تھانوی نے صحافت میں قدم رکھا تو انہیں سیّد جالب جیسے مشہور و معروف صحافی کی محبت اور تربیت سے استفادہ کا موقع ملا ۔ انہوں نے شوکت تھانوی جیسے شاعرانہ مزاج رکھنے والے شخص کی تربیت کچھ اس طرح سے کی کہ ان میں

ذمہ داری کا احساس روز بروز بڑھتا چلا گیا اور انہوں نے اپنے اخبار کو ذاتی لڑائیوں کا اکھاڑہ نہیں بننے دیا ۔ وہ اسی طریقہ کار کو انتہائی برا سمجھتے تھے کہ اخبارات میں ایک دوسرے کی ذات پر حملہ کیا جائے اور ایک دوسرے کے متعلق پبلک میں غلط فہمی پھیلائی جائے ۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر ایک اخبار نویس اتفاقاً دوسرے اخبار نویس پر کوئی ذاتی حملہ کرتا ہے تو دوسرے اخبار نویس کو حتی الامکان جوابی کارروائی نہیں کرنی چاہئیے ۔ اس قسم کی جوابی کارروائی کو وہ صرف اسی صورت میں جائز قرار دیتے ہیں ۔ جبکہ کسی اخبار یا اس کے قدر دانوں کی نسبت کوئی غلط فہمی پھیلائی جائے مگر ساتھ ہی ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس جواب میں سنجیدگی اور متانت سے بے نیاز ہو جانا کسی طرح درست نہیں ۔ ایک مرتبہ سیّد جالب دہلوی اور مولانا سیماب اکبر آبادی کے درمیان کچھ ان بن سی ہوگئی ۔ اس فساد کی جڑ وہ نظمیں تھیں جو رسالہ پیمانہ میں ساغر نظامی کے نام سے نکلتی رہتی تھیں جن پر سیّد جالب ہی کو نہیں بلکہ اکثر بزرگوں کو اعتراض تھا ۔ کہ ادب کے نام پر یہ کیا بے ادبی رواج پا رہی ہے ۔ سیّد جالب دہلوی نے اپنے اخبار میں اس صورتِ حال پر اداریہ لکھ دیا تو مولانا سیماب نے ایک مضمون میں سیّد جالب دہلوی کی شان میں کچھ گستاخی کی جس کا جواب شوکت تھانوی کو دینا پڑا ۔ انہوں نے مولانا سیماب کی بزرگی کا خیال رکھتے ہوئے اپنے کالم " دو دو باتیں " میں مولانا کے خلاف کئی کالم لکھے لیکن انتہائی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ۔ اس واقعہ کا تذکرہ شوکت تھانوی نے اپنی کتاب "کچھ یادیں کچھ باتیں " میں کیا ہے : " مولانا نے اس میں سیّد جالب کے متعلق ایک ایسا مضمون لکھا جس میں وہ بجائے ادبی بحث کے ذاتیات پر اتر آئے ۔ اور سید جالب کی افیون نوشی پر بحث کرتے ہوئے یہاں تک لکھ گئے کہ یہ افیونی اپنی پینک سے اس وقت

چونکا ہے جب زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے اور یہ اب تک اعتبارات کی لکیر پیٹ رہا ہے - اس مضمون کو دیکھ کر غصہ تو بہت آیا ، مگر مصیبت یہ تھی کہ یہ جھگڑا تھا دو بزرگوں کے درمیان - مولانا سیماب بھی میرے بزرگ تھے اور سیّد جالب میں فرق یہ تھا کہ سیّد جالب علاوہ بزرگ ہونے کے استاد بھی تھے -" [1]

شوکت صاحب کو اپنے استاد کا احترام کرنا پڑا اور " دو دو باتیں " میں اپنے استاد سیّد جالب دہلوی کی حمایت میں اور مولانا سیماب اکبر آبادی کے خلاف لکھنا پڑا لیکن اپنے ہر کالم میں ادب اور احترام کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھا جب یہ سلسلہ ختم ہوگیا تو شوکت تھانوی کو اس بات کا احساس رہا کہ انہوں نے مولانا سیماب کے ساتھ کچھ زیادتی کی ہے لیکن یہ زیادتی چونکہ ادب کے دائرے سے باہر نہیں نکلی تھی اس لئے جب ایک مشاعرے میں شوکت تھانوی کی ملاقات مولانا سیماب سے ہوئی تو وہ انتہائی گرمجوشی سے ملے - شوکت تھانوی لکھتے ہیں کہ : " یہ سلسلہ یوں تو ختم ہوگیا مگر مدتوں یہ حال رہا کہ جب کبھی اس خواہ مخواہ کی جنگ کا خیال آتا تھا دل ایک عجیب قسم کی ندامت سی محسوس کرتا تھا کہ میں ایک بزرگ کی شان میں کس قدر گستاخیاں کر چکا ہوں - اور اس جرم کی سزا مولانا سیماب نے بھی ایسی دی کہ میں شاید زندگی بھر نہ بھول سکوں گا کہ دو سال کے بعد جب پہلی مرتبہ علی گڑھ کے ایک مشاعرہ میں وہ اچانک میرے سامنے آگئے تو قبل اس کے کہ میں سر پر پیر رکھ کر بھاگوں انہوں نے مجھ کو نہایت گرمجوشی سے گلے لگاتے ہوئے کہا شوکت صاحب ! میں آپ کو ناراض نہ رہنے دوں گا - اگر اس قسم کی تلخیاں نہ ہوں تو زندگی کی شیرینی عذاب بن جائے -" [2]

---

[1] شوکت تھانوی = کچھ یادیں کچھ باتیں ، 1964ء ، لاہور ، ص- 90 ، 91 -

[2] ایضاً ، ص- 94 ، 95 -

ہم عصروں سے تعلقات کے بارے میں شوکت تھانوی فراخ دل اور روشن خیال واقع ہوئے تھے - وہ ان کے لئے اپنے دل میں رشک و رقابت کے جذبات نہیں رکھتے تھے - انہوں نے ہمیشہ اپنے ہم عصر اخباروں کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور اپنے اخبار میں ان کی تعریف فراخدلی کے ساتھ کرتے رہے ہم عصروں سے تعلقات کے سلسلہ میں یہ فراخدلی شوکت تھانوی کی صحافتی زندگی کی ایسی نمایاں خصوصیت ہے جو اخبار نویسوں کو آج بھی مشعل ہدایت کا کام دے سکتی ہے -

ہم دیکھتے ہیں کہ اخبارات میں قومی ہمدردی کے جذبات کا اظہار ایک ایسی عام بات ہوگئی ہے جس کو اگر مگرمچھ کے آنسوؤں سے تشبیہ دی جائے تو بے جا نہ ہوگا - ہر اخبار نویس ضروری سمجھتا ہے کہ قومی مصیبت کے زمانے میں پرجوش اداریے لکھے اور ایسے زور دار خیالات کا اظہار کرے کہ قوم اس کی غمخواری کی قائل ہوجائے اور اخبار کو ہاتھوں ہاتھ خریدنے لگے لیکن ایسے اخبار نویسوں کی تعداد بہت کم ہے جو اپنے دل میں قوم کا حقیقی درد رکھتے ہوں اور تحریری غم خواری کے علاوہ وہ عملاً بھی کوئی قومی خدمت کرنے کے لئے تیار ہوں - شوکت تھانوی کا شمار ایسے اخبار نویسوں میں ہوتا ہے جو تحریری غم خواری کے ساتھ ساتھ عملی خدمت کے لئے تیار رہتے تھے - شوکت تھانوی بھارت سے آنے والے بد حال مہاجرین کی ہر خدمت کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے - " پاکستان ہمارا " اور " قاضی جی " میں انہوں نے قومی اتحاد و اتفاق پر ہمیشہ زور دیا ہے -

شوکت تھانوی کے صحافتی کارناموں کی ایک ممتاز خصوصیت ان کا وہ طرز تحریر ہے جس میں انہوں نے اعتدال اور توازن کو اپنے پیش نظر رکھنے

کی کوشش کی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ غیر معتدل انداز تحریر اختیار کرنے والے اخبار نویس معتدل اور متوازن انداز بیان والے اخبار نویسوں کے مقابلے میں جلدی شہرت اور مقبولیت حاصل کرلیتے ہیں ۔ شوکت تھانوی اس طریقہ کار کو سستی شہرت کا ذریعہ خیال کرتے تھے ۔ انہوں نے باوجود زبردست اہلِ قلم ہونے کے اپنی تحریروں میں اعتدال اور توازن کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا ۔ ان کے صحافتی کارنامے شاہد ہیں کہ اگر ایک طرف وہ مدح و ستائش میں مبالغے سے گریز کرتے رہے تو دوسری طرف انہوں نے نکتہ چینی میں خیر خواہی اور سنجیدگی کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھا ۔

شوکت تھانوی کے صحافتی کارناموں کی ان خصوصیات کی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو صحافت کے ارتقاء میں شوکت تھانوی کا ایک اہم حصہ ہے اور وہ ایک بلند پایہ ادیب ہونے کے علاوہ ایک اعلی درجے کے اخبار نویس بھی ہیں ۔

کتابیات

" شوکت تھانوی کی تصانیف "

مضامین اور افسانے

نمبرشمار	کتاب کا نام	اشاعتی ادارہ	سن اشاعت
1 ۔	موجِ تبسّم	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	1932
		صدیق بک ڈپو لکھنؤ	1933
2 ۔	بحرِ تبسّم	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	س ۔ ن
3 ۔	سیلابِ تبسّم	صدیق بک ڈپو لکھنؤ	1933
4 ۔	طوفانِ تبسّم	شوکت بک ڈپو لکھنؤ	1934
5 ۔	دنیائے تبسّم	حالی پبلشنگ ہاؤس ، دہلی	1937
6 ۔	گِرگٹ	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	سن ۔ ن
7 ۔	مجھے خرید لو	ہندوستانی پبلشر دلّی	1942
8 ۔	لاہوریات	اردو بک اسٹال ، لاہور	1945
9 ۔	بڑے بھلے	ادارہ فروغِ اردو ، لاہور	1946
10 ۔	وغیرہ وغیرہ	ادارہ فروغِ اردو ، لاہور	1947
11 ۔	مونڈی کاٹے	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	1951
12 ۔	برق تبسّم	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	1951
13 ۔	سودیشی ریل اور دوسر افسانے	ادارہ فروغِ اردو ، لاہور	1951
14 ۔	شوکتیات	اردو بک سٹال ، لاہور	1951
15 ۔	مضامینِ شوکت	ادارہ فروغ اردو ، لاہور	1952

16 - مسکراہٹیں	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	سن - ن
17- نمک مرچ	ادارہ فروغ اردو ، لاہور	سن - ن
18- کائنات تبسّم	علوی بک ڈپو ، بمبئی	1959
19- جی ہاں پشے میں	سلیمان برادرز ، حیدرآباد	1959
20- راجہ صاحب	میری لائبریری ، لاہور	1964
21- ہم زلف	لارک پبلشرز	س - ن
22- خوامخواہ	لارک پبلشرز	س - ن
23- خبطی	لارک پبلشرز	س - ن

" ناول "

1 - بُز بَھس	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	1934
2- دِل پھینک	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	1935
3 - سُوتیاہ چاہ	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	1936
4 - سودیشی ریل	شوکت بک ڈپو ، لکھنؤ	1936
5 - خانم خان	صدیق بک ڈپو لکھنؤ	1937
6 - معمّہ خاتون	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	1938
7 - ڈھونگ	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	1940
8 - بکواس	اردو بک سٹال ، لاہور	1943
9 - بیوی	ادارہ فروغِ اردو ، لاہور	1945
10- کتیا	ادارہ فروغِ اردو ، لاہور	1946

11- انشاءاللہ	ادارہ فروغ اردو ، لاہور	1946
12- کارٹون	ادارہ فروغ اردو ، لاہور	1947
13- جوڑ توڑ	ادارہ فروغ اردو ، لاہور	1947
14- غزالہ	ادارہ فروغ اردو ، لاہور	1947
15- سسرال	ادارہ فروغ اردو ، لاہور	1948
16- چار سو بیس	اقبال بک ڈپو ، کراچی	1949
17- بقراط	ادارہ فروغ اردو ، لاہور	1950
18- سپنے	اردو بک سٹال ، لاہور	1950
19- سانچ کو آنچ	ادارہ فروغ اردو ، لاہور	1954
20- بیگم صاحبہ	شمع بک ڈپو ، لاہور	1955
21- داماد	شمع بک ڈپو ، لاہور	1956
22- پگلی	لارک پبلشرز ، کراچی	س - ن
23- نیلو فر	ادارہ فروغ اردو ، لاہور	س-ن
24- مولانا	ادارہ فروغ اردو ، لاہور	س-ن
25 - خدانخواستہ	ادارہ فروغ اردو ، لاہور	س-ن
26- بھابی	ادارہ فروغ اردو ، لاہور	1959
27 - بہروپیا	لارک پبلشرز ، کراچی	س-ن

"ڈراما"

1 - منشی جی	صدیق بک ڈپو ، لکھنؤ	1939
2 - سنی سنائی	الائیڈ ٹریڈرز لمیٹڈ ، لاہور	1943

3 -	غالب کے ڈرامے	ادارہ فروغِ اردو ، لاہور	1951
4 -	قاضی جی (جلد اوّل)	ادارہ فروغِ اردو ، لاہور	1948
5 -	قاضی جی (جلد دوم)	ادارہ فروغِ اردو ، لاہور	1949
6 -	قاضی جی (جلد سوم)	ادارہ فروغِ اردو ، لاہور	1950
7 -	کھی کھی	ادارہ فروغِ اردو ، لاہور	1964

"آپ بیتی"

1 -	مابدولت	ادارہ فروغِ اردو ، لاہور	1945
2 -	کچھ یادیں کچھ باتیں	ادارہ فروغِ اردو ، لاہور	1964

"خاکے"

1 -	شیش محل	اردو بک اسٹال ، لاہور	1943
2 -	قاعدہ بے قاعدہ	ادارہ فروغِ اردو ، لاہور	س-ن

"متفرقات"

1 -	بارِ خاطر	ادارہ فروغِ اردو ، لاہور	1956
2 -	گولر کا پھول	شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور	س-ن
3 -	شیطان کی ڈائری	نسیم بک ڈپو ، لکھنؤ	1942

" کتابیس "

ابواللیث صدیقی :	لکھنؤ کا دبستانِ شاعری	طبع اوّل علی گڑھ ، 1944 ء
احتشام حسین سیّد :	ذوقِ ادب و شعور	طبع اوّل لکھنؤ ، 1955 ء
احتشام حسین سیّد :	روایت اور بغاوت	طبع اوّل لکھنؤ ، 1956ء
احسان دانش :	جہانِ دانش	دانش کدہ ، لاہور ، بارِ اوّل ، 1975 ء ۔
احسن فاروقی ، ڈاکٹر :	ادبی تخلیق اور ناول	کراچی اشاعتِ اوّل 1963ء
احسن فاروقی ، ڈاکٹر و نورالحسن ہاشمی ، ڈاکٹر :	ناول کیا ہے ؟	لکھنؤ ، 1960 ء ۔
احمد جمال پاشا :	شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت	نظامی پریس لکھنؤ ، س۔ن
اختر اورینوی :	تحقیق و تنقید	الہ آباد طبع اوّل ، 1961ء
آدم شیخ ، ڈاکٹر :	انشائیہ	رحیمی پریس بمبئی ، طبع اوّل 1965 ء ۔
اعجاز حسین ، ڈاکٹر :	ادب اور ادیب	الہ آباد ، بارِ اوّل 1960ء
آلِ احمد سرور :	تنقیدی اشارے	علی گڑھ ، بارِ اوّل ، 1942 ء ۔

الطاف فاطمہ :	اردو میں فنِ سوانح نگاری کا ارتقاء	لاہور اشاعتِ اوّل ، 1961ء ۔
امداد صابری :	تاریخِ صحافتِ اردو	سوبھاش بک ڈپو دہلی ، بارِ اوّل ، 1953ء ۔
جوش ملیح آبادی :	یادوں کی برات	جوش اکیڈمی ، کراچی بار اوّل ، 1970ء ۔
جمیل جالبی ، ڈاکٹر:	تاریخِ ادب اردو (جلد اوّل)	مجلسِ ترقی ادب ، لاہور 1975ء ۔
خورشید الاسلام :	تنقیدیں	علی گڑھ ، طبع اوّل ، 1975ء ۔
دیوان سنگھ مفتون :	ناقابل فراموش	رنجیت نیوز ایجنسی دہلی ، بار دوم س۔ ن
رحم علی الہاشمی :	فنِ صحافت	اورنگ آباد ، بارِ اوّل 1943ء ۔
رضا علی ، سرسیّد :	اعمال نامہ	دہلی بارِ اوّل ، 1942ء ۔
رفعت جہاں عرشی اور زہرہ عرشی :	غم غلط (مرتبہ)	رام پور ، بارِ اوّل ، 1966ء ۔
سجاد باقر رضوی :	مغرب کے تنقیدی اصول	طبع دوم ، 1971ء ۔
سہیل بخاری ، ڈاکٹر:	اردو ناول نگاری	لاہور بارِ اوّل ، 1960ء ۔

شاہ علی، ڈاکٹر سید :	اردو میں سوانح نگاری	کراچی اشاعت اول، 1961ء
شفیق جالندھری :	اردو کالم نویسی	بار اول، لاہور 1975ء ۔
ظہیر الدین مدنی، ڈاکٹر:	اردو اسیز	بمبئی، بار اول، 1958ء۔
عابد علی عابد :	اصول انتقاد ادبیات	لاہور بار اول، 1960ء۔
عبدالغفور خواجہ :	طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ	دہلی بار اول، 1983ء۔
عبدالحق، ڈاکٹر :	اردو میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ	کراچی بار اول، 1949ء۔
عبدالحق، ڈاکٹر:	چند ہم عصر	علی گڑھ بار اول، 1957ء۔
عبدالقادر سروری :	جدید اردو شاعری	لاہور بار چہارم، 1962ء
عبدالقدوس ہاشمی:	**تقویم تاریخی**	کراچی، 1965ء ۔
علی حیدر، ڈاکٹر سید:	اردو ناول سمت و رفتار	الہ آباد طبع دوم 1979ء
غلام احمد فرقت کاکوروی :	اردو ادب میں طنز و مزاح	لکھنؤ، بار اول، 1957ء
غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر :	اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر	لاہور بار اول، 1966ء ۔
فاطمہ راجہ :	اردو فکشن کی وضاحتی فہرست (1947 - 1967)	نئی دہلی بار اول، 1975ء
فردوس فاطمہ نصیر، ڈاکٹر:	مختصر افسانہ کا فنی تجزیہ	الہ آباد طبع اول 1957ء۔

مشکور حسین یاد : ممکنات انشائیہ لاہور بارِ اوّل ، 1983ء

ممتاز شیریں : معیار لاہور بارِ اوّل ، 1963ء۔

نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر: دلّی کا دبستانِ شاعری لکھنؤ طبع دوم ، 1965ء۔

وزیر آغا ، ڈاکٹر: (1) اردو ادب میں طنز و مزاح لاہور تیسرا ایڈیشن 1977ء۔

(2) تخلیقی عمل سرگودھا پہلا ایڈیشن 1970ء۔

وقار عظیم ، پروفیسر سیّد: (1) ہماری داستانیں لاہور پہلا ایڈیشن ، 1956ء۔

(2) نیا افسانہ کراچی طبع دوم ، 1957ء۔

(3) فن افسانہ نگاری کراچی طبع اوّل 1949ء۔

ہادی حسین، محمد: شاعری اور تخیّل لاہور بارِ اوّل ، 1966ء۔

ہارون ایوب، ڈاکٹر: اردو ناول پریم چند کے بعد لکھنؤ ، بارِ اول 1978ء۔

یوسف سرمست ، ڈاکٹر: بیسویں صدی میں اردو ناول حیدر آباد (بھارت) بارِ اوّل ، 1973ء۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ، جلد نمبر 7 ، لاہور۔ 1971ء

: ———— : : ———— :

" مضامین "

ابراہیم یوسف :	فنِ ڈراما نویسی	نگار لکھنؤ ، ستمبر اکتوبر 1951ء
احتشام حسین سیّد :	آغا حشر کی ڈراما نگاری	فروغِ اردو لکھنؤ ، جولائی ، 1955ء
احسن فاروقی ، ڈاکٹر:	انگریزی ناول کا اردو ناول پر اثر	نقوش لاہور ، فروری ، مارچ ، 1953ء
اصغر بٹ :	اسٹیج ڈراما	ادبی دنیا لاہور فروری ، 1949ء
آلِ احمد سرور :	لکھنؤ اور اردو ادب	نگار لکھنؤ ، جنوری ، فروری ، 1950ء
امتیاز علی تاج :	"اردو ڈرامے کا پرانا نام تھیٹر"	نقوش لاہور ، اپریل ، مئی ، جون ، 1966ء
امتیاز علی تاج :	تھیٹر کی ضرورت	ادبِ لطیف لاہور ڈراما نمبر 1954ء ۔
انتظار حسین :	پاکستان میں ادب کے رجحانات	ہمایوں لاہور نومبر 1955ء
انجم اعظمی :	اردو ڈرامے کے امکانات	افکار کراچی ڈراما ایڈیشن اپریل ، مئی ، 1968ء ۔
داؤد رہبر :	فارسی اور اردو میں پیروڈی کا تصوّر	ادبی دنیا لاہور ستمبر 1946ء ۔
راجندر ناتھ شیدا :	نئے ادبی رجحانات اور ان کا تجزیہ	نقوش لاہور ، جنوری ، فروری ، 1957ء ۔

رشید احمد صدیقی:	طنز و مزاح کیا ہے	نگار، کراچی جنوری، فروری، 1967ء۔
سلیم اختر، ڈاکٹر:	انشائیہ نگاری	ماہ نو، کراچی، مارچ، 1966ء۔
سلیم اختر، ڈاکٹر:	ادب اور حسنِ زبان	ماہ نو، کراچی، نومبر 1966ء۔
صفدر حسین، ڈاکٹر، سیّد:	اردو میں اسٹیج اور ڈرامے کے ابتدائی نمونے	نقوش لاہور، اپریل، مئی، جون، 1966ء۔
ظفر احمد صدیقی:	پیروڈی اردو ادب میں	نقوش لاہور طنز و مزاح نمبر 1959ء۔
عبادت بریلوی، ڈاکٹر:	ہماری مزاح نگاری	ساقی دہلی طنز و ظرافت نمبر، اپریل 1945ء۔
عبادت بریلوی، ڈاکٹر:	ناولٹ کی تکنیک	نقوش لاہور شمارہ نمبر 19، 20، 1952ء۔
عبداللّٰہ، ڈاکٹر، سیّد:	مسلمانوں کے ادب میں مزاح کے تنوّعات	نقوش لاہور، دسمبر 1959ء۔
عبدالعلیم نامی، ڈاکٹر:	ماڈرن اردو اسٹیج کا پس منظر	ماہنامہ آجکل، دہلی ڈراما نمبر جنوری، 1959ء
عبدالعلیم نامی، ڈاکٹر:	اردو میں ایکانکی ڈرامے	ماہنامہ شاعر، بمبئی ڈراما نمبر، ستمبر 1964ء۔
عبدالمجید سالک:	صحافت میں اخلاقی قدریں	ہمایوں لاہور، اکتوبر 1956ء

عشرت رحمانی :	اردو ڈرامے کی ایک صدی	ادب لطیف لاہور ، ڈراما نمبر ، 1954 ء ۔
غلام مصطفٰی خاں ، ڈاکٹر:	فنِ تحقیق	نقوش لاہور ، جنوری ، 1966 ء ۔
فرمان فتحپوری ، ڈاکٹر:	اردو میں منظوم ڈرامائی افسانوں کا آغاز	نگار کراچی ، اکتوبر 1966ء۔
قاضی مشتاق احمد:	اردو میں ایک ایکٹ کے ڈرامے	ماہنامہ صبح امید بمبئی جون 1963 ء
گیان چند ، ڈاکٹر:	اردو میں تمثیل نگاری	ماہنامہ "آجکل" دہلی جون ، 1965 ء ۔
محمد اسلم :	ایکانکی ڈراما کیا ہوتا ہے	ماہنامہ ادب لطیف لاہور فروری ، 1959 ء ۔
محمد باقر شمس لکھنوی:	لکھنؤ کی زبان	ماہنامہ نگار ، لکھنؤ دسمبر 1942 ء ۔
محمد حسن :	لکھنؤ میں اردو ادب	ماہنلہ نگار لکھنؤ ، اکتوبر 1950 ء ۔
محمد حسن عسکری :	ڈرامے کا فن	ماہنامہ مہرِ نیمروز کراچی اپریل ، 1956 ء ۔
محمود نظامی :	ہمارے مزاح نگار	ماہنامہ نیرنگِ خیال ، لاہور ستمبر ، 1939 ء ۔

مسعود حسن رضوی ادیب :	اندر سبھا اور شرح اندر سبھا	اردو ، اورنگ آباد ، اپریل ، 1927 ء ۔
مشتاق قمر :	اردو میں انشائیہ	ماہ نو ، کراچی ، نومبر 1964 ء ۔
وزیر آغا ، ڈاکٹر :	مزاح اور مزاح نگاری	نقوش لاہور طنز و مزاح نمبر ، 1959 ء ۔
وزیر آغا ، ڈاکٹر :	شاعری میں سمبلزم کی تحریک	ماہ نو ، کراچی ، اکتوبر ، 1962 ء ۔
وقار عظیم، سیّد :	آغا حشر کا فن	ماہ نو ، کراچی استقلال نمبر ، 1953 ء ۔
وقار عظیم، سیّد :	یک بابی ڈرامے کا فن	مجلہ فنون لاہور ، مئی ، 1964 ء ۔

: ——— : : ——— :

" ENGLISH BOOKS "

Abdul Qadir Sh.:	The new school of Urdu Literature.	Lahore,1932.
Archer, William :	Old Drama and the new.	Boston,1923.
Aristotle :	Poetics Translation Theodoro Buckley.	New York,1914.
Arnold,Mathew :	Essays in Criticism.	London,1937.
Collins A,S :	English Literature of the Twentieth, Century.	London, 1962.
John Wain :	Essays on Literature and Ideas.	London,1954.
Nicoll,Allardyce:	(1) The theory of darama	London,1937.
	(ii) World drama.	London,1951.
Pritchett :	The living novel	London,1954.
R.A. Scott James:	Fifty years of English Literature.	London,1953.
Shaw, George Bernard :	(i0 Selected plays with prefaces.	New York,1948.
	(ii) The plays pleasant	London,1951.
W.H. Hudson :	An Introduction to the study of Literature.	(New Impession) London,1955.
	Encyclopaedia of Britanica Vol:XIII.	America,1970.

:-------- : : ---------:

" رسائل اور اخبارات "

ادبِ لطیف (ماہنامہ) لاہور ،	ڈراما نمبر 1954ء ، فروری ، 1959ء ۔
ادبی دنیا (ماہنامہ) لاہور ،	ڈراما نمبر 1935ء ، ستمبر 1946ء ، فروری ، 1949ء ۔
اردو (سہ ماہی) اورنگ آباد ،	جنوری 1926ء ، اپریل ، 1927ء ۔
افکار (ماہنامہ) کراچی ،	ڈراما نمبر اپریل ، مئی ، 1968ء ۔
انکشاف (ماہنامہ) لکھنؤ ،	ظریف نمبر فروری ، 1930ء ۔
آج کل (ماہنامہ) دہلی ،	ڈراما نمبر جنوری 1959ء ، جنوری 1967ء جون 1965ء ۔
حریم (ماہنامہ) لکھنؤ ،	اکتوبر ، 1934ء تا نومبر 1936ء ۔
ساقی (ماہنامہ) دہلی ،	اپریل 1945ء ۔
سرپنچ (ہفت روزہ) لکھنؤ ،	ستمبر 1931ء تا جون 1932ء ۔
شاعر (ماہنامہ) بمبئی ،	ستمبر 1964ء ، ستمبر 1965ء ، مارچ ، 1972ء ۔
صبحِ امید (ماہنامہ) بمبئی ،	جون ، 1963ء ۔
فنون (ماہنامہ) لاہور ۔	اپریل 1964ء ، مئی ، 1964ء ۔
کتاب (ماہنامہ) لکھنؤ ،	جولائی 1963ء شوکت تھانوی نمبر جون 1969ء ۔
ماہِ نو (ماہنامہ) کراچی ،	اکتوبر ، 1962ء ، نومبر ، 1964ء ، مارچ ، 1966ء ، نومبر ، 1966ء ، اگست ، 1967ء ، اگست ، ستمبر ، 1968ء اکتوبر ، 1968ء ، نومبر ، 1968ء ۔

مہرِ نیمروز (ماہنامہ) کراچی ،	اپریل ، 1956ء ، مئی ، 1958ء ۔
نقوش (ماہنامہ) لاہور ،	1950ء تا 1967ء ۔
نگار (ماہنامہ) لکھنؤ ،	دسمبر 1942ء ، افسانہ نمبر فروری 1949ء مئی ، 1949ء ، جنوری ، فروری ، 1950ء ، اکتوبر ، 1950ء ، ستمبر ، 1951ء ۔ اکتوبر ، 1951ء ۔
نگار (ماہنامہ) کراچی ،	اکتوبر ، 1966ء ، جنوری ، فروری 1967ء ، اصناف ادب نمبر سالنامہ ، 1966ء ، اصناف شاعری نمبر نومبر ، دسمبر ، 1967ء ، مسائل ادب نمبر سالنامہ ، 1968ء ۔
نیرنگِ خیال (ماہنامہ) کراچی ،	1938ء تا 1950ء ۔
ہمایوں (ماہنامہ) لاہور ،	جنوری 1944ء ، دسمبر ، 1948ء ، نومبر ، 1955ء ، اکتوبر ، 1956ء ۔
مجلہ انیس ، دبستانِ انیس راولپنڈی ،	1974ء ۔
طوفان (روز نامہ) لکھنؤ ،	11 ، مئی 1938ء ، یکم جون ، 1938ء تا 31 جولائی 1938ء ۔
جنگ (روزنامہ) کراچی ،	اگست 1957ء تا نومبر 1959ء ۔
جنگ (روز نامہ) راولپنڈی ،	13 ، نومبر 1959ء تا جون 1963ء ۔

:———::———:

" ملاقاتیں "

مقالہ کی تیاری کے سلسلہ میں جن خواتین و حضرات سے ملاقات ہوئی ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں :

1 - بیگم سعیدہ شوکت ، 2 - بیگم زہرہ شوکت ،
3 - سعید عمر تھانوی ، 4 - خورشید عمر تھانوی ،
5 - رشید عمر تھانوی ، 6 - شوکیہ تھانوی ،
7 - سیّد انصار ناصری ، 8 - جوش ملیح آبادی ،
9 - فیض احمد فیض ، 10 - ڈاکٹر سیّد صفدر حسین ،
11 - پروفیسر سیّد وقار عظیم ، 12 - حفیظ جالندھری ،
13 - احسان دانش ، 14 - سیّد ضمیر جعفری ،
15 - مادام نورجہاں ، 16 - شوکت حسین رضوی ،
17 - منظور عارف ، 18 - عرش منیر ،
19 - عشرت رحمانی ، 20 - ایم - اے - **رشید ،**
21 - شورش ملک ، 22 - عطا حسین کلیم ،
23 - محمد طفیل ، 24 - امین سلونوی ،
25 - عمر انصاری ، 26 - مولانا حامد علی خاں ،
27 - اختر جہاں ، 28 - وحیدہ روشن ،
29 - افضل پرویز ، 30 - الطاف پرواز ،
31 - ایس - ایم - سعید نقشبندی ، 32 - ناصر زیدی ،